اسلام پر کیا گذری؟

ضحی الاسلام

تالیف

پروفیسر احمد امین مصری

جزء اول ——— حصہ اول

ترجمہ

مولانا عمر احمد عثمانی

دوست ایسوسی ایٹس

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ سپلائرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

عنوان	صفحہ
مقدمہ از مترجم	
تعارف از مصنف	۱
مقدمہ از ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۵
پہلا باب	
(دولت عباسیہ کے دور میں حیات اجتماعی)	۱۴
علمی تحریک میں عہدِ اموی اور عہدِ عباسی کا مقابلہ	۱۵
فصل اوّل	
وہ عناصر جن سے مملکت بنی تھی	۱۸
خواہشات اور سیاسی میلانات میں ان کا اختلاف	۲۱
ادب میں ان کا اختلاف	۲۲
عمل تولید	۲۳
مولدین کے امتیازات	۲۶

مقدمہ

(از مترجم)

"فجر الاسلام" کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری کتاب یعنی "ضحی الاسلام" کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ محترم پروفیسر احمد امین مصری مرحوم کی یہ دوسری بلند پایہ کتاب ہے۔ جس میں ان کی علمی اور تحقیقی شان اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کتاب کا تعلق چونکہ عباسی دَورِ حکومت سے ہے جو علمی اعتبار سے تاریخ میں اسلام کا نہایت درخشاں دَور کہلاتا ہے۔ اس لیے مصنف نے بھی اپنی اس کتاب کا نام "ضحی الاسلام" تجویز کیا ہے۔ "ضحیٰ" عربی زبان میں چاشت کے وقت کو کہتے ہیں۔ جبکہ آفتاب اپنی پوری درخشانیوں کے ساتھ کافی بلند ہو چکتا ہے۔ اور دنیا بقعۂ نور بن جاتی ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں یہ بتایا ہے کہ عباسی دَورِ حکومت (دوسری صدی ہجری) میں کون کونسی علمی تحریکات پیدا ہوئیں اور وہ کس کس انداز سے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی پر اثر انداز ہوئیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں یونانی فلسفہ، منطق، طب اور دیگر علوم وفنون عربی میں ترجمہ ہو کر مسلمانوں میں اچھی طرح پھیل چکے تھے۔ زردشتی اور مانوی فلسفۂ زندگی، ہندی ودانت اور دیگر علوم وفنون یہودی اور عیسائی ثقافت سے متعلق علوم وفنون اور سب سے بڑھ کر افلوطین اسکندرانی کا فلسفۂ جدید اور تصوف عربی زبان میں منتقل ہو کر مسلمانوں میں رس بس چکے اور ان کے عقول واذہان پر چھا چکے تھے۔ دیگر اقوام کے کثیر التعداد لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر اپنے اپنے ذہن اور اپنی اپنی عقل کے مطابق اسلام کی تعبیرات کر رہے تھے۔ دوسری قوموں کے جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان کی اپنی اپنی ثقافت اور اپنی اپنی تہذیب تھی۔ ان کے اپنے اپنے علوم وفنون تھے اور ان کی اپنی اپنی رسوم وتقلیدات تھیں جو صرف اسلام کا زبان سے کلمہ پڑھ لینے سے بالکلیہ ان کے دماغوں اور ذہنوں سے محو نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس ثقافت اور تہذیب پر وہ پیدا ہوئے اور جن علوم وفنون میں انہوں نے پرورش پائی تھی انہوں نے انکی عقول واذہان کو خاص سانچوں میں ڈھال دیا تھا۔ ان کا ایک خاص مزاج بنا دیا تھا۔

یہ بالکل فطری چیز تھی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو انہی سانچوں کے مطابق اور اپنے مزاجوں کے انداز سے دیکھتے اور انہی کے مطابق ان کی تعبیر و تشریح کرتے۔ اس طرح دوگونہ طریقوں سے مختلف ثقافتیں مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ایک تو تصنیف و ترجمہ کی راہ سے اور دوسرے دیگر اقوام کے اسلام میں داخلہ کی راہ سے۔

جب قومیں ایک دوسری سے ملتی ہیں اور مختلف علوم و فنون جذب کر لیتے ہیں تو تاثیر اور تاثر کا یہ عمل ناگذیر ہو جاتا ہے۔ داد و ستد کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور امتزاج و اختلاط سے ایک ایسا معجونِ مرکب تیار ہو جاتا ہے جس میں ہر علم و فن کی چاشنی اور ہر قوم و ملک کی ثقافت کا رنگ جھلکتا ہے۔ دوسری صدی ہجری کا زمانہ مسلمانوں کے لئے دراصل ایسا ہی زمانہ تھا جس میں اختلاط و امتزاج کا یہ عمل اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھا۔ اور مسلمان اقوام کا ایک مرکب مزاج بننا شروع ہو چکا تھا۔ جو نہ تو خالص عربی یا اسلامی تھا اور نہ ہی خالص یہودی، نصرانی، زردشتی، مانوی، ہندی یا اسکندرانی تھا۔ مختلف اقوام کے اختلاط و امتزاج اور مختلف ثقافتوں کے باہمی ازدواج کا یہ فطری نتیجہ تھا۔ اس میں نہ ان لوگوں کے ارادہ کو کوئی دخل تھا نہ ان کی کسی خواہش کو۔ مختلف قومیں جہاں بھی ایک جگہ جمع ہونگی اور کچھ عرصہ تک ایک ساتھ رہیں گی وہاں ہمیشہ یہی اثرات فطری طور پر مرتب ہونگے۔

کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، خود برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ یہاں کچھ تو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے جو پہلے سے یہاں بود و باش رکھتے تھے۔ جن کی اپنی تہذیب و ثقافت تھی اور اپنی رسوم و تقلیدات تھیں۔ محمد بن القاسم کے حملہ کے ساتھ عرب اقوام نے ادھر کا رُخ کیا اور وہ یہاں آکر آباد ہو گئیں۔ ان کی بھی اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنی رسوم و تقلیدات تھیں۔ اس کے بعد ایرانی، افغانی، ترکی اور تاتاری قوموں نے ادھر کا رُخ کیا اور ہر قوم اپنے ساتھ اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنی رسوم و تقلیدات لے کر آئی۔ یہاں کے قدیم باشندوں میں سے ایک جمِ غفیر اسلام میں داخل ہوتا رہا۔ اس کے بعد اختلاط و امتزاج کا عمل شروع ہوا اور اثراندازی اور اثرپذیری یا داد و ستد سے کچھ عرصہ کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو مرکب زبان، مرکب ثقافت اور مرکب رسوم و تقلیدات تیار ہوئیں وہ ہمارے سامنے ہیں کہ ان کی زبان ان تمام زبانوں کا مجموعہ اور ان کی تہذیب تمام تہذیبوں کا ایک معجونِ مرکب ہے۔ جسے آپ نہ عربی کہہ سکتے ہیں، نہ ہندوستانی کہہ سکتے ہیں، نہ ترکی، افغانی، ایرانی یا مغل تہذیب کا خطاب دے سکتے ہیں۔

بعینہ یہی کچھ اور بالکل اسی انداز سے اس قسم کا اختلاط و امتزاج عباسی دورِ حکومت میں بھی ہوا

تھا اور اس کے ویسے ہی نتائج مرتب ہوئے تھے جیسے کہ ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ اور جیسا کہ یہاں یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے ماتحت نہیں ہُوا بلکہ خود بخود ہی غیر محسوس طریقہ پر ہو گیا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح یہ سب کچھ بلا ارادہ اور بلا مقصد غیر محسوس طور پر اس زمانہ میں بھی ہُوا تھا۔ اختلاط و امتزاج کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں ہو سکتا۔

بلاشبہ کچھ ایسے لوگ بھی ہونگے جنہوں نے شرارت کے ارادہ سے اپنی بہت سی چیزیں اسلام اور مسلمانوں میں ٹھونسنے کی کوششیں کی ہوں گی مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی محدود ہوگی جو ناقابلِ ذکر ہیں۔ ان کی شرارت آمیز کوششیں اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جتنی حیثیت آٹے میں نمک کی ہُوا کرتی ہے۔

پھر عباسی دَورِ حکومت ہی وہ دَور بھی ہے جس میں مسلمانوں کے تصنیفی سلسلہ کا آغاز ہُوا۔ ان کے علوم و فنون اسی عہد میں کتابوں کی صورت میں مدوّن ہو کر محفوظ ہوئے۔ جو کتابیں جن علوم و فنون میں اس عہد میں لکھ دی گئیں وہ بنیادی حیثیت کی مالک قرار پا گئیں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے انہی کتابوں کی تقلید اور خوشہ چینی لازمی قرار پا گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلام کے جسم پر جس تراش خراش اور جس وضع اور انداز کا جامہ اس عہد میں فِٹ کر دیا گیا تھا وہی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا اور جو رسوم و تقلیدات جس جس انداز سے اس عہد میں اسلامی قرار دے دی گئی تھیں وہ آج تک اسلامی چلی آ رہی ہیں۔ چونکہ اس سے پہلے دَور کی کوئی ایسی تصنیف ہم تک نہیں پہنچ سکی جس سے ہم یہ تحقیق کر سکیں کہ اس میں کونسی چیزیں خالص اسلامی ہیں اور کونسی چیزیں دوسری قوموں یا دوسری ثقافتوں سے اسلام میں آکر مِل گئی ہیں۔ اس لئے ان تمام چیزوں کو الگ الگ کرنا اور ان کے درمیان کوئی امتیازی خط کھینچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں رہا۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارا تمام علمی سرمایہ دراصل اس اسلام کی تعبیر و تشریح تو کر دیتا ہے جو دوسری صدی ہجری میں عام طور سے مسلمانوں میں مروّج تھا۔ مگر اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس اسلام کی بھی صحیح تعبیر و تشریح کر سکتا ہے جو محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے لئے اسلام کو عطا فرمایا تھا۔ حقائق و واقعات کی رُو سے چشم پوشی کرنا اور قانونِ فطرت سے اغماض برتنا ہے۔

"ضحی الاسلام" کی تین جلدیں ہیں اور ان تینوں جلدوں میں عباسی دَورِ حکومت کی سہ صد سالہ زندگی میں اسلام پر جو کچھ گذرا ہے اس کی تفصیلی داستان بیان کی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب "ضحی الاسلام" کی پہلی جلد کے جزءِ اوّل کا ترجمہ ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور وقت نے اجازت دی تو میری

آرزو یہی ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ مجلدات بھی آہستہ آہستہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرسکوں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

مجھے امید ہے کہ جس قدر افزائی کے ساتھ آپ نے "فجر الاسلام" کے ترجمہ کا خیر مقدم فرمایا تھا۔ اس سے "ضحی الاسلام" کا یہ ترجمہ بھی محروم نہیں رہے گا۔

آخر میں یہ گذارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مجھے اپنی کوتاہیوں، خامیوں اور کمزوریوں کا پورا پورا احساس ہے اور یقین مانیئے مجھے آپ حضرات سے کہیں زیادہ اس کا احساس ہے اس لئے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے ترجمہ کا حق ادا کردیا ہے۔ ناظرین کو اگر کہیں کوئی خامی نظر آئے تو مجھے اس پر متنبہ فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔ میں آپ کی اس کرمفرمائی کا بہت بہت ممنون ہونگا۔

والسلام

عمر احمد عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

(علامہ احمد امین مصری۔ مرحوم)

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ۔

کسی قوم کی تاریخ پر تحقیقات کرنے والے کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا اُس قوم کی عقلی نشو و ارتقا کی تاریخ، دین کی تاریخ اور بیرونی آراء و مذاہب کے اثرات کی تحقیقات میں ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مادی اور مادیانہ قسم کے مسائل میں تحقیقات کا میدان واضح اور محدود ہوتا ہے۔ جو کچھ تبدیلیاں اس سلسلہ میں پیش آتی ہیں وہ بھی ظاہر اور نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک فکر کا تعلق ہے اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ وہ کیسے پیدا ہوئی، کیسے پھلی پھولی اور کن عوامل کے ماتحت وہ وجود پذیر ہوئی اور کن عناصر نے اسے غذا بہم پہنچائی، کیا کیفیات اس پر طاری ہوئیں جنہوں نے اس میں اعتدال پیدا کیا اور صاف و شفاف بنایا۔ تو یہ باتیں آپ کو تھکا دیں گی۔ ان کا پتہ لگانے میں آپ بڑی دشواریاں محسوس کریں گے۔ کیونکہ کسی فکر کا ابتدائی دور میں کوئی ایسا نمایاں پہلو نہیں ہوتا کہ اس سے استدلال کیا جا سکے۔ وہ ایسے ایسے عناصر سے ترکیب پاتی ہے جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس کی تبدیلیوں اور اعتدال بخشیوں میں ایسے ایسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو انتہائی مخفی اور غیر نمایاں ہوتے ہیں۔ دینی مذاہب کا باعث اکثر وہ باتیں ہوتی ہیں جو خود اس کی تعلیمات کے خلاف ہوتی ہیں۔ کبھی اس کا باعث سیاسی ہوتا ہے حالانکہ اس کا خارجی مظہر ہر سیاست سے پاک نظر آتا ہے کبھی اس کا باعث دین کو خراب کرنا ہوتا ہے مگر وہ بڑے ہی دیندارانہ لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی دین تو ہر حیثیت سے صالح

ہوتا ہے مگر اس کے نقل کرنے والے اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس میں اپنی طرف سے طرح طرح کی آمیزشیں کرکے اور لغویات کو شامل کرکے اسے خراب کر دیتے ہیں۔ ایک محقق حیران و پریشان کھڑا رہ جاتا ہے۔ وہ روشنی کی ایک ایک کرن کے پیچھے لپکتا ہے کہ شاید اسے راستہ مل جائے۔ وہ راہ کے دھندلے نشانات کے پیچھے لگتا ہے کہ شاید ان کے پیچھے چل کر ہی اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

مزید برآں، افکار متنوع اور آراء گوناگوں ہوتی ہیں۔ ہر عہد کے فیصلے اپنے سے پہلے عہد سے قطعاً مختلف نظر آتے ہیں۔ ایک محقق جب انہیں دیکھتا ہے تو اوّل دہلہ میں انہیں بالکل نیا سمجھ لیتا ہے جن کا بظاہر اپنے ماضی سے نہ کوئی انضباط ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کے ساتھ کوئی تعلّق۔ پھر ایک مؤرخ خود اپنی فکر سے کام لیتا ہے کہ وہ کوشش کرکے ان کے درمیان کوئی لگاؤ اور تعلّق پیدا کرکے اور علّت و معلول کی کوئی کڑی متعیّن کر دے۔ یہ کام اسے اپنی فکری صلاحیتوں سے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ فکر کے ایک مؤرخ کو کس قدر مشقت اُٹھانی پڑتی ہے اور وہ کن کن صعوبتوں سے کن کن نتائج تک پہنچتا ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

میں ضحی الاسلامؒ میں اسی رفتار سے چلتا رہا ہوں جس رفتار سے "فجر الاسلامؒ" میں چلتا رہا ہوں۔ صدق و اخلاص میرا رہنما رہا۔ اگر میں صحیح راستہ پر چلا ہوں تو خدا کی توفیق پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور اگر میں نے غلطی کی ہے تو میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تو حق ہی کی تلاش کی تھی۔ ہر آدمی کو اس کی نیت کے مطابق پھل ملتا ہے۔

میں نے ضحی الاسلام میں عباسی عہد کی پہلی صدی (۱۳۲-۲۳۲) ھ کو بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یعنی واثق باللہ کی خلافت کے عہد تک۔ وہ ایک زمانہ تھا جس کا ایک خاص علمی انداز تھا جبکہ سیاست اور ادب میں بھی اسکا ایک خاص رنگ تھا۔ یہ عہد ایرانی عنصر کے غلبہ میں امتیازی درجہ رکھتا تھا۔ اس عہد میں ایک حد تک حریّتِ فکر، معتزلہ کا غلبہ و تسلّط، شعر و نثر میں ادبی رنگ آمیزی پائی جاتی تھی جس کی زمانے گذر جانے اور مختلف حالات کے باوجود، عرصۂ دراز تک پیروی کی جاتی رہی۔ یہ عہد اس میں بھی ممتاز تھا کہ عربی زبان میں جو چیزیں اب تک یونہی بے زبان ملتی تھیں انہیں کتابوں اور دفتروں میں قلمبند کرکے مدوّن کر لیا گیا اور جو کچھ علمی سرمایہ دوسری اجنبی زبانوں میں پایا جاتا تھا اُسے عربی زبان

میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ یہ عہد ان تمام امور میں اپنے سے پہلے اور اپنے سے بعد کے زمانوں سے مختلف تھا۔ یہ عہد گویا چار طرف سے خود اپنے ہی حلقہ میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا الگ نام رکھا جا سکتا ہے۔ اسے الگ کرکے بڑھایا جا سکتا ہے اور نمایاں کرکے دکھایا جا سکتا ہے۔ میں نے اکثر فکر کی توضیح و تشریح کرنے کے لئے پچھلے عہد سے اس کا ارتباط بتلانے اور سلسلہ بسلسلہ آئندہ عہود کے ساتھ اس کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے اس کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل میں اس عہد کی اجتماعی زندگی بتائی گئی ہے۔ اس میں میں نے صرف ان باتوں کو لیا ہے جن کا علم و فن پر قوی اثر تھا۔

باب دوم میں مختلف دینی اور غیر دینی ثقافتیں بیان کی گئی ہیں۔

باب سوم میں علمی تحریکات، علمی ادارے، حریتِ فکر، ان تحریکات میں مختلف شہروں کے امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب چہارم میں مذاہبِ دینیہ، ان کی تاریخِ حیات۔ ان کے مشہور رہنما، اور اہم حادثات بیان کئے گئے ہیں۔

میرا اندازہ تھا کہ اس کا حجم بھی "فجر الاسلام" کے حجم کے برابر ہی رہے گا۔ لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو موضوع پھیلتا چلا گیا اور میں اس کی تفصیلات میں گم ہو کر رہ گیا۔ ایسے ایسے مسائل سامنے آ گئے جن کا مجھے خیال بھی نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے بحث و تحقیق کو اس کی رفتار پر چھوڑ دیا اور اس کے تقاضے کے مطابق لکھتا چلا گیا۔ اب جو دیکھا تو اس کتاب کا حجم "فجر الاسلام" سے دوگنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہی ہو گیا۔ لہٰذا مجھے مجبور ہونا پڑا کہ اسے دو حصّوں میں تقسیم کر دوں۔ اور ہر حصّہ میں دو باب رکھوں۔

آج میں قارئین کے سامنے اس کا پہلا حصّہ پیش کر رہا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ وہ اس حصّہ کو پڑھ کر فارغ ہی ہوں گے کہ میں اس عرصہ میں اس کا دوسرا حصّہ پیش کر دوں گا۔

میں نے ہر موضوع پر صرف ابتدائی باتیں بیان کی ہیں۔ اور طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اگر

ہیں ہر فصل میں تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا تو یقیناً ہر فصل کی ایک کتاب بن جاتی۔ اگر میں محققین کو اس کتاب کی تنقید، اس کی غلطیوں کی اصلاح اور اس کے مباحث کی توسیع کر آمادہ کر سکا تو میرے لئے یہی کافی ہے۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل

احمد امین

۲۳ رمضان ۱۳۵۱ھ

۱۹ جنوری ۱۹۳۳ء

مقدمہ کتاب

(از ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم)

ایک ڈراموں کے نقاد نے ایک ڈرامہ کی تعریف کرنا چاہی جو اُسے بہت ہی پسند آیا تھا، اتنا پسند کہ اس کی پسندیدگی اس کے جملہ حواس پر چھا گئی تھی۔ مگر ڈرامہ نگار اس کا نہایت ہی گہرا دوست تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے تعریف کی تو لوگ مجھے ملامت کریں گے اور میری تعریف کو جنبہ داری پر محمول کریں گے۔ لیکن بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے دوست کو بغیر کسی تردد اور لحاظ کے اپنی پسندیدگی اور تعریف سے مطلع کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے صاف صاف علی الاعلان کہہ دیا کہ ـــــ ڈرامہ مجھے بہت پسند آیا ـــــ یہ بھی ایک دوستانہ خیانت ہے کہ دوستی کی وجہ سے احباب کے واجب حقوق سے انکار کیا جائے اور ان کی فضیلت کو چھپایا جائے۔ اور ایک تردد و تذبذب کا سلبی پہلو اختیار کیا جائے کہ تعریف بھی کی جائے تو نہایت دبے ہوئے اور دھیمے انداز کے ساتھ تاکہ لوگ اسے مبالغہ اور غلو پر محمول نہ کریں اور آپ پر جنبہ داری کا الزام نہ رکھدیں اور آپ کے قارئین آپ کے انصاف اور استقلال کے متعلق کسی بدگمانی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس نقاد نے یہی سمجھا ـــــ اور میں بھی قطعاً یہی سمجھتا ہوں ـــــ کہ دوستوں کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرنا نہایت ہی بھونڈی قسم کی خیانت اور بدترین قسم کا ظلم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اپنی ذات کے متعلق بے اعتمادی اور اس کے متعلق بدگمانی کا مظاہرہ کرنے میں اسراف بھی ہے۔ ایک نقاد کو اپنی رائے ـــــ جیسی کچھ بھی وہ رائے رکھتا ہے ـــــ اس خیال کے ماتحت ظاہر نہیں کرنی چاہیئے کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا سمجھیں گے اور کیا کہیں گے۔ خود اپنے نفس اور قارئین کے لئے اس پر یہ

فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو کچھ اعتقادی طور پر وہ سمجھتا ہو کہ وہ خالص حق ہے اسے ظاہر کردے، لوگ خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ قارئین کی خواہشات اس کے موافق ہوں یا مخالف ہوں۔

میں نے تنقید کرنے میں ہمیشہ اسی اصول کی پیروی کی ہے اور جہاں تک مجھ سے ہوسکا میں نے کوشش کی ہے کہ دوست پر اس کی دوستی کی وجہ سے اور دشمن پر اس کی دشمنی کی وجہ سے ظلم نہ کروں۔ ظلم یہی نہیں ہوتا کہ آپ کسی علمی یا ادبی کام کو کم کر کے دکھائیں یا اس کی اہمیت اور قیمت کو گھٹا دیں۔ کیونکہ وہ علمی کام کرنے والا آپ کا دشمن تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر قبیح اور شنیع ظلم یہ بھی ہے کہ آپ ایسے آدمی کی تعریف کردیں جو تعریف کا مستحق نہیں تھا یا تعریف کرنے میں مبالغہ آرائی کریں حالانکہ آپ کو اس کی محدود تعریف کرنی چاہیئے تھی یا آپ کسی دشمن کی اس لئے تعریف کردیں کہ وہ آپ کا دشمن ہے اور لوگوں سے یہ نہیں سننا چاہتے کہ وہ اس کا دشمن تو بنا مگر انصاف سے کام نہیں لے سکا اور خواہ مخواہ اس پر حملے کر بیٹھا۔

میں اپنے دوست "احمد امین" کے ساتھ خیانت کرنا نہیں چاہتا کہ ان کی مسرفانہ تعریف کروں۔ اور نہ ہی اس قسم کی خیانت کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کی اور ان کے کام کی اہمیت گھٹا دوں۔ میں ان کی دوستی کو بھول جانا اور ایک طرف رکھ دینا چاہتا ہوں ——— تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔ جو محبت میرے اور ان کے مابین ہے وہ پاک وصاف اور برادرانہ ہے۔ اسے ہم اغراض و مقاصد کی زنگ آمیزیوں سے بلند رکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں ان سے انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے ضحی الاسلام پر غور و فکر کیا۔ اس کی ایک ایک بات کو تولا۔ اور پوری کوشش کی کہ مجھے اس کتاب میں کوئی ایسا بڑا عیب مل جائے جو قارئین کے سامنے پیش کرسکوں مگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ مجھے نہ کوئی چھوٹی بات مل سکی نہ بڑی۔

یہ میرا قصور تو نہیں ہے کہ "احمد امین" نے محنت، صداقت اور امانت کے ساتھ کام کیا مشقت اور تکلیف برداشت کی۔ خاص رجحانات سے یکسو ہو کر اور ان کی خواہشات سے الگ رہ کر جو لوگوں کے ساتھ عموماً کھیلا کرتی ہیں آپ کے سامنے اپنی تحقیقات کا نچوڑ پیش کردیا اور اس سلسلہ میں انہیں خدا کی طرف سے وہ توفیق عطا ہوگئی جو اس زندگی میں کسی عالم کو نصیب

ہوسکتی ہے۔

ہاں، یہ بھی تو میرا قصور نہیں ہے کہ "احمد امین" نے دادِ تحقیق دی اور خوب دی۔ انہوں نے پڑھا اور بہت اچھی طرح پڑھا۔ انہوں نے سمجھا اور خوب سمجھا۔ انہوں نے استنباط کیا اور صحیح استنباط کیا۔ نہ یہ میرا قصور ہے نہ وہ ہے۔ یہ بھی میرا قصور نہیں ہے کہ ان سب باتوں کے بعد "احمد امین" نے عربی لٹریچر کے اسباق میں ایک نیا دروازہ کھول دیا جس کے سامنے بڑے بڑے علماء اور ادیب —— عہد جدید کے پورے عرصہ میں —— دم سادھے کھڑے رہے۔ وہ اس کے قریب جاتے اور پھر پلٹ جاتے۔ دروازہ کھٹکھٹاتے مگر نہ کھلتا اور "احمد امین" کو یہ توفیق نصیب ہوگئی کہ انہوں نے دروازہ کو چوپٹ کھول دیا۔ اور لوگوں کو وہ حقائق عریاں کرکے دکھا دیئے جو اس دروازہ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ جن سے ایک محقق، ایک عالم اور ایک ادیب کے دل میں زبردست ہیجان بپا ہو جاتا ہے۔ یہ میرا قصور تو نہیں ہے، اگر کسی کو اس بات پر ملامت کرنی ہی ضروری ہو کہ ایک مصری عالم کو یہ کھلی کامیابی کیوں نصیب ہوگئی۔ اس نے عربی زبان کو ایک ایسی کتاب کیوں دے دی جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں تھی۔ تو خود اس مصری عالم کو اس کی ملامت کی جانی چاہیئے۔ "احمد امین" کو اس کی سزا ملنی چاہیئے کیونکہ اس نے ہی تو یہ کامیابی حاصل کی ہے۔

"احمد امین" نے اپنی اس کتاب کا نام "ضحی الاسلام" تجویز کیا ہے۔ ان کا اتنا ہی اندازہ تھا کہ چاشت کا وقت فجر کے بعد آیا ہے۔ "اسلام کی فجر" وہ ظاہر کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب ضروری تھا کہ وہ چاشت میں ڈوب جائیں۔ لو گیا میں۔ تو میں بھی ان کے ساتھ اتنا ہی سمجھ رہا تھا۔ اور مجھے بھی اتنا ہی اندازہ تھا۔ لیکن جب میں نے ان کے ساتھ کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو مجھے کچھ اور محسوس ہونے لگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس احساس کو دل میں جگہ دوں کیونکہ ایسا کرنے سے میرا وہ خیال غلط ہوا جاتا تھا جو اب تک قائم چلا آرہا تھا۔ لیکن ہم چلتے گئے اور چلتے گئے حتّٰی کہ ہم نے اس حصّہ کو پورا کرلیا۔ جو ہم قارئین کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اب جو میں نے دیکھا تو یہ وہی چیز تھی جو مجھے شروع میں محسوس ہوئی تھی۔ اور اب اس کی وضاحت، خوبصورتی اور قوّت بڑھتی جارہی تھی۔ میرا گمان صحیح ہوتا جارہا تھا حتّٰی کہ وہ یقین میں تبدیل ہوگیا اور اب میرا اس پر ایمان ہوگیا، ایسا ایمان جس میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ یہ کتاب جسے قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہورہی ہے۔

ابتداء عہدِ عباسی کی اسلامی تاریخ پر وہ چکاچوند کرنے والی زبردست روشنی ڈالتی ہے جو درحقیقت چاشت کے وقت کی روشنی ہی سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

لہٰذا یہ کتاب واقعی "ضحی الاسلام" ہے، کیونکہ یہ کتاب ہمیں دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کی حیاتِ عقلیہ کی تاریخ کا درس دیتی ہے جو واقعی "ضحی الاسلام" ہے کیونکہ اس عہد نے اس زندگی کو لوگوں کے لئے واقعتاً ممکن حدود تک ظاہر اور نمایاں کر دیا تھا۔ اور ممکن حدود تک خوشنما اور مزین بنا دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کامیابی پر میں کسے مبارکباد دوں۔" احمد امین" کو مبارکباد دوں۔ کیونکہ انہوں نے کوشش کی اور مسلسل کوشش کی اور اس کوشش و تسلسل میں وہ برابر لگے رہے حتیٰ کہ اس منزل تک پہنچ گئے جہاں خدا نے انہیں "ضحی الاسلام" جیسی کتاب پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یا جامعہ مصریہ کو مبارک باد دوں کہ اسے" احمد امین" جیسا بالغ نظر آدمی مل گیا جس کے حوالہ انہوں نے درس و تدریس اور فنونِ تحقیق کا شعبہ کر دیا۔ شاید بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ میں" احمد امین" اور جامعہ مصریہ دونوں کی طرف سے یہ مبارک باد ان لوگوں کو پیش کردوں جو عربی زبان کو پڑھتے ہیں اور جن کے لئے عربی زبان کے آداب کی تاریخ کچھ اہمیت رکھتی ہے اور جو ان خزانوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں جن پر عربی لٹریچر مشتمل ہے مگر جو آج تک نامعلوم رہے ہیں۔ یہی لوگ مبارک باد کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ آج کے بعد اپنے مقاصد کی طرف واضح اور سہل اور ہموار راستوں پر چل سکیں گے جن پر چاشت کے وقت کی روشنی اچھی طرح چھائی ہوئی ہوگی۔

آج کے بعد مسلمانوں کی زندگی ماضی کی طرح پیچیدہ اور مضطرب نہیں رہے گی جس کے متعلق ادب و لٹریچر کے تاریخ نگار اٹکل پچو باتیں کیا کرتے تھے اور تحقیق سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ محض اندازہ سے باتیں کرتے تھے یقین سے نہیں۔ اب وہ زمانہ گذر گیا۔ اس زمانہ اور مستقبل کے ادبی مؤرخین کے درمیان ایک دبیز پردہ پڑ گیا ہے جو" احمد امین" نے ڈال دیا ہے۔ آج کے بعد جو لوگ ادب کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کریں گے انہیں اس پر قدرت ہوگی کہ وہ تحقیق و یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکیں اور اپنی تحقیقات میں بصیرت و ہدایت کے ساتھ چل سکیں۔

ہمارا سینہ ان دقیق رموز سے کتنی تنگی محسوس کیا کرتا تھا جنہیں ادبی مورخین بیان کیا کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ حیاتِ اسلامیہ نے —— بنو عباس کے عہد میں —— عربوں اور دوسرے اقوام کے اختلاط

کی فضیلت کی وجہ سے، عقل عربی کے اجنبی عقول کے ساتھ اتصال کے شرف کی وجہ سے، ترجمہ اور مترجمین کی عنایات کی وجہ سے، تالیف اور مؤلفین کے کارناموں کی وجہ سے بڑی ترقی کی تھی۔ یہ تمام الفاظ آج تک سربستہ راز اور رموز تھے جو بہت سی چیزوں پر دلالت کرتے تھے مگر کسی چیز پر بھی دلالت نہیں کرتے تھے، یہ الفاظ محققین کے سامنے ایسی صورتیں پیش کرتے تھے جو مختلط اور مضطرب، غیر محدود اور غیر مستقیم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ نگاہوں کے سامنے آتی اور جاتی رہتی تھیں اور برابر غامض اور دقیق بنی رہتی تھیں۔ ہم ان کی طرف بڑے شوق سے لپکتے تھے مگر کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ اور بالآخر ہمیں وہ عقلی کسل لوٹ جانے پر مجبور کر دیتا تھا جو اس زمانہ میں ادبی زندگی کے لئے کسی طرح ایک آفت سے کم نہیں ہے۔

لیکن اب یہ تمام صورتیں بہترین طور پر منضبط ہو چکی ہیں۔ اور بہترین طریقہ پر واضح کی جا چکی ہیں اب ہم اگر دوسری صدی ہجری میں عربی قوم یا اقوامِ مسلمہ کی ترقی کا حال بیان کریں تو ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ بلکہ حقیقتاً اس ترقی اور اس کے سرچشمہ کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کے ان تمام سوتوں کا پتہ لگا سکتے ہیں جہاں سے وہ سرچشمہ آبیاری پاتا تھا۔ ہم اس عہد کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے متعلق کچھ کہنا چاہیں تو اب ہم کوئی مبہم سی بات نہیں کہیں گے۔ بلکہ ایسی بات کہیں گے جو اپنے مفہوم پر بہترین طریقہ پر وضاحت کے ساتھ کوئی روشنی ڈال سکے۔ وہ یہ بتا سکے کہ اس زندگی کی طبیعت کیا تھی اور افراد اور جماعتوں کے درمیان باوجود اجناس گھرانوں، خاندانوں اور مزاجوں کے اختلافات کے کس قسم کے تعلقات قائم تھے۔ وہ یہ بھی بتا سکے کہ اس باہمی جوڑ کی طبیعت کیا ہوتی ہے جو اس قسم کے لوگوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ان کے خون ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط بلکہ یوں کہئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جایا کرتے ہیں۔ وہ یہ بتا سکے کہ اس غلامی کی طبیعت کیا ہوتی ہے، جس نے بے شمار افراد امم کی انفرادی اور اجتماعی شخصیتوں کو مٹا دیا تھا وہ یہ بتا سکے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ان تمام مختلف عناصر کو ایک ہانڈی میں ڈال کر پکایا تھا۔ وہ ایک ہانڈی اسلامی مملکت تھی۔ اس سے ایک نئی —— بالکل ہی نئی —— شخصیت نے جنم لیا جو ہر حیثیت سے عجیب و غریب تھی۔ یہ تھی اُمتِ مسلمہ کی شخصیت۔

ہاں، اور وہ یہ بھی بتا سکے کہ خود ان طبقات کی کیا حالت تھی جن سے اُمتِ اسلامیہ کے اس اجتماعی جسم نے ترکیب پائی تھی۔ جو اپنے درمیان بہت سے مختلف قسم کے کام بانٹے ہوئے تھے۔ وہ کام جن کی اسر

جسم کو ضرورت پڑتی تھی، صرف اپنی زندگی گذارنے کے لئے نہیں بلکہ اس حیاتِ اجتماعی کو ترفہ اور ترقی کی زندگی بنانے کے لئے بھی۔ اور جس نے مادی، عقلی اور شعوری ہر قسم کے ترفہ و تنعم کے ایک بڑے ممکن حصّے کو ان کی گرفت میں دے دیا تھا۔

جب ہم یونانی ثقافت کا ذکر کرتے ہیں تو آج کے بعد سے ہم اس کے وہ مبہم سے معنی نہیں سمجھیں گے جس کی طرف ہم اکثر فلسفہ کے لفظ سے اشارہ کر دیا کرتے تھے بلکہ ہم ٹھیک ٹھیک اس مقدار کو سمجھ سکیں گے جو عربوں نے یونانی سے لیا تھا اور یہ بھی کہ کیسے لیا تھا۔ کہاں سے لیا تھا، ابتداءً انہوں نے اسے اپنے لئے کس طرح خوشگوار بنایا۔ پھر آگے چل کر وہ کس طرح اس کے مطابق ڈھل گئے۔ یہی کچھ آپ ہندوستانی اور ایرانی ثقافت کے متعلق بھی کہہ سکیں گے (استغفراللّٰہ) بلکہ اس سے بھی بہتر طریقہ پر کہہ سکیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ادب عربی کی تاریخ کے کسی مؤرخ کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی ہو کہ وہ عربوں اور ہندوستانیوں یا عربوں اور ایرانیوں کے باہمی تعلقات پر اس قدر محققانہ روشنی ڈال سکا ہو۔ جس طرح کہ "احمد امین" کو خدا کی طرف سے یہ توفیق ارزانی ہوئی۔

ان تمام باتوں کے بعد —— احمد امین —— پہلے شخص ہیں، جنہوں نے عربی زبان میں حقیقت آفرینی اور سچائی کا ایک ایسا ہموار راستہ بنا دیا ہے جس پر چل کر ہر تحقیق کرنے والا آدمی مطمئن ہو سکتا ہے حقیقت آفرینی اور سچائی کا ایک راستہ، مذاق اور گمراہی کا راستہ نہیں۔

جب ہم مسیحی ثقافت یا یہودی ثقافت کا ذکر کرتے ہیں تو آج کے بعد سے ہم اسے وہ کچھ نہیں سمجھیں گے جو آج تک سمجھتے آئے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کے اتصال اور وابستگی نے اِن کے درمیان اور ان کے درمیان عام تاثیر عقلی کی کچھ صورتیں پیدا کر دی تھیں۔

بلکہ ہم اس تاثیر کی طبیعت کو پہچان سکیں گے اور اس کی مقدار اور سرچشمہ کا پتہ لگا سکیں گے۔ اس کے بعد ہم ان جدید مظاہرِ حیات پر ہاتھ رکھ کر بتا سکیں گے کہ مسلمانوں نے اس کے تحت ادب، علم اور فن کے میدان میں کیا نتائج پیدا کئے۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ "احمد امین" نے جب اس کتاب کی تالیف کا ارادہ کیا تو قوم کی خاطر انہوں نے تمام مخالف قوتوں سے جنگ کرتے ہوئے اپنی نگاہوں کے سامنے ایک مقصد رکھ لیا تھا جس کے متعلق گویا انہوں نے قسم کھالی تھی کہ وہ اسے حاصل کر کے رہیں گے ورنہ کتاب کی اشاعت کا ارادہ ہی ترک کر دیں گے۔ یہ

یہ مقصد جو ان کے پیشِ نظر تھا وہ دوسری صدی ہجری کی حیاتِ عقلیہ اسلامیہ کو غموض و ابہام سے چھڑاتا تھا۔ یہ غموض و ابہام اس پر برابر طاری رہا تا آنکہ " احمد امین " نے اس کے مؤقف کو بالکل واضح کر کے پیش نہ کر دیا اور مسلمانوں کی حیاتِ عقلیہ کو تیسری صدی ہجری کے نصف تک غموض و ابہام سے نجات نہ دلا دی۔ وہ ہر ہفتے مجھ سے ملتے تھے اور اپنے ساتھ ان بہتر غنائم کا ایک ذخیرہ لے آتے تھے جو اس مسلسل اور دشوار گذار جنگ میں انہیں حاصل ہوتا تھا۔ اس کامیابی کی سعادت میں بھی ان کا شریک ہو جاتا اور ان کی کامرانیوں پر رشک کیا کرتا تھا۔

میں اسے پسند نہیں کرتا کہ آپ میرے متعلق یہ اندازہ لگائیں کہ میں استعارہ و مجاز اور محاکات و تمثیل کے پردوں میں باتیں کر کے بات کو خوشنما اور مزین کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں اسے پسند کروں گا کہ آپ یہ یقین فرمالیں کہ میں ہر آرائش اور زیبائش سے بے نیاز ہو کر خالص حق بات کہنا چاہتا ہوں جو ہر قسم کی بناوٹ اور ملمع کاری سے پاک ہو۔ اس کتاب کی تصنیف، درحقیقت مؤلف اور غموض و ابہام کے درمیان ایک سخت، طویل اور اکتا دینے والی جنگ تھی۔ مؤلف جب کوئی قدم آگے بڑھاتا تھا تو وہ اپنی کوششوں کو منظم کرنے کے لئے توقف بھی کرتا اور کامیابی کے ثمرات کو اس عمدگی کے ساتھ ان بہتر سانچوں میں ڈھالتا تھا جنہیں آپ اس کتاب کی فصول میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اسی عرصہ میں وہ ایک نئے حملہ کی تیاری میں بھی لگے رہتے تھے کہ اس کے ذریعہ سے وہ نئی کامیابیاں حاصل کر کے انہیں منظم کر سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی یہ زبردست کوشش بھی رہی کہ جو کچھ محنت اور مشقت وہ برداشت کر رہے تھے جن صبر آزما ثابت قدمی کی تلخیوں سے وہ گذر رہے تھے اور پوشیدہ امراض کی طویل دامنیوں میں اُلجھے رہتے تھے ان سے آپ کو بالکل الگ رکھیں۔ اس کے اثرات بھی آپ کتاب کی فصول میں جگہ جگہ پائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ مؤلف نہایت اطمینان کے ساتھ چلتے ہیں ایسا اطمینان جو تاخیر اور سستی کے مشابہ نظر آتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی جزئیات آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جو تفصیلات میں کھوئے جانے کے ساتھ مشابہ معلوم ہوتی ہیں وہ استطراد در استطراد میں بالکل ہی جاحظ کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس تاخیر میں ذرا ثابت قدم رہیئے ان تفصیلات کو صبر کے ساتھ پڑھیئے۔ مصنف کے ساتھ سہولت واطمینان کے ساتھ چلتے رہیئے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس صبر، ثابت قدمی اور اطمینان کا نتیجہ آپ کے گمان سے بھی بڑھ کر زیادہ صحیح اور آپ کے انتظار سے بھی زیادہ نفیس تر ثابت ہوگا۔ مصنف ان باتوں میں خواہ مخواہ اُلجھ نہیں گیا ہے بلکہ قصداً اس نے

اسے اختیار کیا ہے۔ اور جان بوجھ کر اُن میں گھسا ہے کیونکہ علمی امانت اور اس طرزِ تحقیق کی قربانی دیئے بغیر وہ اُن سے ہٹ نہیں سکتا تھا جسے آجکل کی تحقیق علماء پر فرض قرار دیتی ہے۔

اس تاخیر سے آپ ڈریئے نہیں۔ اس درازدامانی سے آپ گھبرائیے نہیں آپ کو کہیں تکان اور اُکتاہٹ محسوس نہیں ہوگی۔ آپ کی نگاہیں کتاب سے ہٹیں گی نہیں۔ کیونکہ مصنّف یہ بھی جانتا ہے کہ منزل کے بُعد میں مسافت کو کس طرح آسان بنایا جاتا ہے اور راستہ پر آپ کی نگاہوں کے سامنے کس طرح پھول بکھیرے جاتے ہیں جو آپ کی نگاہوں کو بھائیں۔ اس راستے میں کس طرح فردوس گوش نغمے پھیلائے جائیں جن سے آپ کے کان غذائے روحانی حاصل کر سکیں۔ میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ بعض صفحات بلکہ بعض فصلوں کو آپ بار بار پڑھنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور اس وقت آپ محسوس فرمائیں گے کہ مصنّف اپنی اس تمام تاخیر اور اطمینان کے باوجود بھی بعض اوقات انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گذرتا چلا جاتا ہے۔

میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ "احمد امین" کو علمی اور فنّی عمدگی کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے حیاتِ عقلیہ اسلامیہ کے چہرہ سے ان نقابوں کو اٹھا دینے کی توفیق عطا ہوئی ہے جو ان سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے اسے اس انداز سے پیش کیا ہے جس کا علمی ظلم و جور سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور جو فنّی جمال اور شیریں بیانی کی پوری خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔

قارئین کو چاہیئے کہ وہ اِس کتاب کی فصول کا بغور مطالعہ فرمائیں اور مصنّف کو بھی اس نیک کرداری کا ثبوت دینا چاہیئے جو ایک کامیاب آدمی اپنی کامیابیوں کو حاصل کرنے کے بعد دیا کرتا ہے کہ اس میں کسی بڑے شائبہ کی آمیزش نہیں ہونے دیتا۔ یہ حقیقت پسندانہ، سرسبز اور ثمر بار زندگی ـــــ تواضع و انکسار کے ساتھ ساتھ ـــــ جو "احمد امین" کا شعار ہے ان لوگوں کے لئے جو مصر میں علماء کو حیاتِ تازہ سے روشناس کرانا چاہتے ہیں، ایک سودمند سبق اور صالح نمونہ بن جانی چاہیئے۔

والسّلام

طٰہٰ حسین

ضحی الاسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلا باب

دورِ عباسیہ کے ابتدائی دور میں حیاتِ اجتماعی

بعض مؤرّخین، دولتِ امویہ کے زوال اور دولتِ عباسیہ کے قیام کی، کچھ اس طرح تصویر کھینچتے ہیں کہ یوں خیال ہونے لگتا ہے جیسے یہ دونوں حکومتیں ایک دوسری سے بالکل الگ تھلگ اور قطعاً جُدا تھیں اور تاریخ کا ایک صفحہ دولتِ امویہ کے زوال کے ساتھ ختم ہو گیا اور دوسرا صفحہ دولتِ عباسیہ کے قیام کے ساتھ شروع ہو گیا۔ اور کچھ ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ اموی دَور کی ملّتِ اسلامیہ اور عباسی عہد کی اُمّتِ مسلمہ میں کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس تصویر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں خصوصاً اجتماعی اور عقلی نقطۂ نگاہ سے۔ بہرصورت واقعات سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اسلام کے ابتدائی دَور اور اُموی عہدِ حکومت میں کچھ حوادث نے جنم لیا۔ ان حوادث کے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے اور ان کے اثرات امویوں کے زوال اور عباسیوں کے قیام تک مسلسل جاری رہے مثال کے طور پر اسلامی تعلیمات ہی کو لے لیجئے۔ مفتوحہ ممالک میں وہ برابر پھیلتے اور اپنے اثرات مرتب کرتے رہے اور ساتھ ہی دیگر عوامل سے متاثر بھی ہوتے رہے۔ یہی حال عربی زبان کے پھیلنے کا بھی تھا۔ دولتِ عباسیہ کے قیام نے ان دونوں اثرات کے لئے کوئی نیا میدان مہیّا نہیں کیا۔ بلکہ دولتِ امویہ کی طرح ان کا یہ بھی ایک گہوارہ بن گیا تھا۔ کیونکہ یہ دونوں اثرات شروع ہی سے اپنا کام کرتے چلے آرہے تھے اس کی واضح ترین مثال، فاتح اور مفتوح اقوام کے درمیان امتزاج و اختلاط کے اثرات ہو سکتے ہیں۔ ان

کی ابتدا حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد سے ہو چکی تھی۔ تھوڑے سے عرصہ تک ـــــ جب تک مفتوحہ اقوام پر مسلمانوں کی دہشت طاری رہی ـــــ امتزاج و اختلاط پیدا نہیں ہو سکا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی نظم اجتماعی کے ماتحت، باہمی شادیوں، اسلام میں نئے داخلوں اور عربی زبان کے غلبوں کی صورت میں یہ امتزاج شروع ہو گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پایا تھا کہ ایک نئی نسل تیار ہو گئی جس میں عربی خون اور اجنبی خون کی آمیزش تھی، نہ صرف خون کی آمیزش بلکہ اس کے ساتھ ہی مختلف اقوام کی وہ خصوصیات بھی رل مل گئیں جن سے ان کے خون کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ خصوصیات، جسمانی، اخلاقی اور روحانی سب ہی قسم کی تھیں۔ اموی دورِ حکومت میں اس نئی نسل کی ابتدا ہو چکی تھی اور عباسی دورِ حکومت میں اس نے پھلنا پھولنا اور تسلسل کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا ـــــ اس امتزاج کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ ہر قوم نے دوسری اقوام سے نئی نئی باتیں، بغیر اس احساس و شعور کے کہ وہ اُن سے کس حد تک خوشہ چینی کرتی جا رہی ہیں ـــــ سیکھنی شروع کر دیں۔ ایک عربی آدمی ایرانیوں اور رومیوں سے ان کی حضارت اور مدنیت سیکھ رہا تھا تو ایک ایرانی عربوں سے ان کا دین اور ان کی زبان سیکھ رہا تھا۔ بعینہٖ یہی حالت دوسری اقوام کی تھی۔ یہ اثرات عباسی دورِ حکومت میں اسی طرح برابر قائم رہے جیسا کہ اُموی دورِ حکومت میں جاری و ساری تھے۔

بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اموی دورِ حکومت کو اگر مقدر سے حکومت کرنے کے لئے اتنا زمانہ مل جاتا جتنا عرصہ ان کے بعد عباسیوں نے نقارۂ حکومت بجایا تو امویوں کے ہاتھوں ہی وہ علمی حرکات اور اجتماعی اصطلاحات ظہور پذیر ہو جاتیں جو آگے چل کر عباسیوں کے ہاتھوں ظہور میں آئیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ

علمی تحریک میں عہدِ اموی اور عہدِ عباسی کا مقابلہ

(۱) خود اُموی دورِ حکومت کے آخری حصہ میں ـــــ جبکہ اس میں کسی دوسری حکومت کا کوئی اشتراک نہیں تھا ـــــ علمی حرکت، دینی مذاہب اور نظم اجتماعی بہ نسبت اُموی دورِ حکومت کے ابتدائی حصہ کی زیادہ ترقی یافتہ شکل میں موجود تھے۔ خارجیوں کی تعلیمات نے ان کے دور میں منظم صورت اختیار کر لی تھی۔ اعتزال نے انہی کے عہد میں جنم لیا حتیٰ کہ بعض اُموی خلفاء نے اس مسلک کو قبول بھی کر لیا تھا۔ مسجدوں میں درس و تدریس کے حلقے ان کے زمانہ میں منظم شکل میں قائم ہو چکے تھے۔ علماء نے تقدیر وغیرہ کے مسائل پر ان کے زمانہ ہی

میں بحث اور مناظرے شروع کر دیئے تھے۔ یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ مذہبی منافشات ان کے عہد ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ تالیف اور ترجمہ کا کام ان کے دور ہی میں پڑ چکا تھا۔ فنِ کتابت نے ان کے زمانہ ہی میں جنم لیا۔ بہرحال ان کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اگر علمی حرکت کی وسعت اور پھیلاؤ صرف عباسیوں ہی کا کرشمہ ہوتا تو اُموی عہدِ حکومت کا آخری حصّہ بھی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ اس کا ابتدائی حصّہ تھا۔

خود اموی خاندان جب اندلس کی طرف منتقل ہوا اور وہاں انہوں نے ایک مستقل حکومت قائم کر لی جو عباسی خلافت کے ابتدائی دور میں اس کی ہم عصر تھی تو علم کے لئے ان کی کوششیں اور ترجمہ و تالیف کی حرکت کے لئے ان کی مساعی عباسیوں کے کارنامہ سے کچھ زیادہ ہی رہیں۔ کم نہیں تھیں۔ اسی طرح ان کی مدنیت اور حضارت بھی عباسیوں کی مدنیت سے کچھ فروتر نہیں تھی۔ ان دونوں میں جو امتیازی خط کھینچا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ عباسی مدنیت کو قدیم عراق کی تہذیب اور ایران و یونان کی تہذیبیں گھیرے ہوئے تھیں اور وہ ان کے سہارے نشو و نما پا رہی تھی اور اندلس میں امویوں کی مدنیت کو لاطینی تہذیب اپنے احاطہ میں لئے ہوئے تھی ـــــ رہ گیا حضارت اور مدنیت کی وسعت کی طرف میلان، سو علمی میلان اور اپنے اپنے حالات و کوائف کے مطابق اجتماعی نظم کے بڑے حصّہ کو اپنانے میں کوئی ایک حکومت بھی دوسری حکومت سے پیچھے نہیں تھی بلکہ اس خصوص میں دونوں کا حصّہ برابر سرابر تھا۔

اسلامی مملکت ابتدائی دور سے اپنے طبعی حالات میں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی۔ ایک حالت ختم ہوتی تھی اور دوسری کیفیت شروع ہو جاتی تھی۔ وہ ابتداءً اس کیفیت سے جس پر خانہ بدوشانہ طرز بود و ماند غالب تھا ایک گونہ مدنیت کی کیفیت میں منتقل ہوئی۔ اس کے بعد اس سے زیادہ ترقی یافتہ مدنیت میں منتقل ہوئی اور اس طرح تدریجی طور پر وہ برابر آگے بڑھتی چلی گئی، تاآنکہ عباسی دورِ حکومت آگیا۔ قوم برابر طبعی احوال و ظروف کے تقاضوں کے مطابق حضارت اور مدنیت کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ ایسا خیال کرنا تو انتہائی غلط ہوگا کہ عباسی دورِ حکومت ہی مدنیت اور حضارت کو پردۂ عدم سے وجود میں لایا تھا۔

البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کچھ ایسے عوامل بھی موجود تھے جنہوں نے عباسیوں کے ساتھ ہی جنم لیا ـــــ بلکہ بعض عوامل خود عباسیوں کے پیدا کردہ تھے ـــــ مثلاً ایرانی اثرات کا غلبہ، پایۂ تخت کا شام

سے عراق کی طرف انتقال، علمی اور اجتماعی حرکات کی ترقی میں ان عوامل کے اثرات بھی کچھ کم نہیں تھے لیکن ان حرکات کو محض معین اور مددگار ہی کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ اگر یہ عوامل پیدا نہ بھی ہوتے تب بھی ملتِ اسلامیہ کا قدم برابر حضارت اور مدنیت کی طرف بڑھتا ہی رہتا اگرچہ اس کی رفتار کسی قدر سست ہی کیوں نہ ہوتی۔ ایرانی عنصر کا تسلط اموی حکومت میں بھی بڑھنے لگا تھا۔ خاص طور سے اس کے آخری عہد میں۔ عباسی سلطنت کا قیام اگر اس کے لئے مواقع مہیا نہ کرتا تو کچھ دوسرے اسباب پیدا ہوتے جو صورت میں اس سے مختلف ہوتے۔ یہ قیاس قطعاً صحیح ہے کہ اگر پایۂ تخت شام میں رہتا تب بھی علمی حرکت میں اہلِ عراق کی صلاحیتوں سے ضرور کام لیا جاتا۔ بلکہ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ فی الواقعہ ان سے کام لیا گیا۔ امام حسن بصری اور ان کے تلامذہ کی دینی حرکت ترقی کرتی اور قوت پکڑتی جا رہی تھی۔ اور ابو عمرو بن العلاء، اور ان کے ہم عصر عیسیٰ بن عمر ثقفی جیسے ائمہ لغت ــــ تھوں کوفہ اور بصرہ میں لغوی حرکت برابر ترقی اور قوت حاصل کر رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ بنو اُمیہ کے عہدِ حکومت ہی میں ہو رہا تھا۔ عباسی عہدِ خلافت میں ان دونوں حرکتوں کی وسعت دراصل انہی حضرات کا طفیل تھا جو ان کے تلامذہ کی انتھک مساعی اور کوششوں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیاتِ اجتماعی کے مخصوص انداز نے ـــــ جو حکومت عباسی کا شعار تھا ـــــ علوم و آداب کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیا اور ان کے لئے مخصوص صفات قائم کر دیں۔ جو دولتِ امویہ کے ماتحت اگر وہ باقی رہ جاتی ہر گز نہیں ہو سکتی تھیں۔

اس کی تفصیلات ہم آئندہ باب میں بیان کریں گے۔ مگر ہم حیاتِ اجتماعی کی صرف وہی کیفیات بیان کریں گے جن کے اثرات علم و فن پر مرتب ہوتے ہوں۔

فصل اوّل

اس عہد میں مملکتِ اسلامیہ کے باشندے

ظاہر ہے کہ افراد کی طرح قومیں بھی اپنے امتیازات وخصائص میں ایک دوسری سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان کی عادات وتجربات، طرزِ فکر، شجاعت، عقلی درجہ، ثقافتی مقدار اور امیال وعواطف کی شدت اور دھیمے پن میں بڑا ہی فرق ہوتا ہے۔

مزید برآں، معلوم ہے کہ ہر قوم کا اپنا لٹریچر ہوتا ہے جو دوسری قوموں کے لٹریچر سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر قوم کا لٹریچر اس کے ملک کی طبیعت، اس کی تاریخ، اس کے خیالات، اس کے سلاطین، عوام، عقلاء، جہلاء، صلحاء اور مجرموں اور اس کے نظام سیاسی کا آئینہ دار ہوتا ہے جس کا اس قوم کی حیات سے کسی طرح کا تعلق ہو۔

وہ عناصر جن سے مملکت بنی تھی

اس کے بعد ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مملکت عصرِ عباسی میں مختلف اقوام سے مرکب تھی۔ اس کی ہیئتِ ترکیبی میں مغرب، مصر، شام، جزیرۂ عرب، عراق، ایران، ماوراء النہر سب ممالک کا حصّہ تھا۔ یہ تمام قومیں ان خصوصیات میں جن کا ہم نے اوپر نام لیا ہے قطعی طور پر ایک دوسری سے مختلف تھیں۔ یہ ساری اقوام حکومت اسلامی کے ماتحت زندگی بسر کر رہی تھیں اور مملکتِ اسلامیہ ان سب قوموں کے مجموعہ کا نام تھا۔ ان قوموں میں سے ہر قوم کے کچھ خصائص وامتیازات تھے جن میں وہ مشہور تھیں۔ مثلاً عربوں کی شہرت اس بات میں تھی کہ شعر گوئی پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ

ہر عنصر کے فضائل

احمد ابن ابی داؤد کا قول ہے کہ عرب کا ہر باشندہ کم و بیش طبعاً شعر گوئی کی قدرت رکھتا ہے جو قدرت نے ان میں ودیعت کر دی ہے۔[1]

سندھ کے باشندے صراف اور جڑی بوٹیوں کے علم میں مشہور تھے۔ چنانچہ جاحظ کہتے ہیں۔ سندھی طبعاً صراف کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ بصرہ میں آپ کو کوئی صراف نظر نہیں آئے گا مگر ہر صراف کی تھیلی کا محافظ و نگران کوئی نہ کوئی سندھی ہوگا۔ محمد بن السکن نے ابوروا ح سندھی کو خرید لیا تھا جس نے اُسے بہت سا مال کما کر دیا۔ نیز ہمارے ہاں جانوروں کا کوئی معالج ایسا نہیں ملے گا جس کے پاس ایک نہ ایک سندھی غلام نہ ہو کیونکہ ان لوگوں کی واقفیت اور جڑی بوٹیوں کا علم بھی بہت کافی ہوتا ہے، ساتھ ہی معاملات کی صفائی اور پیشہ وروں کو اپنی طرف کھینچنے میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔[2] مرو اور خراسان والے بخل اور کنجوسی میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ العقد الفرید میں ہے کہ "اہلِ مرو کے بخل پر لوگوں کا اتفاق ہے۔ ان کے بعد اہلِ خراسان کا نمبر ہے۔ ثمامہ ابن اشرس کا قول ہے کہ میں نے مرغ کو جہاں کہیں بھی دیکھا ہے وہ مرغیوں کو بلاتا ہے اور دانے ان کے لئے پھیلا دیتا ہے اور مرغیوں کے ساتھ نہایت ملاطفت سے پیش آتا ہے۔ لیکن مرو میں میں نے ایک چھوٹے سے بچے کو دیکھا جس کے ہاتھ ایک بیضہ تھا۔ میں نے اس بچہ سے کہا کہ یہ بیضہ مجھے دے دو تو بچہ کہنے لگا کہ یہ بیضہ تمہارے ہاتھ میں نہیں سمائے گا۔ میں نے سمجھ لیا کہ بخیلی اور کنجوسی ان کی گھٹی میں پڑ چکی ہے بلکہ ان کی پیدائشی صفت بن گئی ہے۔[3] یمن کے لوگ عشق کرنے میں، حجاز کے لوگ ناز و انداز دکھانے میں اسی طرح مشہور تھے جیسا کہ عراق کے لوگ ظرافت میں مشہور تھے۔

چنانچہ اسحاق بن ابراہیم موصلی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے ؎

اِنَّ قَلْبِیْ بِالتَّلِّ تَلِّ عَزَازٍ[4]	مَعَ ظَبْیٍ مِنَ الظِّبَاءِ الْجَوَازِیْ !
شَادِنٍ لَمْ یَرَ الْعِرَاقَ وَفِیْهِ	مَعَ ظَرْفِ الْعِرَاقِ دَلُّ الْحِجَازِ

---

[1] اغانی صفحہ ۵۱ ج ۲۔ [2] الحیوان صفحہ ۱۳۴ ج ۲۔ [3] العقد الفرید صفحہ ۳۶۱۔ ج ۳۔

[4] تل عزاز (عین کے فتحہ کے ساتھ) ابوالفرج اصفہانی نے کہا ہے کہ یہ ٹیلہ رقہ میں ہے اور سنہ میں یہی دو شعر نقل کئے ہیں اور اسی نام سے ایک دوسرا ٹیلہ بھی مشہور ہے جو حلب کے شمال میں ہے۔ اس کا تذکرہ یاقوت نے کیا ہے۔

میرا دل اس ٹیلہ ——— عزاز کے ٹیلہ ——— میں چوکڑیاں بھرنے والی ایک الھڑ ہرنی میں اٹکا ہوا ہے جس نے اگرچہ عراق کو دیکھا نہیں مگر اس کے باوجود اس میں عراق کی ظرافت کے ساتھ حجاز کے ناز و انداز بھی جمع ہو گئے ہیں۔

جاحظ نے ہر قوم کے خصائص و امتیازات کو جو ان کے زمانہ میں پائے جاتے تھے تفصیل سے گنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ چین کے باشندوں کا امتیاز صنعت و حرفت ہے۔ وہ زیور بنانے، برتن اور دوسری چیزیں ڈھالنے ڈھاتیں پگھلاتے اور طرح طرح کے رنگ بناتے ہیں۔ وہ لکڑیوں کو خراد کرتے ہیں، تصویریں بناتے ہیں اور کپڑے وغیرہ بنتے ہیں۔ یونان کے باشندے دلائل و براہین کو خوب سمجھتے ہیں۔ وہ صنعتی کام نہیں کرتے۔ ان کا امتیاز حکم و آداب ہیں۔ عرب کے باشندے نہ تاجر تھے، نہ صناع تھے، نہ طبیب تھے اور نہ ہی حساب دان۔ وہ کھیتی باڑی بھی نہیں کرتے تھے کہ یہ چیز ان کے نزدیک محنت و مزدوری کی چیز تھی۔ زمینداروں سے وہ دور ہی رہتے تھے کیونکہ اس طرح انہیں جزیہ اور خراج کی ادائیگی کی ذلت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ پیمانوں اور ترازوؤں کے ذریعے سے بھی وہ اپنی معاش حاصل نہیں کرتے تھے۔ انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ ماشہ اور رتی کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی ساری تیزی اور تمام قوتیں ان چیزوں میں صرف کیں۔ شعر گوئی، بلاغت گفتار، طلاقتِ زبان، تعریفاتِ کلام، نشاناتِ قدم کے قیافہ کے بعد چہرہ مہرہ کا قیافہ، نسب کی حفاظت، ستاروں سے راہ نمائی حاصل کرنا، نشاناتِ راہ سے راستہ معلوم کرنا، ستاروں کے ذریعہ بارشوں کا علم حاصل کرنا، گھوڑوں، اسلحہ اور آلاتِ حرب سے متعلق بصیرت، ہر سنی ہوئی بات کو یاد رکھنا اور ہر محسوس چیز سے اثر پذیر ہونا، مناقب و مثالب کی شان کو استوار کرنا ——— یہ تھے عربوں کے امتیازات جن میں وہ یقیناً انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ آل ساسان کا امتیاز حکومت اور سیاست تھی۔ اور ترکوں کی خصوصیت جنگی شجاعت تھی۔ یہ ضرور ہے کہ زمین پر ہر ترک بہادر نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہر یونانی حکیم اور ہر چینی صنعت و حرفت کا ماہر نہیں ہوتا تھا اور نہ اعرابی عمدہ قسم کا شاعر ہوتا تھا۔

اس وضاحت سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ امور ان لوگوں میں زیادہ عام اور زیادہ مکمل صورت میں پائے جاتے تھے یا ان میں زیادہ نمایاں اور بکثرت پائے جاتے تھے[۱]۔ ایسے ہی ایک دوسرے مقام پر

---

[۱] رسائلِ جاحظ۔ ص ۲ و ما بعد۔

زنگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جاحظ لکھتے ہیں کہ ساری مخلوق ہیں یہ لوگ طبعاً رقص، طبل نوازی، اور تال سُر پیدا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں جس کے لئے انہیں کسی تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ روئے زمین پر ان سے بہتر گلا کسی دوسری قوم کا نہ ہوگا[۱] ہندوستان والے حساب، علمِ نجوم، اسرارِ طب، خراد، رندہ کرنے اور تصویر سازی اور دوسری بے شمار صنعتوں میں بہت مشہور ہوتے تھے[۲]

اسی طرح خواہشات اور سیاسی میلانات میں بھی ان کے درمیان اختلافات تھے۔ اس کی وضاحت

خواہشات اور سیاسی میلانات میں ان کا اختلاف

ابن قتیبہ کے اس بیان سے ہو جاتی ہے کہ محمد بن علی، عبداللہ بن عباس نے اپنے اپنے داعیوں سے فرمایا تھا ——— جب دعوت کے لئے انہوں نے ان کا انتخاب فرمایا اور انہیں اس مقصد کے لئے بھیجنا چاہا ——— کہ کوفہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ، تو وہ تو شیعان علی ابن ابی طالب پر مشتمل ہے ——— رہ گیا بصرہ تو وہ عثمان بن عفانؓ کے ہوا خواہوں کا شہر ہے جو صبر و تحمل کے قائل ہیں۔ ان کا مقولہ تو یہ ہے کہ "تم اللہ کا مقتول بندہ بنو، قاتل بندہ نہ بنو"۔ رہ گیا جزیرہ تو وہ خارجی مسلک کا علاقہ ہے وہ لوگ دین سے خارج ہو چکے ہیں۔ رہ گئے بدوی لوگ تو وہ کفار کی طرح ہیں۔ مسلمان ہیں مگر اخلاقی طور پر نصرانی ہیں۔ اور شام والے تو وہ ابوسفیان کی اولاد کے علاوہ کسی کو جانتے ہی نہیں۔ انہیں بنو مروان کی اطاعت کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ہماری عداوت جڑ پکڑ چکی ہے اور وہ تو بر تو جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اہلِ مکہ اور مدینہ تو ان پر ابوبکرؓ و عمرؓ چھائے ہوئے ہیں۔ البتہ خراسان سے نہیں توقعات ہو سکتی ہیں۔ وہاں لوگوں کی بڑی کافی تعداد ہے اور ان میں شجاعت اور بہادری بھی ہے۔ ان کے سینے صاف ہیں اور دل فارغ ہیں۔ ان میں خواہشات نفسانیہ نے اپنا مسکن نہیں بنایا اور اسلام کے مختلف فرقوں نے انہیں آپس میں تقسیم بھی نہیں کیا۔ اب سے پہلے وہ کسی خاص دین کے پیرو بھی نہیں رہے اور فتنہ و فساد نے بھی ان میں جگہ نہیں پائی۔ ان کے خیالات بھی عربوں کی طرح بلند نہیں اور ان میں وہ تعصب بھی نہیں ہے جو مختلف سرداروں کے لئے ان کے پیروکاروں میں ہوا

---

[۱] رسائل جاحظ۔ ص ۶۳۔ [۲] رسائل جاحظ۔ ص ۷۳۔

کرتا ہے یا جو مختلف قبائل میں باہمی معاہدات کی بنا پر ہوتا ہے۔ وہ آج تک محکوم ہی رہے ہیں اور ذلیل کئے جاتے رہے ہیں، ان پر برابر ظلم ہوتا رہا ہے اور وہ برابر جوشِ انتقام کو دباتے چلے گئے اور مختلف حکومتوں سے آسرے باندھتے چلے آرہے ہیں۔ وہ ایک ایسی فوج ہیں جن کے جسم اور بدن مضبوط، شانے اور کندھے ابھرے ہوئے، کھوپڑیاں، ڈاڑھیاں اور مونچھیں رعب دار، آوازیں گرجدار اور زبانیں پُرمغز ہیں جو اجنبی مونہوں سے نکلتی ہیں[1]۔

ان اقوام میں سے ہر قوم میں مختلف جماعتیں تھیں جن کے خاص شعائر اور عادات تھے۔ ان میں یہودی بھی تھے جو اپنی تقلیدات کے سختی سے پابند تھے۔ ان کے ہاں اپنی ملت سے باہر بیاہ شادیاں حرام تھیں۔ ان میں نصرانی بھی تھے جو اپنے شعائر اور عادات کے پابند تھے۔ ان میں مجوسی بھی تھے جو اپنے ہیکلوں میں قیام پذیر تھے اور اپنے آتش خانے برابر روشن رکھتے چلے آرہے تھے۔

اس کے علاوہ لٹریچر بھی ہمیں مختلف قسم کا ملتا ہے۔ ایرانیوں کا لٹریچر ان کی تاریخ اور حیاتِ اجتماعیہ کا مظہر تھا۔ عراقیوں کے پرانے لٹریچر موجود تھے جو ان اقوام سے ان کی وراثت میں ملے تھے جو یکے بعد دیگرے ان پر مستولی رہی تھیں۔ مصریوں کا ایک الگ لٹریچر تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا لٹریچر، شام کا لٹریچر، یونانی اور رومی لٹریچر سب ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے۔

ادب میں اُن کا اختلاف

اقلیمی اختلافات کو چھوڑیئے۔ کوئی قوم میدانی علاقوں میں سکونت پذیر تھی۔ کسی قوم کا وطن نہایت سرد تھا اور کسی قوم کا نہایت ہی گرم، کوئی قوم ساحلی مقامات کی رہنے والی تھی تو کوئی قوم صحرائی مقامات کی باشندہ۔ ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس اقلیمی اختلافات کے ماتحت عادات، طبیعت اور مزاج میں رونما ہونے چاہئیں۔

یہ تمام اختلافات جن کے ہم نے محض تھوڑے سے نمونے گنائے ہیں، اس مملکتِ اسلامیہ کا آب و گل تھے جس سے عباسیوں کا ابتدائی دورِ حکومت عبارت تھا۔ اس مملکت کا میدان وہ برتن تھا جس میں ان مختلف عناصر کا اختلاط و امتزاج عمل میں آرہا تھا اور وہ اثرات مرتب کر رہا تھا جو مختلف اجسام ایک

---

[1] عیون الاخبار صفحہ ۲۰۴ ج ۱۔

دوسرے کے ساتھ مل کر کیمیاوی طور پر مرتب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے قومی عوامل بھی تھے جو اس امتزاج کی مدد کر رہے تھے۔ جن کی طرف ہم اپنی اس کتاب کی پہلی جلد میں اشارہ کر چکے ہیں[1] لیکن یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کے متعلق ایک بات کا اضافہ کر دیں جس کے اثرات اس زمانہ میں بہت نمایاں تھے۔ یہ چیز "تولید" کے اثرات تھے۔

عملِ تولید

"تولید کے اثرات" سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کا مرد اور کسی دوسری قوم کی عورت آپس میں شادی کر لیں اور ان دونوں سے ایک نئی نسل چلے جس کی رگوں میں دونوں قوموں کا خون دوڑ رہا ہو، ابتدائی عباسی دورِ حکومت اس قسم کے لوگوں کی کثرت کے ... امتیاز تھا۔ اس قسم کی تولیدی نسل نمایاں قوتوں کی ،ایک ہوتی تھی، جو مختلف ، جنسوں کے اختلاط اور غلامی اور والا رکے نظام سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ اسلامی فتوحات کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ اسلامی گھرانہ ـــــ خصوصیت کے ساتھ خلفاء، امراء اور مالداروں کے گھرانے ـــــ مختلف قوموں کا ایک مجموعہ بن گیا تھا جس سے ایسی نسل پیدا ہو رہی تھی، جو مختلف قوموں کے خصائص و امتیازات اپنے اندر لئے ہوئے تھی۔ اس کے لئے مثال کے طور پر ابو جعفر منصور کے گھرانے کو لے لیجئے۔ منصور کے گھر میں اروی بنت منصور حمیری تھی جس کے بطن سے مہدی اور جعفر اکبر پیدا ہوئے تھے۔ ایک کردی قبیلہ کی باندی تھی جسے منصور نے خرید لیا تھا اور ان کے زیر استعمال تھی۔ اس کے بطن سے جعفر اصغر پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک رومی باندی بھی تھی جس کا نام "قالی" تھا، اس کے بطن سے صالح مسکین پیدا ہوئے تھے۔ ان سب کے علاوہ بنو امیہ کی ایک خاتون تھیں جن کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام "عالیہ" تھا[2]۔ یہ حالت اس صورت میں تھی کہ منصور نے باندیاں رکھنے اور انہیں استعمال کرنے میں اس زیادتی سے کام نہیں لیا جس زیادتی سے بعد میں آنے والے خلفاء نے کام لیا ہے۔ چنانچہ ہارون رشید کے پاس دو ہزار سے اوپر باندیاں تھیں۔ ان میں گانے والیاں، شراب کی محفل کی خادمائیں وغیرہ سب شامل تھیں۔ یہ طرح طرح کے کپڑوں اور بہترین لباسوں میں ملبوس اور جواہرات سے آراستہ و پیراستہ رہتی تھیں[3]۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ متوکل کے پاس چار ہزار باندیاں تھیں جو اس کے استعمال

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب فجر الاسلام جلد اوّل .... اور اس کے بعد۔

[2] العقد الفرید۔ صفحہ ۲۹۸ ج ۳۔

[3] اغانی۔ صفحہ ۸۰ ج ۹۔

میں تھیں۔ط ہم ان چیزوں کا بالتفصیل تذکرہ وہاں کریں گے جہاں ہم باندیوں سے متعلق گفتگو کریں گے۔

یہ باندیاں مختلف انواع کی ہوتی تھیں۔ وہ جو فاتحین میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ نخامہ کے بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں۔ قیمتی تحفوں کی طرح ہدیوں میں پیش کی جاتی تھیں۔ اموال کی طرح بطور عطیہ کے عطا کی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ آزاد عورتیں بھی ہوتی تھیں جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کی شادیاں اجنبی قوموں کے اندر کر لی جاتی تھیں۔ یہ باندیاں اور آزاد عورتیں بے شمار نسلیں تیار کرتی جا رہی تھیں۔ ان کی نسل خالص عربی عورتوں کی نسل سے کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ ایسی عربی عورتوں کی تعداد بہت ہی کم تھی جو کسی غیر عرب سے منسوب ہوں۔ لوگوں میں غیر عرب عورتوں کے ساتھ اختلاط کا رجحان بہت شدید اور قوی تھا بلکہ آزاد عورتوں کی بہ نسبت باندیوں کی طرف ان کا رجحان زیادہ تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ (اوّل) ان مفتوحہ قوموں کی عورتوں میں جمال زیادہ اور حسن مکمل تھا۔ ان کے حسن و جمال کو حضارت و مدنیت اور تنعم نے اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ملک کے طبعی حالات نے جلد کی سفیدی، بالوں کا بھورا پن اور آنکھوں کی نیلگونی جو انہیں عطا کی تھی وہ سونے پر سہاگہ تھی۔

دوسرا سبب وہ تھا جس کی طرف جاحظ نے اشارہ کیا ہے کہ آزاد عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج اس زمانہ میں بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ آجکل ہمارے ہاں ہے۔ آدمی اس لڑکی کو خود نہیں دیکھ سکتا تھا جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک پیغام لے جانے والی درمیان میں واسطہ ہوتی تھی۔ وہ اس لڑکی کے محاسن اس کے سامنے جس طرح چاہتی تھی بیان کرتی تھی۔ اکثر اس درمیانی عورت کا ذوق اور دولہا کا ذوق ہم آہنگ نہیں ہوتا تھا۔ یہ ساری دشواریاں تو اس وقت تھیں کہ پیغام لے جانے والی عورت ساری باتیں سچ سچ بیان کر دیتی ہو۔ ورنہ یہ اندیشہ بھی الگ لگا رہتا تھا کہ پیغام لے جانے والی عورت غلط بیانی سے کام نہ لے رہی ہو۔ باندیوں میں یہ بات نہیں تھی۔ خریدنے والا خریدنے سے پہلے اسے اچھی طرح دیکھ لیتا تھا۔ چنانچہ جاحظ نے بیان کیا ہے کہ "کسی آدمی نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں گراں قدر مہر ادا کر کے نکاح میں لائی ہوئی عورتوں کی بہ نسبت باندیاں کیوں زیادہ مقبول ہیں یہ دلیل دی تھی کہ آدمی باندی کا مالک ہونے سے پہلے اس کی ہر چیز دیکھ لیتا ہے۔ صرف اتنی ہی کسر رہ جاتی ہے کہ خادت کا مزہ اس کو نہیں ملتا اور بس"۔ بہرحال

ط مسعودی۔ صفحہ ۳۰۸۔ ج ۳۔

وہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اسے خریدتا ہے اور اس وقت خریدتا ہے جب وہ اسے ہر طرح پسند آجاتی ہے۔
اس کے برخلاف ایک آزاد عورت کے حسن وجمال کے متعلق عورتوں سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ عورتیں عورتوں کی خوبصورتی بیان کرنے میں نہ تھوڑی نہ بہت بصیرت رکھتی ہیں اور نہ مردوں کی ضروریات اور دل پسندی کا لحاظ رکھ سکتی ہیں۔ مردوں ہی کو عورتوں کے متعلق بصیرت ہو سکتی ہے۔ ایک عورت کسی دوسری عورت کی خوبصورتی بڑی عمدگی سے بیان کرے گی تو زیادہ سے زیادہ یہی کہے گی کہ اس کی ناک تلوار کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں ہرنی کی طرح ہیں۔ اس کی گردن چاندی کی صراحی کی گردن کی طرح ہے یا اس کے بال انگوروں کے گچھوں کی طرح ہیں۔ حالانکہ مرد کی پسندیدگی کے اور بھی بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ جن کے ماتحت ہی محبت اور ناپسندیدگی کا فیصلہ مرتب ہوتا ہے۔

عربوں کے ہاں یہ مشہور کہاوتیں تھیں" باندی آنکھوں سے دیکھ کر خریدی جاتی ہے اور اگر اس میں کوئی عیب نکل آئے تو وہ واپس کی جا سکتی ہے۔ لیکن آزاد عورت تو جس کے گلے میں پڑ جائے طوق بن کر رہ جاتی ہے"۔ ایک دوسری کہاوت ہے" تعجب ہے جو آدمی چھوٹا کپڑا پہن سکتا ہو وہ لمبا کپڑا کیسے پہن لیتا ہے۔ جو بالوں کو منڈاتا ہو وہ انہیں کیسے بڑھا لیتا ہے۔ تعجب پر تعجب ہے کہ جو باندیوں کا مزہ چکھ چکا ہو وہ آکا دعورتوں سے کس طرح شادی کر لیتا ہے"۔

مختلف علاقہ کے لوگوں کو مختلف جنس کی عورتوں کی طرف میلان ہوا کرتا تھا جو غالباً قرب مکانی کی وجہ سے ہوتا ہو یا اس وجہ سے کہ وہ اس جنس کی عورتوں کو زیادہ گرفتار اور غلام بناتے تھے۔ چنانچہ بصرہ والوں کی طبیعت کا میلان ہندوستانی عورتوں اور ہندوستانی لڑکیوں یا ہرات کی عورتوں کی طرف زیادہ تھا۔ یمن کے لوگوں کا رجحان حبشی عورتوں اور حبشی لڑکیوں کی طرف زیادہ تھا۔ شام کے لوگوں کو رومی عورتوں اور رومی لڑکیوں کا زیادہ اشتیاق تھا۔ ہر قوم زیادہ تر ان عورتوں کی طرف میلان رکھتی تھی جنہیں وہ زیادہ تر گرفتار کرتے تھے۔ شاذ ونادر ہی دوسری جنس کی عورتوں کی طرف ان کا میلان ہوتا تھا اور شاذ ونادر پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔[1]

اس اختلاط کے نتیجہ میں جس کا تذکرہ ہم کرتے چلے آرہے ہیں ایک نئی نسل پیدا ہوئی جو خصوصی امتیازات

---

[1] رسائل جاحظ۔ ص ۷۵۔

مولّدین کے امتیازات

کی حامل تھی حتیٰ کہ خود بعض خلفاء اس صنف سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ خیزوان کے بطن سے جو خراسان سے گرفتار کر کے لائی گئی تھی محمد المہدی کے دونوں بیٹے موسےٰ ہادی اور ہارون الرشید پیدا ہوئے تھے اور شاہ سرم دختر فیروز بن یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ پرویز کے بطن سے ولید بن عبدالملک کے دونوں بیٹے یزید بن الولید ناقص اور ابراہیم بن الولید مخلوع پیدا ہوئے تھے[1]۔ اور مروان بن محمد ایک کُردی باندی کے بیٹے تھے۔ ابو جعفر منصور کی ماں بربر کی رہنے والی تھی جس کا نام سلامتہ تھا۔ مامون کی ماں ایک باندی تھی جس کا نام مراجل تھا۔ معتصم کی ماں بھی ایک باندی تھی جس کا نام ماردہ تھا۔ واثق کی ماں بھی ایک باندی تھی جس کا نام قراطیس تھا۔ متوکّل کی ماں بھی ایک باندی ہی تھی جس کا نام شجاع[2] تھا۔ یہی حال علماء اور شعراء کا تھا۔ اصمعی کا بیان ہے کہ مدینہ منوّرہ کے زیادہ تر لوگ باندیوں کو پسند کرتے تھے حتیٰ کہ ان کے بطن سے علی بن الحسین، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ پیدا ہوئے اور وہ فقہ، علم اور زہد و تقویٰ میں تمام اہلِ مدینہ پر بازی لے گئے۔ اس کے بعد عام لوگوں کا باندیوں کی طرف رجحان بڑھ گیا[3]۔

اس قسم کے پیدا ہونے والے بچے قوانینِ وراثت کے ماتحت اپنی ماؤں اور والدوں دونوں ہی کی مخصوص صفات کے بیک وقت حامل ہوتے تھے اور اس طرح یہ ایک جُداگانہ صنف بن گئے تھے۔ عربوں میں پرانے زمانہ سے یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ دُور کے لوگوں میں شادیاں کرنا قریبی رشتہ داروں میں شادیاں کرنے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث بھی نقل کی جاتی ہے: "اِغْتَرِبُوْا لَا تَضْوُوْا" اجنبی لوگوں میں شادیاں کرو تاکہ لاغر نہ ہو جاؤ۔ کسی شاعر کا ایک شعر ہے:

فَتًی لَمْ تَلِدْہُ بِنْتُ عَمٍّ قَرِیْبَۃٌ ‏ ‏ فَیَضْوٰی وَقَدْ یَضْوٰی رَدِیْدُ الْقَرَائِبِ

وہ ایک جوان ہے جسے قریبی چچازاد بہن نے نہیں جنا کہ وہ لاغر ہو جاتا کیونکہ قریبی رشتہ داروں سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ اکثر لاغر اندام ہو جاتی ہے۔

کسی دوسرے شاعر کا ایک شعر ہے:

---

[1] زہر الآداب بحاشیہ العقد الفرید۔ ص ۲۲۲ ج ۱۔ [2] ملاحظہ ہو کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۱۲۸ و ما بعد۔
[3] العقد الفرید۔ ص ۲۷۶۔ ج ۳۔

أُنْذِرُ مَنْ كَانَ بَعِيدًا الْهَمِّ　　　تَزْوِيجَ أَوْلَادِ بَنَاتِ الْعَمِّ

فَلَيْسَ نَاجٍ، مِنْ ضَوًى وَ سَقْمٍ

میں بلند ہمت لوگوں کو اس بات سے ڈراتا ہوں کہ چچیری بہنوں کی اولاد سے شادیاں کریں کیونکہ ان سے جو بچے پیدا ہوں گے وہ لاغری اور بیماری سے بچ نہیں سکتے۔

کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے قریش کے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے جسم چھوٹے چھوٹے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا "تمہیں کیا ہوا۔ تمہارے جسم چھوٹے چھوٹے کیوں رہ گئے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "اس لئے کہ ہماری مائیں ہمارے والدوں کی قریبی عزیز تھیں!" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اجنبی لوگوں میں شادیاں کیا کرو"! چنانچہ اس کے بعد انہوں نے دور کے خاندانوں میں شادیاں شروع کر دیں اور ان کا وہ نقص جاتا رہا۔

واقعات نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے۔ چنانچہ عباسی دورِ حکومت میں جو ملے جلے بچے پیدا ہوئے وہ جسمانی اعتبار سے بہت توانا اور مضبوط تھے۔ ایسے بچے جسمانی، عقلی اور صناعتی اعتبار سے مختلف امتیازات کے مالک ہوتے تھے جس کی وجہ یہی تھی کہ ان کی مائیں دوسری قوموں سے تعلق رکھتی تھیں۔ کسی فوجی کمانڈر کا قول ہے کہ "دنیا کی کوئی قوم خراسان کے باندی زادوں سے زیادہ بہادر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کرتا۔[1] اصمعی کا قول ہے کہ چچازاد بہنیں زیادہ صابر ہوتی ہیں مگر اجنبی عورتیں زیادہ شریف ہوتی ہیں۔ اور عجمی عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں سے زیادہ بہادروں کی کھوپڑیاں کوئی نہیں اُڑا سکتا۔" کسی شخص سے رومی عورت کے بیٹے کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ایسا لڑکا چھچھورا، خود پسند اور بخیل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس سے مقلبی عورت کے لڑکے کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ بہت گندا اور بہت کمینہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس نے سیاہ فام عورت کے بچوں کے متعلق سوال کیا تو اس نے بتایا کہ ایسے بچے بہادر اور سخی ہوتے ہیں۔ پھر اس نے گندم گوں عورتوں کے بچوں کے متعلق سوال کیا تو اس نے بتایا کہ ایسے بچے زیادہ ہونہار، نرم جسم اور خوش ذہن ہوتے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ عربی عورتوں کے بچے کیسے ہوتے ہیں تو اس نے بتایا کہ

---

[1] طیفور۔ ص ۱۴۳۔

کج خلق اور حاسد ہوتے ہیں[۱]۔ جاحظ کہتے ہیں کہ "ہم نے خلاسی لوگوں کو دیکھا ـــــ خلاسی وہ بچے کہلاتے ہیں جو گورے اور حبشی کے میل سے پیدا ہوں ـــــ عادۃً اس ملاپ سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے والدین سے زیادہ قدآور اور زیادہ قوی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ نیز ہم نے یسری لوگوں کو دیکھا ـــــ یسری وہ بچے کہلاتے ہیں جو گوروں اور ہندوستانیوں کے میل سے پیدا ہوں ـــــ اس قسم کے بچوں میں نہ ماں باپ جیسا قد رہتا ہے نہ قوت ہوتی ہے البتہ اپنے والدین سے زیادہ حسین اور ملیح ہوتے ہیں[۲]۔ جاحظ ہی ایک دوسرے مقام پر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہ یہودیوں کے مقابلہ میں نصرانی لوگ صورت وشکل اور عقل وشعور میں زیادہ ممتاز کیوں ہوتے ہیں، لکھتا ہے کہ ایک اسرائیل، اسرائیلی لڑکی ہی سے شادی کرتا ہے۔ ان کے ہاں اجنبی عورتوں کا میل نہیں ہوتا۔ اور مختلف اجناس کے بہتر اثرات ان میں اپنا کام نہیں کرتے ہیں[۳]۔

آپ کا جی چاہے تو کتاب الاغانی کو دیکھ جائیے آپ یہ چیز دیکھیں گے کہ حجاز میں اس کے بعد عباسی دورِ حکومت کی ابتداء میں جو ماہرِ فن گانے والی عورتیں ملتی ہیں وہ مدینہ منورہ کی وہی عورتیں ہیں جو ملی جلی نسل سے پیدا ہوئی تھیں، پھر ان کی شاگرد ہیں ـــــ مدینہ منورہ کی اس قسم کی عورتیں وہ ہیں جن کے باپ عربی تھے اور مائیں غیر عربی تھیں ـــــ اگر جی چاہے تو اس عہد کے علماء اور ادباء کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے اور تحقیق کیجئے کہ ان کے باپ کس جنس سے تعلق رکھتے تھے اور مائیں کس جنس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر ملی جلی نسل کے لوگ ہی ملیں گے۔ خراسان کی ملی جلی نسل اور عجمی باندیوں کی اولاد کی علم شجاعت اور بہادری کی شہرت کا حال تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ پرانے زمانے میں یمن کے اندر بھی ایک خاص نسل پیدا ہو چکی تھی جسے اہلِ عرب "الابناء" کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں کسریٰ نے سیف بن ذی یزن کے ساتھ بھیجا تھا جب وہ حبشہ کے خلاف اس سے مدد مانگنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے سیف بن یزن کی مدد کی اور بالآخر یمن کے مالک ہو گئے۔ انہوں نے ملک کا انتظام و انصرام کیا اور عربوں ہی میں شادیاں کر لیں۔ ان سے جو بچے پیدا ہوئے ان کو آبناء کہتے تھے۔ ان پر یہ نام اس لئے بولا جاتا تھا کہ ان کی مائیں ان کے باپوں

---

[۱] ضحی الاسلام ص ۲۰ ج ۱۔ [۲] کتاب الحیوان ص ۱ ج ۱۔ [۳] رسائل جاحظ برحاشیہ کامل ص ۱۶۹-۱۷۰ ج ۲۔

ی جنس سے تعلق نہیں رکھتی تھیں[1]۔ ان ابناء میں سے جو مشہور علماء گذرے ہیں ان میں سے طاؤس بن کیسان اور وہب بن منبہ ہیں جو دونوں تابعی ہیں۔ ان ابناء کے باپ ایرانی تھے اور مائیں یمن کی عربی تھیں۔ لیکن عباسی مصر میں جو بچے پیدا ہوئے ان کے زیادہ تر باپ عربی تھے اور مائیں عجمی تھیں۔

تولیدِ عقلی

جیسا کہ جسمانی طور پر عالمِ اسلام میں "تولید" کا یہ عمل اپنا کام کر رہا تھا اسی طرح عقلی طور پر بھی یہ اپنے اثرات مرتب کرتا جا رہا تھا۔ مختلف اقوام سے متعلق لوگوں کی عقلیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل رہی تھیں۔ ایک ایرانی، ایرانی عقل لے کر آتا اور اسلام کو قبول کر لیتا، عربی زبان کو سیکھتا۔ ان دونوں عقلیتوں کے اختلاط سے ایک نئی چیز پیدا ہوتی تھی جس سے نئے نئے افکار نئے نئے معانی جنم لیتے تھے۔ یونانی، نصرانی، رومی نصرانی، عراقی یہودی، عربی مسلمان سے ملتا جلتا اور اس طرح آراء کا، کہانیوں کا، فکر و نظر کا تبادلہ عمل میں آتا اور اس طرح ایک نئی فکر جنم لے لیتی تھی ——— یہی وجہ ہے کہ "عربی لٹریچر" اپنے وسیع معنی میں وہ لٹریچر بن گیا تھا جس میں ہر تہذیب و ثقافت کا حصہ تھا۔ وہ درحقیقت عربی لٹریچر نہیں رہا تھا بلکہ وہ ایک مخلوط لٹریچر تھا جس پر محض عربی کی اسلامی چھاپ لگی ہوئی تھی اور اس وجہ سے اسے عربی لٹریچر کہہ دیا جاتا تھا۔ ہم اس کی ایک مثال دیتے ہیں جس سے اس کی توضیح ہو جائے گی۔ ہم عربوں کو دورِ جاہلیت میں دیکھ چکے ہیں۔ ان کا لٹریچر صحیح معنوں میں عربی لٹریچر تھا۔ اگرچہ اس نے بھی اپنے اردگرد سے کچھ نہ کچھ ضرور لیا تھا لیکن یہ لینا ایسا ہی تھا جیسے آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ لیکن غالب اور قوی روح عربی روح ہی تھی۔ وہ عربی زندگی کی بہترین تمثیل پیش کرتا تھا۔ وہ ان کی حیاتِ اجتماعی کی مکمل تر صورت میں تصویر کشی کرتا تھا۔ اس میں ان کے خیالات تھے۔ ان کے شکار کے طریقے تھے۔ ان کی جنگوں کے اوصاف تھے۔ ان کا کھیل کود تھا۔ ان کے حقیقت پسندانہ رجحانات تھے ان کی خانہ بدوشی تھی۔ لیکن جونہی ہم عباسی عصر میں زقند لگاتے ہیں تو نقشہ ہی دوسرا نظر آتا ہے۔ لوگ خصوصیات کے ساتھ وہ ایرانی لوگ جو اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور جن کا کاروبارِ حکومت پر خاصا غلبہ و تسلّط تھا اپنے ایرانی ذوق کے ساتھ عرب کے جاہلی اشعار میں ان کو کچھ مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ انہیں اسی قسم کے اشعار گانے میں مزہ آتا تھا جن سے وہ مانوس چلے آ رہے تھے کہ اشعار

---

[1] لسان العرب مادۂ "ابن"۔

میں عشق و محبت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ خمریات کا نشہ ہو۔ چنانچہ عباس بن احمد (جو خاندانی طور پر خراسانی ہے) اور ابونواس (جس کی ماں ایرانی ہے) ہی ان کے ذوق کی سیرابی کر سکتے تھے۔ عباس بن احمد عشقیہ مضامین میں اور ابونواس خمریات میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ عرب کے جاہلی اشعار میں بھی عشق و محبّت کا ذکر ہوتا تھا۔ ان کے ہاں بھی خمریات ہوتی تھیں۔ لیکن طرفہ کی خمریات اور ابونواس کی خمریات میں کتنا بڑا فرق تھا۔ امرؤ القیس کے عشق میں اور عباس کے عشق میں کتنا بعد المشرقین تھا۔ مجھے اس سلسلہ میں جاحظ کا یہ قول بہت پسند آیا کہ امراؤ القیس کے اس شعر

تَقُولُ وَقَدْ مَالَ الْغَبِيطُ بِنَا مَعاً

وہ باتیں کر رہی تھی کہ یکایک اونٹ کی کاٹھی ہم دونوں کو ایک ساتھ لے کر ایک طرف کو جھک گئی

اور علی بن الجہم کے ان اشعار میں کس قدر تفاوت ہے ؎

سَقَى اللّٰهُ لَيْلاً ضَمَّنَا بَعْدَ هَجْعَةٍ ۔۔۔ وَأَدْنَى فُؤَاداً مِنْ فُؤَادٍ مُعَذَّبِ

فَبِتْنَا جَمِيعاً لَوْ تُرَاقُ زُجَاجَةٌ ۔۔۔ مِنَ الرَّاحِ فِيمَا بَيْنَنَا لَمْ تُسَرَّبِ

خدا اس رات کو ہمیشہ سیراب رکھے جس نے کچھ وقفہ کے بعد ہمیں اکٹھا کر دیا اور ایک دل کو دوسرے اذیت رسیدہ دل سے قریب تر کر دیا۔ ہم دونوں نے اس طرح اکٹھے رات گذاری کہ اگر شراب کی بوتل ہمارے درمیان میں گرا دی جاتی تو اس کا ایک قطرہ نیچے تک نہ پہنچ سکتا۔

تنہا مدنیت اور حضارت ہی نہیں تھی جو اس فرق و امتیاز کا موجب تھی بلکہ اس کا بڑا سبب مختلف جنسوں کا ملاپ اور متفرق کا اختلاط تھا جیسا کہ اشعار میں تھا۔ ایرانیوں نے عربی وزن، عربی قافیہ اور عربی اسلوب کو لے لیا اور اس کے پہلو بہ پہلو انہوں نے ایرانی خیالات اور ایرانی ذوق کو بھی جگہ دی۔ ذرا اس قصیدے کو ملاحظہ فرمایئے جو خریمی نے کہا ہے۔ وہ بغداد کا تذکرہ کرتے ہوئے ان فتنوں کا بیان کرتا ہے جو پے در پے بغداد کو۔ امین اور مامون کی جنگ کے دوران میں ——— پیش آئے۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

قَالُوا وَلَمْ يَلْعَبِ الزَّمَانُ بِبَغْدَادَ وَتَعْثُرْ بِهِ عَوَاثِرُهَا

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بغداد کے ساتھ کیوں کھیلتا رہتا ہے اور زمانہ کے حوادث اس پر کیوں گزرتے ہی رہتے ہیں۔

آپ ایسا محسوس کریں گے کہ شاعر ایک ڈرامائی طویل مگر مطمئن کن نظم پیش کر رہا ہے، جس سے عربوں کو اب سے پہلے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ ذرا ایک نظر ہندی، ایرانی، عربی حکمتوں پر بھی ڈالتے جائیے ——— جو ابن المقفع کے اقوال کلیلہ ودمنہ میں ملتے ہیں ——— پھر ان مختلف الانواع مقامات پر بھی تدبّر کیجئے جو بدیع ہمدانی اور حریری کے عملِ تکثیر کا نتیجہ ہیں۔ یہ ساری چیزیں ایسی الانواع ہیں جو خالص عربوں کے خیال اور تصوّر میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ یہ تمام چیزیں یقیناً ——— شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے ——— اسی تولید کے اثرات اور نتیجہ تھے جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ اگر عرب تنہا رہتے، یا اگر ایرانی تنہا زندگی بسر کرتے تو یقیناً یہ چیزیں منصۂ شہود پر نہ آسکتیں۔ یہی کچھ ان انواع و اقسام کے علوم و معارف کے متعلق کہا جاسکتا ہے جن کو ہم آئندہ فصلوں میں وضاحت سے بیان کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلوں کے اس امتزاج و اختلاط نے ایسی نئی نئی مخلوقات کو جو مخصوص امتیازات کی مالک تھیں بالکل اسی طرح جنم دیا جیسا کہ اجسام کی تخلیق میں نئے نئے اجسام کو جنم دیا تھا۔

مختلف عناصر میں ہم آہنگی و یک رنگی

اس کے بعد یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ ان متنوع اختلافات کے باوجود ——— جو ہم وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں ——— وہاں ایک ایسی روح کارفرما تھی جو پورے عالمِ اسلامی پر سایہ فگن تھی۔ یہ مشرقیت کی روح تھی ——— جو باوجود اجناس و انواع کے گوناگوں اختلافات کے ——— سب میں یکساں طور پر موجود تھی۔ وہی روح جس نے یونانی شہروں میں داخل ہونے کے بعد یونانی فلسفہ کو بھی اپنے تابع فرمان بنا لیا اور اسے روحانیت اور الہامات کا لباس پہنا کر چھوڑا۔ یہی وہ روح ہے جس کا اعتراف تمام اجتماعات اور تاریخ کے علماء نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ مشرقی ممالک کے درمیان یہ ان مشترک خصوصیات میں سے ہے جو مغربی میلانات کے قطعاً مخالف ہے۔ یہ وہ روح ہے جو مشرق نے قرنہا قرن سے بطور وراثت کے حاصل کی ہے۔ جس کی تکوین و تخلیق میں ان کے اندرونی طبعی اور اجتماعی احوال و ظروف نے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اس روح نے ان کے ذوق کو کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ ایک مغرب کا رہنے والا ان کے ذوق کو محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اس روح کے ماتحت چیزوں کا ادراک اس طریقہ سے نہیں کرتے جس طریقہ سے مغربی اقوام کرتی ہیں۔ اس روح نے ان کی مدنیتوں کو ——— مختلف جہات سے ——— مغربی مدنیتوں کے

برعکس پروان چڑھایا ہے۔ بدھ ازم، یہودیت، نصرانیت وغیرہ مختلف دین آئے۔ اس روح نے ان کو ایک خاص رنگ میں رنگا۔ یہ رنگ بہر حال مادی نہیں تھا۔ یہ سارے ادیان اس جہاں سے اوپر ایک اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ جنت کے امیدوار اور جہنم سے خائف تھے۔ سب کا یہ خیال تھا کہ اس دنیوی سعادت اور جسمانی خواہشات کے بعد ایک دوسری روحانی سعادت بھی ہے۔ جب اسلام آیا اور اس نے مشرقی ممالک پر اپنا غلبہ و تسلط پھیلایا تو اس نے اس روح میں اضافہ ہی کیا اور اسے تقویت ہی پہنچائی۔ ان سب کو ایک کر دینے میں اس نے اپنا پارٹ ادا کیا۔ یہ ساری مختلف قومیں ایک قانون کی مطیع اور حکومت میں ایک نظام کی تابع فرمان تھیں۔ ایک زبان بولتی تھیں اور اکثر حالات میں ایک دین کے ماتحت زندگی گذارتی تھیں۔ باوجود نقل و حمل کی صعوبتوں کے علمار کے سفرنامے دور و دراز انتہائی زوروں پر تھے۔ یہ اعتقادات اور آرار میں ایک دوسرے سے تبادلہ رخیال کرتے تھے۔ دینی اور سیاسی دعوتیں دیتے تھے۔ مرکزِ خلافت سے اطراف و اکناف میں ایسے حکام بھیجے جاتے تھے جو مختلف تعلیمات سے مسلح اور آراستہ ہوتے تھے۔ مگر یہ تعلیمات باوجود اختلافات کے اپنے جوہر میں ایک ہوتی تھیں۔

ان تمام چیزوں نے مل کر مختلف قوموں میں ایک قسم کی وحدت پیدا کر دی تھی اور ان سب کے مجموعہ سے ایک ایسی قوم بنا دی تھی جسے "اُمّتِ واحدہ" کہا جا سکتا تھا۔ اس کا لٹریچر اب ایک تھا ان کی تہذیب ایک تھی اور ان کا علم مشترک تھا۔

فصل دوم

عربوں اور موالی کے درمیان مقابلہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے اندر اس کا کوئی قومی شعور موجود ہی نہیں تھا کہ وہ کوئی اُمّت ہیں بلکہ ان میں قومی شعور اپنے قبیلہ سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ کوئی اشعار جن کی صحت ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح ہو، قبائلی شعور سے پُر ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک عربی اپنے قبیلہ کی تعریف کرتا ہے،

عرب جاہلیت میں قبائلی شعور کا غلبہ

اس کی فتح و نصرت کے گن گاتا ہے، اس کی خوبیاں گناتا ہے اور اپنے قبیلہ کی وجہ سے دوسرے قبیلہ کی ہجو کرتا ہے۔ ایسا بہت ہی کم ملتا ہے کہ کوئی عربی اس کے گن گاتا ہو کہ میں عربی ہوں اور وہ غیر عربی اقوام پر فخر کرتا ہو۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں صحیح معنی میں ایک اُمّت، یا ایک قوم نہیں تھے۔ وہ زبان اور دین کے اعتبار سے بھی کوئی ایک وحدت نہیں تھے۔ ان کی وطنی آرزوئیں یکساں نہیں تھیں۔ نہ ان میں وہ چیز پائی جاتی تھی جو کسی قوم کے لئے ابتدائی شرط ہوتی ہے۔ یعنی کوئی ایک شخصیت یا کوئی ایک ہیئتِ حاکمہ جو ایک کے بجائے متعدد افراد پر مشتمل ہو اسے اپنے احکام کو تمام افراد پر نافذ کرنے کی طاقت ہو، اور وہ انھیں اپنی اطاعت پر اُبھار سکے۔ قبائلی معیشت کی طبیعت جس کے مطابق عرب اپنی زندگی گذار رہے تھے اس صورتِ حال کو گوارا ہی نہیں کرتی تھی۔

اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ وہاں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جو عربوں کو اس طرزِ فکر کی طرف متوجّہ اور راغب کر سکے۔ کیونکہ جب وہ اس نظر سے غور کرتے تھے تو ان میں سے اپنے متعلق کسی عظمت اور فخر

کا شعور پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک جہت سے ان کے گرد ایرانی تھے اور دوسری طرف سے رومی تھے۔ ان کے ساتھ عربوں کا تعلق کچھ اس قسم کا تعلق نہیں تھا جس سے اپنی قوت کا شعور پیدا۔ وہ ان کے ساتھ تجارتی معاملات کرتے تھے۔ مگر یہ تعلق اس قسم کا نہیں تھا جو ایک برابر کے آدمی کا برابر کے آدمی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یہ تعلق تو ایک مالدار کے ساتھ ایک فقیر کا سا تعلق یا ایک قوی قوم کے ساتھ ایک کمزور قوم کا سا تعلق تھا۔ ان میں سے جو تاجر ایران اور روم کی طرف منتقل ہو گئے تھے اور انہوں نے ان کی عظمتِ شان کا مشاہدہ کیا تھا وہ ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بہت ہی کمزور محسوس کرتے تھے —— یہ صحیح ہے کہ کچھ قصے کہانیاں ایسی ملتی ہیں جو ہمارے اس دعوے کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً قطامی نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ عربوں کا ایک وفد کسریٰ کے پاس گیا[1]۔ ایسے ہی نعمان بن المنذر کا عربوں پر فخر کرنا، اور ان کا تمام قوموں سے افضل شمار کرنا۔ جس میں وہ نہ ایران کا استثناء کرتا ہے نہ کسی دوسری قوم کا' اور یہ بات بھی کہ اگر کوئی قوم عربوں کے مقابلہ میں رکھی جائے تو عرب اپنی عزت، شجاعت، خوبصورتی، جنگی اہلیت، سخاوت، زبان کی صفائی اور حکمی، عقلی شدت، فخر اور وفاء وغیرہ میں اس دوسری قوم سے کہیں بہتر نکلے گی الخ لیکن ہمیں اس واقعہ کی صداقت میں کافی شبہ ہے۔ یہ واقعہ سوائے کلبی کے کسی اور مؤرخ نے بیان نہیں کیا اور کلبی مشہور وضاع ہے۔ پھر اس واقعہ کو اس قدر اہم ہونے کے باوجود اموی عصر میں کسی نے بھی بیان نہیں کیا۔

عباسی عہد میں یہ واقعہ صرف کلبی سے نقل کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کے طرزِ بیان اور طرزِ ادا میں جو فنی کاریگری ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات بناوٹی ہے —— بلکہ ہمارے پاس ایسی صحیح روایات موجود ہیں جو اس کے خلاف جاتی ہیں۔ دیکھئے قتادہؒ فرماتے ہیں جو مشہور تابعین میں سے ہیں۔ ساتھ ہی خالص عربی النسل قبیلہ سدوس کے ایک فرد ہیں۔ وہ "كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ قبیلہ لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل تھا۔ ان کی زندگی سب سے بدتر تھی۔ گمراہی میں سب سے آگے، ننگی کھالیں، بھوکے پیٹ۔ دو شیروں۔ ایران اور روم کے درمیان ایک چٹان کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے۔ بخدا ان کے ملک میں ان دنوں کوئی بھی تو ایسی چیز نہیں تھی جس پر

---

[1] اس کا حال العقد الفرید صفحہ ۱۲۴ ج ۱ میں ملے گا۔

کوئی ان پر حسد یا رشک کر سکے۔ ان میں جو زندہ رہتا وہ شوریدہ بختی کے ساتھ زندگی بسر کرتا۔ اور جو مرجاتا' وہ سیدھا جہنّم کا راستہ لیتا۔ انہیں دوسرے کھلاتے تھے وہ خود نہیں کھاتے تھے۔ بخدا ہمیں معلوم نہیں کہ ان دنوں تمام روئے زمین پر کوئی قبیلہ بھی ایسا تھا جو نصیبہ میں ان سے زیادہ کھوٹا اور شان و مرتبہ میں ان سے ذلیل تر ہو حتیٰ کہ اللہ عزّ و جل نے اسلام کو بھیج دیا اور کتابِ الہٰی کو ان کا وارث بنا دیا اور جہاد کرنے کے لئے دوسرے ممالک کو ان کے لئے حلال کر دیا۔ ان کے لئے رزق میں وسعت اور فراخی کر دی اور لوگوں کو ان کی گردنوں پر بادشاہ بنا دیا[۱]۔

عربوں کا جب ایک قبیلہ یوم ذی قار میں ایرانی فوج کی ایک جمعیت پر فتحمند ہو گیا تو انہوں نے اسے اپنے لئے بہت بڑے فخر کی بات سمجھی۔ حالانکہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ کسی قوم کی کوئی جمعیت کبھی نہ کبھی شکست نہیں کھاتی لیکن عربوں نے اپنی فتحمندی پر بڑا فخر محسوس کیا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایرانی حملہ کو پسپا کر سکیں گے۔ بلکہ خود اس قصّہ ہی میں ہمارے اس دعوے کی ایک دلیل موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب ذی قار کی اس جنگ میں عرب فتحمند ہو گئے تو انہوں نے ایرانیوں کے خلاف عربوں کی فتح کے گیت نہیں گائے بلکہ ان قبائل کی فتح مندی کے گیت گائے جو اس جنگ میں شریک تھے۔ وہ شیبانی، عجلی اور یشکری قبائل تھے۔ اس وقت بھی ان کے گیتوں میں عام عربیت کی روح جلوہ گر نہیں ہوئی۔

طبری نے ہمیں بتایا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ایران کی فتح کا ارادہ کیا تو عرب کے لوگ ایرانیوں سے خوفزدہ تھے۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ وہ ایرانیوں سے کس طرح جنگ کر سکیں گے۔ طبری کا بیان ہے کہ عربوں کے نزدیک ایرانیوں کے چہرے نہایت ہی مکروہ اور خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ سلطنت، شوکت، عزّت اور دیگر اقوام پر ان کے غلبہ کی داستانیں کافی مشہور تھیں۔ آخر مثنّیٰ بن حارثہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا۔ لوگو! یہ چہرے تم پر بہت گراں نہ ہو جائیں کیونکہ ہم ایران کے سرسبز علاقوں میں گھس چکے ہیں اور سواد عراق کے بہترین نصف حصّہ پر قابض ہو چکے ہیں۔ ہم نے ان سے مقابلے کئے ہیں اور انہیں کافی زخم پہنچائے ہیں۔ جو لوگ ہم سے پہلے گذر چکے ہیں وہ ان سے ٹکر لینے کی جرأت کر چکے ہیں اور خدا

---

[۱] تفسیر طبری۔ ص ۲۵۔ ج ۴۔

نے چاہا تو آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔[1]

ان باتوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب اپنے قبائل پر عزت و فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ قابلِ تعریف بات جس پر وہ فخر کر سکیں وہی ہو سکتی تھی جسے ان کے قبیلہ کے کسی فرد نے سرانجام دیا ہو جیسے حاجب بن زرارہ نے کسریٰ کے پاس اپنی کمان رہن رکھی اور اس کے بیٹے نے رہن کی رقم ادا کر دی تو یہ ایسی بات تھی جس پر قبیلہ تمیم فخر کیا کرتا تھا۔[2] کسی شاعر یا کسی بہادر پر اس کا قبیلہ ہی فخر کیا کرتا تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ وہ کسی دوسری قوم کی کسی خوبی کو خوبی شمار کرتے ہوں۔

اسلام آیا تو سارے عرب ایک اُمت بن گئے۔ اب ان میں اُمتِ واحدہ بننے کی وہ خصوصیات ـــــ اتحادِ زبان، اتحادِ دین، اتحادِ میلانات اور ان کے سروں پر ایک منظم حکومت کا وجود ـــــ بھی موجود تھیں۔ اس کے بعد اپنے زمانہ کی دو عظیم المرتبت اور عظیم الشان قوموں ـــــ ایران اور روم ـــــ پر ان کو فتح بھی حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ دونوں عصبیتیں ایک ساتھ پائی جاتی تھیں (عربی آدمی کی عصبیت اپنے قبیلہ، اپنے خاندان اور پھر اپنے کنبہ کے لئے) اور (عربی خون کی عصبیت، عربی اُمت کی عصبیت اور جنس عربی کی عصبیت) اسلام کے ابتدائی دَور میں یہ دونوں عصبیتیں پہلو بہ پہلو چلتی رہیں۔

اسلام نے عربوں میں قومی شعور بیدار کیا

زمانۂ اسلام میں بھی ہم ایک عربی کو اپنے قبیلہ پر ایسا ہی فخر کرتا ہوا پاتے ہیں جیسا کہ وہ زمانۂ جاہلیت میں فخر کیا کرتے تھے۔ زمانۂ اسلام میں جنسِ عربی پر دوسرے فخر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

انا من النفر الذین جیادھم ۔۔۔ طلعت علیٰ عاد بریح صرصر !

وسلبن تاجی ملك قیصر بالقنا ۔۔۔ واجتزن باب الدب لابن الاصفر

ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے گھوڑے آندھی کی ہوا کے ساتھ قوم عاد پر نکل پڑے تھے اور جنہوں نے سلطنتِ قیصر کے تاج کو نیزوں کی ضرب سے چھین لیا اور رومیوں کے راستے "باب الدرب" کو کاٹ ڈالا۔[3]

---

[1] تاریخ ابن اثیر ص۱۶ ج ۴۔ [2] ایضاً۔ [3] لیکن دست پروردگانِ رسالتؐ میں یہ عصبیت باقی نہیں رہی تھی۔

پہلی قسم یعنی قبائلی عصبیت ـــــ تو بنو امیہ کے عہد کے تاریخی حوادث اور ان کے دور کے قصائد سب کے سب اس عصبیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ جو ان قصائد ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی کچھ مثالیں پیش کر دیں۔ قبیلۂ اسد بن خزیمہ کا کوئی آدمی یحییٰ ابن حیان کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

قبائلی عصبیت

اَلَاجَعَلَ اللّٰہُ الْیَمَانِیْنَ کُلَّھُمْ ۔۔۔ فِدَیٰ لِفَتَیٍّ الْفِتْیَانِ یَحْیٰی بْنِ حَیَّانٖ

وَلَوْلَا عُرُوْقٌ فِیَّ مِنْ عَصَبِیَّۃٍ ۔۔۔ لَقُلْتُ وَاَلْفًا مِنْ مَعَدِّ بْنِ عَدْنَانٖ

وَلٰکِنَّ نَفْسِیْ لَمْ تَطِبْ بِبِشَارَتِیْ ۔۔۔ وَطَالَبَ لَہٗ نَفْسِیْ بِاَبْنَاءِ قَحْطَانٖ

دیکھو! خدا سارے کے سارے یمنی لوگوں کو نوجوانوں کے نوجوان یحییٰ بن حیان پر قربان کر ڈالے اگر میرے اندر عصبیت کی چھوٹی سی ایک رگ نہ ہوتی تو میں یہ بھی کہتا کہ معد بن عدنان کے قبیلہ کے ایک ہزار آدمی بھی اس پر قربان کر دے۔ لیکن میرا دل اپنے قبیلہ کے متعلق ایسی بات کہتے ہوئے خوشی محسوس نہیں کرتا البتہ اولاد قحطان کے متعلق ایسا کہتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے۔

میرد نے قبیلۂ ازد کے ایک بوڑھے سے نقل کیا ہے جو قابلِ اعتماد شخص ہے۔ وہ بوڑھا اپنے خاندان کے کسی آدمی کے متعلق نقل کرتا ہے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا اور برابر اپنے باپ کے لئے دعائیں مانگتا جا رہا تھا۔ کسی نے اس سے کہا کہ "تم اپنی ماں کے لئے کوئی دعا کیوں نہیں مانگتے؟ تو اس نے جواب دیا "اس لئے کہ وہ ہمارے قبیلہ کی نہیں تھی بلکہ قبیلۂ تمیم کی تھی۔"[1]

دعبل شاعر یمن پر فخر کرتا اور یمنیوں کے فضائل و مناقب گناتا ہے اور کمیت کے جواب دیتا ہے کیونکہ وہ قبیلۂ نزار پر اپنے ایک قصیدہ میں جس کے اشعار چھ سو تک پہنچتے تھے فخر کر چکا تھا۔ اس قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

اَفِیْقِیْ مِنْ مَلَامِکَ یَا ظَعِیْنَا ۔۔۔ کَفَانِی اللَّوْمَ مَرُّ الْاَرْبَعِیْنَا

اے ہودج نشین! اپنی ملامت کو بند کر دے۔ مجھے چالیس سال کا گذر جانا ہی ملامت کے لئے کافی ہے۔

---

[1] الکامل ص ۱۹۸ ج ۱

مسعودی نے دونوں قصیدوں کا کچھ حصہ نقل کیا ہے[1]۔ اور ان کو نقل کرنے کے بعد اس نے کہا ہے کہ کمیت کے اس قصیدہ نے نزاریہ اور یمانیہ میں مخالفت کی آگ بھڑکا دی۔ نزار نے یمن پر فخر کیا۔ اور یمن نے نزار پر فخر کیا۔ اور ہر فریق نے اپنے اپنے مناقب گنوائے۔ لوگ دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ اور عصبیت کا فتنہ دیہات اور شہروں تک پھیل گیا۔ مروان بن محمد جعدی کا حادثہ اس کے ماتحت ظہور پذیر ہوا کہ اس میں یمن کے خلاف اپنی قوم نزار کے لئے تعصب پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں یمن کے لوگ اس سے منحرف ہو گئے۔ اور دعوتِ عباسیہ کے مددگار و معین بن گئے۔

عرب کے اکثر گورنروں میں معاملاتِ حکومت میں بھی یہی عصبیّتِ سیہ کارفرما نظر آتی تھی کہ ہر گورنر کا قبیلہ اسے گھیرے رہتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ جب کوئی آدمی کہیں کا گورنر بن جاتا تھا تو گویا اس کا پورا قبیلہ ہی گورنر بن گیا ہے۔ چنانچہ جب ابنِ ہبیرہ کو عراق کا گورنر بنایا گیا تو فزارہ کو یہ خیال ہو گیا کہ گویا اسے حکومت مل گئی ہے۔ لیکن جب اسے معزول کر کے خالد بن عبداللہ القسری کو گورنر بنایا گیا تو قبیلۂ قسر کی گردنیں تن گئیں اور فزارہ ذلیل ہو گئے۔ چنانچہ فرزدق کہتا ہے ؎

لَعَمْرِیْ لَئِنْ نَابَتْ فَزَارَةَ نَوْبَةٌ　　لَمِنْ حَدَثِ الایامِ تَحْسَبُهَا قَسْرُ

میری جان کی قسم اگر فزارہ کی ایک اور باری آگئی تو قبیلۂ قسر اسے زمانہ کے حادثات میں سے ہی ایک حادثہ تصور کرے گا۔

عباسی عہدِ حکومت میں جب معن بن زائدہ شیبانی یمن کا گورنر بنا تو اس نے یمن کے بہت سے لوگوں کو اپنی قوم ربیعہ وغیرہ (جو بنو نزار میں سے تھے) کے تعصب کی وجہ سے قتل کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد عقبہ بن سالم ـــــ عمان اور بحرین کا والی ـــــ اپنی قوم (جو قحطان میں سے تھی) کے تعصب کی وجہ سے قیسیوں کو قتل کر ڈالتا تھا۔ محض اس مکر کا جواب دینے کے لئے جو معن نے یمن میں کیا تھا[2]۔

اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں۔ لیکن یہاں ہمارے موضوع کے مطابق جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ دوسرا رجحان ہے۔ یعنی عربوں کا تعصب موالی کے خلاف۔

عربوں نے اسلام قبول کیا اور خدائے تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (پ۳ ع۱۹)

---

[1] الکامل ص۱۵۵ ج ۳۔ [2] ملاحظہ ہو مسعودی ص۱۵۵ ج ۲۔

موالی کے خلاف عربوں کا تعصّب

(یقیناً خدا کے نزدیک ایک مکمّل دین صرف اسلام ہی ہے) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (ترجمہ) جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین طلب کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔ ان کا اس پر ایمان تھا کہ اسلام ہی بہترین دین ہے اور جو لوگ ان کے ارد گرد آباد ہیں وہ سب گمراہ ہیں۔ عرب اسلام کے حامی اور دینِ قویم کے حاملین تھے۔ ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ وہ تمام دوسرے لوگوں کو دعوت دیں کہ وہ اپنا پرانا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہ دعوت دے دینے کے بعد ان کا فریضہ جہاد تھا۔ وہ ایران پر فتح مند ہوئے اور انہوں نے ایران کے تخت کو ریزہ ریزہ کر دیا وہ رومیوں پر غالب آگئے اور ان کی فوجوں کو انہوں نے تتر بتر کر دیا۔ اور ان میں سے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئے جن پر رومی اور ایرانی قابض تھے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ دنیا کی سرداری ایران اور روم کا حصّہ تھی جو یکبارگی ان کی طرف منتقل ہو گئی۔ یہ ایرانی جن کی قوّت سے کل تک عرب خوف زدہ تھے آج ان کے تابع فرمان ہو گئے۔ یہ رومی جن کے متعلق عربوں کی یہ آرزو رہا کرتی تھی کہ مصر اور شام کے دروازے ان کے لئے کھلے رہنے دیں تاکہ وہ وہاں تجارت کر سکیں ان کے سامنے شکست کھا کر بھاگ گئے اور سارا ملک ان کے ہاتھوں میں سونپ گئے۔ ان واقعات سے عربوں کے نفس میں ذرا ابھار پیدا ہوا اور بعض لوگوں نے اس میں مبالغہ اور غلو سے کام لیا۔ ان میں یہ شعور بیدار ہونے لگا کہ جو خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے وہ کوئی ممتاز خون ہے اور ایرانی اور رومی خون ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس شعور نے ان کے اندر سیادت اور عظمت کے خیالات پیدا کئے اور وہ دوسری قوموں کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے ایک مالک اپنے غلاموں کی طرف دیکھا کرتا ہے۔ اموی حکومت کی بنیاد اسی نظریہ پر تھی ــــ

واقعہ یہ ہے کہ عربوں نے اپنے نظریہ میں اسلام کی تعلیمات کی پیروی نہیں کی۔ حق تعالےٰ صاف صاف

عصبیّت کے خلاف اسلامی تعلیمات

فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ..... (سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (عربی النسل آدمی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں مگر محض تقویٰ کی وجہ سے) حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حذیفہ کے

آزاد کردہ غلام سالم آج زندہ ہوتے تو میں ان کو اپنی جگہ خلیفہ نامزد کر دیتا۔ میں جب "عرب" کا لفظ بولتا ہوں تو اس سے میری مراد سارے عرب نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہاں بھلے اور نیک لوگوں کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی جو اسلامی تعلیمات پر صحیح معنوں میں عمل پیرا تھی۔ اور جو فضیلت کا پیمانہ دینداری کو قرار دیتے تھے نہ کہ خون کو چنانچہ حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ کسی شریف کو غیر شریف پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت یا ترجیح نہیں دیتے تھے۔ وہ رؤساء اور امراء قبائل سے بنائے رکھنے کی فکر بھی نہیں رکھتے تھے۔ یہ چیزیں ہی تو قوی اسباب و وجوہ میں سے تھیں کہ عربوں نے حضرت علیؓ کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔[1] مدائنی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے کچھ اصحاب ان کے پاس چل کر گئے اور ان سے درخواست کی کہ ان اموال کو تقسیم کر دیں اور تقسیم کرتے ہوئے اشرافِ عرب اور اشرافِ قریش کو موالی اور عجمی لوگوں پر خاص ترجیح دیں اور مشورہ دیا کہ جن لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ ہو ان کو اس مال کے ذریعہ سے اپنی جانب مائل کر لیجئے ۔۔۔۔۔۔ انہوں نے یہ اس لئے کہا تھا کہ امیر معاویہؓ اموال کی تقسیم میں ایسا کچھ کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔ تو حضرت علیؓ نے ان کو جواب دیا۔۔۔ " کیا تم مجھے یہ ہدایت کرنا چاہتے ہو کہ میں ظلم کر کے فتح حاصل کر دوں"[2] ۔۔۔۔۔۔ عام عربوں، اور بنو امیہ کے امراء و حکام میں یہ عربی عصبیت بہت قوی تھی۔ اس بنا پر وہ غیر عربوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ لٹریری کتابیں اور تاریخی حوادث اس کے شواہد سے بھرے پڑے ہیں۔ جریر ایک مرتبہ بنو عنبر کے کسی قبیلہ میں آیا۔ انہوں نے اس کی مہمان نوازی نہیں کی۔ اسے ان کے ہاں کھانا خرید کر کھانا پڑا۔ جریر واپس جاتے ہوئے یہ کہتا گیا ؎

يَا مَالِكَ بِنْ طَرِيفٍ اِنَّ بَيْعَكُمُ ۔۔۔ رِفْدَ الْقِرَىٰ مُفْسِدٌ لِلدِّيْنِ وَالْحَسَبِ
قَالُوْا نَبِيْعُكَهُ بَيْعًا، فَقُلْتُ لَهُمْ ۔۔۔ بِيْعُوْا الْمَوَالِيَ وَاسْتَحْيُوْا مِنَ الْعَرَبِ!

اے مالک بن طریف تمہارا میزبانی کے سامان کو فروخت کرنا دین وحسب میں فساد پیدا کرنے والی چیز ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تجھے میزبانی کی چیزیں قیمتاً دیں گے تو میں نے ان سے کہہ دیا، آزاد کردہ غلاموں، کے ہاتھوں فروخت کرتے رہو مگر عربوں سے تو شرماتے رہا کرو۔

---

[1] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید عن المدائنی صفحہ ۱۸۰ ج ۱۔ [2] شرح نہج البلاغۃ۔ صفحہ ۱۸۲ ج ۱۔

مبرد کا بیان ہے کہ موالی (آزاد کردہ غلاموں) کی اکثریت ان اشعار پر بہت ناراض ہوئی کیونکہ جریر نے ان کی توہین کی تھی اور انہیں کمینہ بتایا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اس کے نزدیک مَوالی کے ساتھ اس قسم کی بدسلوکی کرنا کوئی عیب نہیں تھا۔[1]

مختار نے ابراہیم ابن الاشتر سے جنگِ خازر کے دن کہا تھا ——— یہ وہ دن تھا جس میں عبیداللہ ابن زیاد قتل کیا گیا تھا ——— کہ تیری فوج میں زیادہ تر یہ سرخ لوگ (یعنی موالی) ہیں۔ اگر جنگ نے اپنے دانت گاڑ دیئے تو یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوں گے۔ گھوڑوں پر عربوں کو سوار کرو اور ان سرخ رنگ لوگوں کو ان کے آگے آگے پیادہ پا رکھو۔[2]

اغانی نے بیان کیا ہے کہ کسی آزاد کردہ غلام نے بنو سلیم کے کسی بدوی کی لڑکی سے شادی کا پیغام دیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ محمد بن بشیر فوراً مدینہ منورہ پہنچا جہاں ان دنوں ابراہیم بن ہشام بن اسماعیل گورنر تھا۔ محمد بن بشیر نے گورنر سے اس واقعہ کی شکایت کی۔ گورنر نے اس آزاد کردہ غلام کو بلوایا اور فوراً اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی۔ شوہر کو دو سو کوڑے کی سزا دی۔ اس کے علاوہ اس کا سر، ڈاڑھی اور بھنویں منڈوا کر اس کی تشہیر کرائی۔ اس پر محمد بن بشیر نے کہا ؎

قَضَيْتَ بِسُنَّةٍ وَحَكَمْتَ عَدْلاً
وَلَمْ تَرِثِ الْحُكُوْمَةَ مِنْ بَعِيْدٍ

تو نے سنت کے مطابق اور انصاف کے موافق فیصلہ کیا اور بات یہ ہے کہ تو نے حکومت کہیں دور سے وراثت میں نہیں پائی۔ (یعنی تیرا خاندان تو برابر حکومت ہی کرتا آیا ہے۔)

محمد بن بشیر اسی واقعہ کے متعلق کہتا ہے ؎

وَفِي الْمِائَتَيْنِ لِلْمَوْلٰى نَكَالٌ ۔۔۔ وَفِي سَلْبِ الْحَوَاجِبِ وَالْخُدُوْدِ
إِذَا كَافَأْتَهُمْ بِبَنَاتِ كِسْرٰى ۔۔۔ فَهَلْ يَجِدُ الْمَوَالِي مِنْ مَزِيْدٍ
فَأَيُّ الْحَقِّ أَنْصَفُ لِلْمَوَالِي ۔۔۔ مِنْ اَصْهَارِ الْعَبِيْدِ إِلَى عَبِيْدٍ

دو سو کوڑوں میں ایک غلام کے لئے کافی سزا ہے۔ اور بھویں اور گال صاف کرا دینے میں۔

---

[1] الکامل صفحہ ۲۷۳ ج ۱ ۔ [2] الکامل صفحہ ۲۷۴ ج ۱

جب تو نے ان کو کسریٰ کی لڑکیوں کا ہم پلّہ قرار دے دیا ہے تو یہ غلام اس سے زیادہ اور کیا پا سکتے ہیں۔ غلاموں کے لئے اس سے زیادہ کونسا حق انصاف کے مطابق ہوگا کہ غلاموں کی شادیاں غلاموں ہی سے ہونی چاہیئے۔[1]

حجاج بن یوسف ——— اموی دولت کے ارکان میں سے ایک رکن ——— اس سیاست پر سختی اور مبالغہ کے ساتھ عامل تھا۔ اس نے پچھوں اور نبطیوں کے ہاتھوں تک کو گُدوا دیا تھا۔ چنانچہ اس بنا پر کوئی شاعر کسی غلام کے متعلق کہتا ہے ؎

لَوْكَانَ حَيًّا لَهُ الْحَجَّاجُ مَا سَلِمَتْ
صَحِيحَةً يَدُهُ مِنْ وَسْمِ حَجَّاجٍ!

اس کے لئے اگر آج حجاج زندہ ہوتا تو اس کا ہاتھ حجاج کے نشان لگانے سے محفوظ نہ رہ سکتا۔[2]

حجاج جب واسط میں آیا تو اس نے تمام نبطیوں کو واسط سے شہر بدر کرا دیا اور بصرہ میں اپنے عامل کو ——— ان کا نام حکم بن ایوب تھا ——— لکھا کہ جب تمہارے پاس میرا یہ خط پہنچے تو فوراً جتنے نبطی وہاں آباد ہوں ان کو شہر سے نکال دو۔ کیونکہ یہ لوگ دین اور دنیا دونوں میں فساد ڈالنے والے ہیں۔ حکم بن ایوب نے جواب دیا کہ میں نے تمام نبطیوں کو شہر سے نکال دیا ہے البتہ ان نبطیوں کو شہر میں رہنے دیا ہے جو قرآنِ کریم پڑھتے ہیں اور دین کی سمجھ حاصل کر چکے ہیں۔ تو حجاج اسے دوبارہ تحریر کیا۔ کہ جب میرا یہ خط تمہیں ملے تو جس قدر طبیب وہاں موجود ہوں ان کو طلب کرو اور ان کے بیچ میں تم سو جاؤ تاکہ وہ تمہاری رگوں کا پورا جائزہ لے سکیں۔ اگر انہیں تمہارے جسم میں کوئی نبطی رگ مل جائے تو اسے فوراً کاٹ ڈالو۔[3]

والسلام

حجاج کا یہ فرمان تھا کہ کوفہ میں عربی آدمی کے سوا کوئی شخص امامت نہ کرے۔[4] جب سعید بن جبیرؓ کو گرفتار کیا گیا جنہوں نے ابن الاشعث کے ساتھ مل کر حجاج کے خلاف بغاوت کی تھی۔ تو حجاج نے ان سے کہا تمہیں یاد نہیں کہ جب تم کوفہ میں آئے تھے تو کوفہ میں عربی النسل آدمی کے سوا کوئی دوسرا آدمی امامت نہیں کر سکتا تھا۔

۱؎ اغانی صفحہ ۱۵۰ ج ۱۴۔ ۲؎ شرح نہج البلاغت صفحہ ۱۳۳ ج ۴۔ ۳؎ محاضرات الادباء صفحہ ۲۱۸ ج ۱۔ ۴؎ العقد الفرید صفحہ ۲۰۷ ج ۱۔

مگر میں نے تم کو امام بنایا۔ سعید بن جبیرؓ نے جواب دیا کہ آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ حجاج نے کہا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں نے تمہیں قضاء کا منصب عطا کیا جس پر تمام کوفہ والے جھلا اٹھے تھے کہ قضاء کا منصب عربی النسل آدمی کے سوا کسی کو نہیں دیا جانا چاہیئے۔ تو میں نے ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری کو قاضی بنایا مگر انہیں اس کا پابند کر دیا کہ وہ کوئی فیصلہ تمہارے استصواب کے بغیر نہ کریں۔ سعید بن جبیرؓ نے جواب میں کہا کہ یہ فرمان بھی بجا ہے۔ حجاج نے اس کے بعد کہا، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں نے تمہیں اپنے خاص قصہ گوؤں میں جگہ دی جن میں سب کے سب عرب کے سردار تھے؛ سعید بن جبیرؓ نے اس کا بھی اعتراف کیا۔ تو حجاج نے پوچھا کہ ان تمام باتوں کے باوجود پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے تمہیں میرے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا[1] الخ

اصفہانی کہتے ہیں کہ دولتِ عباسیہ کے قیام تک عربوں کا حال یہ تھا کہ کوئی عرب بازار سے آرہا ہوتا اور اس کے ساتھ کچھ سامان ہوتا اور کوئی راستہ میں آزاد کردہ غلام نظر آجاتا تو سامان کو گھر تک پہنچانے کے لئے وہ اُسے پکار لیتا۔ کسی غلام کی یہ مجال نہیں تھی کہ اس سے انکار کر دیتا۔ ارباب حکومت بھی اس پریکٹس پر کوئی نوٹس نہیں لیتے تھے۔ اگر کسی عربی کو سامنے سے آتا ہوا کوئی غلام مل جاتا جو بدقسمتی سے کسی سواری پر آرہا ہوا اور عربی النسل شخص چاہتا کہ وہ سواری سے اُتر جائے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اگر کسی کو خواہش ہوتی کہ ان کی کسی لڑکی سے شادی کرے تو وہ اس کے آقا کو اس کا پیغام دیتا تھا۔ اس لڑکی کے باپ دادا سے آ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی[2]

جریر بن الخطفی نے ان موالی کی تعریف میں ایک شعر کہہ دیا تھا تو موالی کو اس کی کس قدر بے انداز خوشی ہوئی تھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہ شعر یہ تھا ۔

فَيَجْمَعُنَا وَالْغُرَّ أَوْلَادَ سَادَةٍ !
أَبٌ لَا يُبَالِي بَعْدَهُ مَنْ تَعَذَّرَا

ہمارا اور ان روشن پیشانی والے سرداروں کی اولاد کا باپ تو ایک ہی ہے اسے اس کی کچھ پروا نہیں کہ اس کے بعد ان میں سے کس نے بے وفائی کی راہ اختیار کر لی۔

اس شعر پر موالی اس کے گرد جمع ہو گئے وہ اسے سلام کرتے تھے اور اس سے پوچھتے تھے ابو حزرہ آپ کا مزاج

[1] الکامل صفحہ ۳۹، ج ۱۔ [2] محاضرات الادباء صفحہ ۲۲۰ ج ۱۔

کیسا ہے؛ ان لوگوں نے ایک سو جوڑے انہیں تحفے میں دیئے۔[1]

بلکہ عرب تو ان لوگوں کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو باندیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے —— یہ وہی لوگ تھے جن کی علمی قابلیت اور خصوصیات کو ہم گذشتہ فصل میں بیان کر چکے ہیں —— انہوں نے عربی آدمی کے ایسے بیٹوں کو جو باندی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ھَجِیْنٌ کا خطاب دیا تھا۔ لسان العرب میں ہے کہ ھَجْنَۃٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو نہیں عیب لگاتی ہو۔ ھَجِیْنٌ وہ عربی آدمی ہے جو باندی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو کیونکہ وہ بھی عیب دار ہوتا ہے۔ ابنِ عبدربہ کا بیان ہے کہ " بنوامیہ باندی زادوں کو خلیفہ نہیں بناتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ عرب کے لوگ ان کی اطاعت نہیں کریں گے "۔ اصمعی نے ان کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ " لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بنوامیہ باندی زادوں کو اس لئے حکومت نہیں دیتے کہ وہ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وہ ان کو حکومت دینے میں اس لئے پس و پیش کرتے تھے کہ بنوامیہ کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کی حکومت کا زوال ایک ایسے شخص کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے جو کسی باندی کے پیٹ سے ہوگا "۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس بارہ میں لوگوں کا خیال صحیح تھا اور اصمعی کی توجیہہ صحیح نہیں ہے —— کیونکہ لوگوں کا جو کچھ خیال تھا اس کی تو واقعات، منطق اور بنوامیہ کی سیاست ساری چیزیں تائید کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی گورنر منتخب کرتے تھے تو ان کے عربی ہونے کو سب سے پہلے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ قاضی یا امام کا انتخاب کرتے تھے جو لوگوں کو نماز پڑھا سکے تو اس میں بھی وہ اس کی رعایت رکھتے تھے۔ جیسا کہ اصمعی کا خیال ہے وہ یہ سب کچھ محض کسی نجومی کی پیش گوئی کے ماتحت نہیں کرتے تھے۔ خیال تو کیجئے ایک خالدؓ بن عبداللہ قسری کو عراق کا گورنر بنانے میں بنوامیہ کو کس قدر دشواریاں پیش آئی تھیں اور خود خالد بن عبداللہ کو شعراء کی کس قدر ہجو کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ جس کی وجہ محض اتنی تھی کہ خالد بن عبداللہ کی ماں ایک رومی باندی تھی۔ اصمعی کے خیال کی تردید کے لئے سب سے بڑی دلیل تو یہی ہے کہ بنوامیہ نے عملاً یزید بن الولید، ابراہیم بن الولید اور مروان بن محمد کو خلیفہ بنایا ہے۔ حالانکہ ان سب کی مائیں باندیاں تھیں۔ اگر نجوم پر ان کا عقیدہ ہوتا تو وہ کبھی ان کو خلیفہ نہ بناتے —— ان کو خلیفہ بنانے کی حکمت یہی تھی کہ اموی عہد کے آخری زمانہ میں موالی کی طاقت بڑھ چکی تھی اور وہ ان کی قوت کے سامنے ایک طرح سے جھکنے پر مجبور ہو چکے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو اغانی۔ صفحہ ۶۵۔ ج ۷۔

ایک بدوی سوّار قاضی کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ میرا باپ مرگیا ہے۔ اس نے ایک تو مجھے چھوڑا ہے اور ایک میرے بھائی کو ـــــ یہ کہہ کر اس نے ایک طرف دو لکیریں کھینچیں ـــــ پھر کہا کہ اور ایک ہمارا ہجین بھائی چھوڑا ہے ـــــ پھر اس نے دوسری طرف ایک دوسری لکیر کھینچی ـــــ اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ باپ کا مال ہمارے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور وارث نہیں ہے تو مال کے تین حصے کر لئے جائیں گے۔ اس بدوی نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات کو سمجھے نہیں۔ اس کا ایک بیٹا تو میں ہوں، دوسرا بیٹا میرا بھائی ہے اور تیسرا ایک ہجین ہے۔ قاضی نے سوّار سے کہا کہ ہاں ہاں مال تم تینوں میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔ بدوی نے حیرت سے کہا کہ ہجین کو بھی اتنا ہی مال ملے گا جتنا مجھے اور میرے بھائی کو ملے گا۔ قاضی نے کہا کہ ہاں تینوں کو برابر ملے گا۔ بدوی سخت ناراض ہوا اور کہنے لگا۔ خدا کی قسم معلوم ہوتا ہے کہ صحرائے عرب میں تمہاری خالائیں بہت ہی کم ہیں۔

جاحظ نے بیان کیا ہے کہ میں نے عبید کلابی سے کہا ـــــ عبید کلابی بڑے فصیح و بلیغ مگر محتاج آدمی تھے ـــــ "کہ کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تم ہجین ہوتے اور تمہارے پاس ایک ہزار جریب زمین ہوتی؟" ـــــ عبید کلابی نے جواب دیا کہ میں اس کمینگی کو کسی بڑی سے بڑی چیز کے بدلہ میں بھی قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، کیوں؟ آخر امیر المؤمنین بھی تو باندی ہی کے شکم سے ہیں۔ عبید کلابی نے کہا کہ خدا اسے بھی ذلیل کرے جو ایسے امیر المؤمنین کی اطاعت کرتا ہو۔ رقاشی کہتا ہے ؎

اِنَّ اَوْلَادَ السَّرَارِیْ	کَثُرَتْ یَا رَبِّ فِیْنَا
رَبِّ اَدْخِلْنِیْ بِلَادًا	لَا اَرٰی فِیْھَا ھَجِیْنَا

باندیوں کی اولاد، خدایا! ہم میں بہت ہوگئی ہے۔ خدایا! مجھے تو کسی ایسے ملک میں لے جا جہاں مجھے کسی باندی زادہ کی صورت نظر نہ آئے۔

محمد بن عبداللہ بن حسن بن الحسن بن علی ابن طالبؓ نے ابوجعفر منصور کو طنز کرتے ہوئے اور عار دلاتے ہوئے لکھا تھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں فتح کے بعد اسلام لانے والوں یا ملعونوں کی اولاد نہیں ہوں۔ مجھ میں کسی باندی کا خون نہیں ہے اور نہ مجھے باندیوں نے دودھ پلایا اور نہ گودوں میں کھلایا ہے۔ الخ

۱؎ عیون الاخبار ص۱۲ ج ۴ کہتے ہیں کہ صحرائے عرب میں باندیاں نہیں ہوتیں وہاں آزاد عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ الکامل للمبرد۔

سچی بات یہ ہے کہ اموی حکومت اس حیثیت سے اسلامی حکومت نہیں تھی کہ اس میں تمام آدمیوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جاتا ہو۔ اور اچھی باتوں کا نیک بدلہ ہر ایک کو دیا جاتا ہو خواہ وہ عربی النسل ہو یا کوئی غلام ہو۔ یا سزا ہر مجرم کو دی جاتی ہو۔ چاہے وہ عربی ہو یا عجمی ہو۔ اور حکام ساری رعایا کے یکساں طور پر خادم ہوتے ہوں۔ بلکہ ان کی حکومت عربوں کی حکومت تھی اور حکام محض عربوں کے خادم ہوتے تھے اور ٹیکس غیر عربوں سے وصول کرتے تھے۔ عام طور سے عربوں پر جاہلی رجحانات چھائے ہوئے تھے۔ اسلامی رجحانات کا کہیں نام ونشان مشکل ہی سے ملتا تھا۔ حق اور باطل کے فیصلے یہ دیکھ کر کئے جاتے تھے کہ ان کا صدور کن لوگوں سے ہوا ہے۔ ایک کام حق بن جاتا تھا اگر وہ کسی عربی النسل آدمی سے صادر ہوا ہے یا کسی خاص قبیلہ سے سرزد ہوا ہو اور وہی کام باطل قرار پا جاتا تھا۔ اگر کسی آزاد کردہ غلام سے یا کسی دوسرے قبیلہ کے آدمی سے سرزد ہوا ہو ——— ہم یہاں اس امر سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ ان عجمیوں کی مجموعی حالت عربوں کی حکومت کے ماتحت زیادہ بہتر تھی کیونکہ یہ امور ان لوگوں کے لئے اہم ہو سکتے ہیں جو سیاسی حالات کی تحقیق کریں۔

یہ بات ہم یہاں پھر دہرا دینا چاہتے ہیں ——— جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سنگدلانہ نگاہ سارے عربوں میں عام نہیں تھی کہ عربوں کا ہر فرد اس نظریہ کا شکار ہو۔ بلکہ ہمارے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ عام طور پر دیہاتی لوگوں اور حکام میں یہی رجحان کارفرما تھا۔ لیکن اس کے برعکس عام علمی اور دینی حلقوں میں پورے طور پر مساوات کارفرما تھی۔ عام آدمی کی عزت کی جاتی تھی خواہ وہ غلام ہوتا تھا یا عربی النسل ہوتا تھا۔ چنانچہ سر برآوردہ تابعین میں بہت سے لوگ غلاموں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ ان کی اسی طرح عزت و اکرام کرتے تھے جیسا کہ عربوں کی عزت و احترام کرتے تھے۔ ان میں فرق ہوتا تھا تو محض دین اور علم کی بناء پر ہوتا تھا۔ چنانچہ امام زہری، مسروق بن الاجدع، شریح، سعید بن المسیب اور قتادہ کو تابعین کے سادات میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ سارے کے سارے عربی النسل تھے۔ مگر ان کے ساتھ ہی امام حسن بصری، محمد بن سیرین، سعید بن جبیر، عطاء ابن یسار، ربیعۃ الرائے، ابن جریر بھی تابعین کے سادات میں شمار ہوتے تھے۔ یہ سارے کے سارے غلاموں کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ ——— خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی ——— بغیر کسی فرق و امتیاز کے سب سے ہی برابر علم حاصل کرتے تھے۔ ایک کے حلقۂ درس سے اٹھ کر دوسرے کے حلقۂ درس میں شریک

ہوجاتے تھے۔ حتیٰ کہ تاریخ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ امام حسن بصریؒ خلفائے بنو امیہ پر سخت سے سخت تنقیدیں کرتے تھے۔ یزید بن المہلب کو برا کہہ لیتے تھے۔ وہ علانیہ اس رائے کا اظہار کرتے تھے کہ یزید اوران کے ساتھی اور بنو امیہ گمراہ ہیں جو دین اسلام سے نکل گئے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری آرزو تو یہ ہے کہ زمین نے یزید بن معاویہ اور یزید بن المہلب کو ایک ساتھ نگل لیا ہوتا۔ پھر تاریخ میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ یزید المہلب اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ حسن بصریؒ کے پاس آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی آدمی ارادہ کرلیتا ہے کہ امام حسن بصریؒ کو قتل کرڈالے تو یزید بن مہلب اسے روکتا ہے اور کہتا ہے اپنی تلوار کو نیام میں کرلو۔ بخدا اگر تم نے کچھ بھی کیا تو یہی لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں پلٹ کر خود ہمیں قتل کرڈالیں گے۔[1]

امام حسن بصریؒ کا جب انتقال ہوا تو شہر کے تمام لوگ ان کے جنازہ کے پیچھے چل دیئے حتیٰ کہ مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے کے لئے بھی کوئی آدمی نہیں رہا۔ حجاج بن یوسف نے ہزاروں عربوں اور موالی کو تہ تیغ کیا مگر لوگوں نے اس کا اتنا برا نہیں منایا جیسا کہ محض ایک سعید بن جبیرؒ کے قتل کا برا منایا۔ اس کی وجہ محض ان کا علم اور دینداری تھی۔ حالانکہ وہ موالی ہی میں سے تھے۔

یہ وجہ جو ہم نے بیان کی ہے تاریخ و سیر کے مختلف بیانات و واقعات کی تشریح کردیتی ہے جن سے کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ موالی کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کبھی یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مطالعہ کرنے والے ابتدائی مرحلہ میں یہ سمجھتا ہے کہ ان بیانات اور واقعات میں تضاد ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سیاسی حلقوں، قبائلی اشراف کے حلقوں اور دیہاتی حلقوں میں موالی کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دینی اور علمی حلقوں میں کسی جنس یا کسی خون کے لئے کوئی تعصب موجود نہیں تھا۔ وہاں صرف دین اور علم کے لئے تعصب ہوتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں جہاں ملتی تھیں ان کی پوری پوری قدر کی جاتی تھی۔

———(۰)———

موالی کا عربوں کے خلاف تعصب

اس عربی عصبیت کے مقابلہ میں موالی کی بھی ایک عصبیت تھی۔ خصوصیت کے ساتھ ایرانیوں

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۳۰۸ ج ۴۔

کی عصبیت ۔ انہیں بڑا ہی تعجب تھا کہ عرب کے لوگ ان پر کس طرح غالب آ گئے۔ بعض لوگ تو اس مضمون کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے تھے کہ عربوں کی حکومت تقدیر کا ایک مذاق ہے جو ان کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ برابر اپنی قدیم بزرگی اور پرانی عزت پر عربوں کے خلاف فخر کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ایک عظیم الشان تہذیب کے مالک ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ملکوں کا انتظام کس طرح کیا جاتا ہے۔ جب ان کی حکومت تھی تو انہیں کبھی عربوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن جب عربوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہ ایک دن بھی ان کی مدد کے بغیر حکومت نہیں کر سکے۔

ایرانیوں میں قبائلی عصبیت نہیں تھی۔ وہ اپنے نسب ناموں کو عربوں کی طرح خاص طور پر محفوظ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان میں کبھی تو ملک کے نام پر تعصب ہوتا تھا۔ چنانچہ مثلاً اہلِ خراسان میں اس قسم کا تعصب تھا۔ خراسانیوں کو خراسانیوں کے ساتھ شدید عصبیت ہوتی تھی۔ یا کبھی ان میں قومیت کی عصبیت ہوا کرتی تھی اور یہ چیز فطری تھی۔ کیونکہ ـــــ عرصۂ دراز سے ـــــ وہ خانہ بدوشی کی زندگی کو قطع کر کے مدنیت و تہذیب کے عادی ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنے مکمل اور صحیح معنوں میں ایک قوم بن چکے تھے۔ بنو امیہ کے زمانہ ہی سے وہ عربوں کے خلاف فخر کرنے لگے تھے۔ ـــــ چنانچہ آپ اسماعیل بن یسار کے اشعار تو دیکھ چکے ہیں[1]۔ وہ ہمیشہ ایرانیوں کی عظمت کے گیت گاتا رہتا تھا ـــــ وہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک کے دربار میں پیش ہوا۔ ہشام نے اس سے اشعار سنانے کی خواہش کی تو اس نے اپنا یہ قصیدہ شروع کر دیا جس میں وہ کہتا ہے ؎

إِنِّي وَجَدِّكَ مَا عُودِي بِذِي خَوَرٍ ... عِنْدَ الحِفَاظِ وَلَا حَوْضِي بِمَهْدُومِ
أَصْلِي كَرِيمٌ وَمَجْدِي لَا يُقَاسُ بِهِ ... وَلِي لِسَانٌ كَحَدِّ السَّيْفِ مَسْمُومِ
أَحْمِي بِهِ مَجْدَ أَقْوَامٍ ذَوِي حَسَبٍ ... مِنْ كُلِّ قَرْمٍ بِتَاجِ المُلْكِ مَعْمُومِ
جَحَاجِحٍ سَادَةٍ بُلْجٍ مَرَازِبَةٍ ... جُودٍ عِتَاقٍ مَسَامِيحٍ مَطَاعِيمِ
مَنْ مِثْلُ كِسْرَى وَسَابُورَ الجُنُودِ مَعًا ... وَالهُرْمُزَانِ لِفَخْرٍ أَوْ لِتَعْظِيمِ
أُسْدِ الكَتَائِبِ يَوْمَ الرَّوْعِ إِنْ زَحَفُوا ... وَهُمْ أَذَلُّوا مُلُوكَ التُّرْكِ وَالرُّومِ

[1] فجر الاسلام جلد اول ۔ ص ۱۳۸۔

يَمْشُونَ فِي حَلَقِ الْمَاذِيِّ سَابِغَةٍ مَشْيَ الضَّرَاغِمَةِ الْأُسْدِ اللَّهَامِيمِ
هُنَاكَ إِنْ تَسْأَلِي تُنْبَىْ بِأَنَّ لَنَا جُرْثُومَةً قَهَرَتْ عِزَّ الْجَرَاثِيمِ

تیری عزت کی قسم! حفاظت کرتے وقت میری لکڑی ٹیڑھی نہیں ہے اور نہ ہی میرا حوض منہدم شدہ ہے۔ میرا خاندان شریف ہے اور میری بزرگی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے پاس ایسی زبان ہے جس کی دھار اتنی تیز ہے جتنی زہر ملائی ہوئی تلوار کی دھار ہوا کرتی ہے۔ میں اس تلوار سے ایسی قوموں کی بزرگی اور عظمت جو صاحبانِ حسب ہیں ہر بے ہودہ آدمی سے جس کے سر پر حکومت کا تاج عمامہ کی شکل میں باندھ دیا گیا ہو حفاظت کرتا ہوں۔ اصحابِ مکارم سرداران قوم، روشن رُو اور رؤساء ملک، عمدہ اور اصیل گھوڑوں والے، چشم پوشی کرنے والے اور لوگوں کو کھلانے والے۔ کسریٰ اور شاپور ــــ صاحبِ افواج ــــ اور ہرمزان جیسا آدمی فخر اور تعظیم کے لئے اور کون ہے؛ فوجوں کے شیر، جنگ کے دن جب حملہ کرنے کے لئے نکلیں، جنہوں نے ترک اور روم کے سلاطین کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا پورے جسم کو ڈھانپنے والی زرہیں پہن کر یوں چلتے ہیں جیسے شیر ببر چلا کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر اگر تو پوچھ بیٹھے تو تجھے بتایا جائے گا کہ ایک چھوٹا سا جرثومہ بڑے بڑے جرثوموں کی عزت کو خاک میں ملا دیا کرتا ہے۔

یہ اشعار سن کر ہشام غصہ سے بے تاب ہو گیا اور کہنے لگا۔ کیا تو میرے سامنے فخر کرتا ہے اور مجھے وہ قصیدہ سناتا ہے جس میں تو نے اپنی اور اپنی قوم کے کافروں کی مدح سرائی کر رکھی ہے؛ اسے پانی میں ڈبو دو! چنانچہ ہشام کے حکم کے مطابق اسے ایک حوض میں ڈبو دیا گیا حتیٰ کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔ آخر ہشام نے حکم دیا کہ اسے باہر نکال لو۔ جب اسے نکالا گیا تو وہ بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ ہشام نے اسے اسی وقت شام سے حجاز کی طرف نکال دیا۔[1]

عہدِ اموی میں دونوں عصبیتوں کی تاریخ

اس رجحان کو بنو امیہ نے بڑی سختی سے دبایا۔ اور طاقت اور قوت کو اس کے خلاف استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علانیہ فخر کے بجائے اب خفیہ طور پر سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ یہی دراصل عباسی دعوت کی سازش

---

[1] اغانی صفحہ ۱۲۰ ج ۴۔

کی ابتداء تھی۔

ہم یہاں یہ بات پھر صاف کر دینا چاہتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بھی صاف کر چکے ہیں ـــــ کہ یہ رجحان تمام ایرانیوں میں نہیں تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو دل کی گہرائیوں سے مسلمان ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر وہ حضرات تابعین جن کے نام ہم پہلے بتا چکے ہیں وہ اسے فراموش کئے ہوئے نہیں تھے کہ عربوں کا ان پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ احسان یہ تھا کہ انہیں اسلام کی طرف رہنمائی انہی کی بدولت میسر آئی تھی۔ وہ عرب ہی تھے جنہوں نے انہیں مجوسیت کی گمراہی سے نکال وحدانیت کی ہدایت کی تھی۔ علمی اور دینی حلقوں میں ایرانی لوگ اس عربیت یا ایرانیت پر ایمان نہیں رکھتے تھے جو دوسرے حلقوں میں نظر آتی تھی بلکہ وہ اسلام پر ایمان رکھتے تھے جس نے تمام نوعِ انسانی کو مساوات کا شرف بخشا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ عام لوگوں میں زیادہ تر اور خصوصیت کے ساتھ ایران کے شرفاء عربوں کو ناپسند کرتے تھے۔ بالخصوص حکام اور بنو امیہ کو تو وہ ایک آنکھ پسند نہیں کرتے تھے۔ صاحبِ اغانی کی روایت ہے کہ اسماعیل بن بیسار نے عمر بن یزید بن عبدالمالک سے ملاقات کی خواہش کی۔ اسماعیل کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ کچھ دیر کے بعد ان کو اندر بلایا گیا تو وہ روتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عمرو بن یزید نے کہا، ابو فائد کیا بات ہے کہ تم رو رہے ہو؟ اسماعیل نے کہا، "اور، کیوں نہ روؤں"؟ اپنی اور اپنے باپ کی مردانگی کے باوجود آج میری یہ قدر رہ گئی ہے کہ مجھے آپ سے ملاقات کے لئے دیر تک باہر انتظار کرنا پڑا ہے۔ عمرو بن یزید ان سے معذرت کرتے رہے اور وہ روتے رہے حتیٰ کہ جب عمرو بن یزید نے اس کو انعامات و اکرامات سے ڈھانپ نہیں دیا وہ خاموش نہیں ہوا۔ اسماعیل وہاں سے نکلا تو ایک شخص نے اس پوچھا۔ اسماعیل! تیرا ناس ہو، ذرا مجھے بتا تو سہی، وہ تیری، اور تیرے باپ کی کونسی مردانگی تھی جس کا تو اس شد ومد سے ذکر کر رہا تھا؟ اسماعیل نے کہا کہ "ہماری مردانگی یہی ہے کہ ان عجمی لوگوں سے بغض رکھتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک مروان اور اس کی اولاد کا تعلق ہے تو میری بیوی کو طلاق ہے اگر میری ماں روزانہ تسبیح و تہلیل کے بجائے مروان اور اس کی اولاد پر لعنت نہ بھیجتی ہو۔ اور اگر میرے باپ کو مرتے دم یہ کہا جائے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ لو اور وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے کے بجائے لعن اللہ مروان نہ کہے اور اقرارِ توحید کے بجائے اس کو خدا کے تقرب کا ذریعہ اور اس کا قائم مقام نہ سمجھے[۱]۔"

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۲۵ جلد ۴۔

مَوالی بنو امیہ کی حکومت کو دل کی گہرائیوں سے ناپسند کرتے تھے۔ ان کا زاویۂ نظر یہ تھا کہ بنو امیہ اپنی حکومت میں ہمارے درمیان انصاف سے کام نہیں لیتے۔ ہمیں اس انتظار میں عرصہ گذر گیا کہ حکومت ایک خلیفہ سے دوسرے خلیفہ کی طرف منتقل ہو تو شاید حالات میں کچھ تبدیلی آجائے مگر یہ توقعات بھی سراب سے زیادہ ثابت نہیں ہوئیں ظلم و تعدی کی رفتار برابر یکساں چلی آرہی ہے۔ صرف ایک عمر بن العزیز کو مستثنےٰ کیا جاسکتا ہے مگر وہ اس گھرانے میں شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے امکان میں نہیں کہ ہم عربوں سے حکومت چھین کر ایرانیوں کی طرف منتقل کر سکیں اور ایرانی خود صاحبِ حکومت ہو جائیں کیونکہ حالات اس قسم کے ہو چکے ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ تو عربوں کے ہاتھ ہی میں رہے گا۔ علاوہ ازیں اگر اس قسم کی کوشش کی گئی کہ حکومت عربوں کے ہاتھ سے چھین کر ایرانیوں کے قبضہ میں آجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے عرب اور غیر ایرانی مَوالی ہمارے خلاف متحد ہو جائیں گے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہم ایسی کوشش کریں کہ اقتدارِ اعلیٰ تو عربوں ہی کے ہاتھ میں رہے مگر حکومت بنو اُمیہ کے ہاتھوں سے نکل کر بنو ہاشم کے خاندان میں چلی جائے۔ لوگوں کے دل اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ کیونکہ ہاشمی بھی عرب ہی ہیں اور بنو اُمیہ کی بہ نسبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اس لئے اس دعوت کے مقبول ہو جانے میں جلد کامیابی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ اسے دینی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ آخر میں یہ کہ جب ہم بنو ہاشم کی امداد کریں گے تو وہ یہ محسوس کریں گے کہ حکومت انہیں ہماری مدد سے ملی ہے اور وہ ہماری تدبیر سے ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ اس طرح حکومت بظاہر ان کے ہاتھوں میں ہوگی مگر درحقیقت ہمارے قبضۂ اقتدار میں رہے گی۔ بلند ترین مناصب ہمارے ہاتھوں میں رہیں گے اور حالات مملکت کی تدبیر بھی ہم ہی کریں گے۔ عربوں کے لئے محض خلافت کی شان و شوکت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ رہ جائے گی۔ صورت اور شکل ان کی ہوگی اور جوہر ہمارا ہوگا۔ غالباً یہی وہ اہم ترخیال تھا جو خلافتِ عباسیہ کے ایرانی مؤسسین کے دل میں تھا۔ چنانچہ نصر بن سیار نے نزاری اور یمانی قبائل کو مخاطب کر کے انہیں ان کی اس اندرونی دشمنی سے ان الفاظ میں متنبہ کیا تھا۔

ابلغ ربیعة فی مرو و اخوتھم ۔۔۔ فلیغضبوا قبل ان لا ینفع الغضب

ولینصبوا الحرب ان القوم قد نصبوا ۔۔۔ حربا، یحرق فی حافاتھا الحطب

ما بالکم تلحقون الحرب بینکم ۔۔۔ کان اھل الحجا عن رأیکم عُزُب

وتترکون عدواقد اظلکموا   مماتأسب، لادین ولاحسب
قد مّا یدینون دینا ما سمت بہ   عن الرسول ولم ینزل بہ الکتب
فمن یکن سائلاً عن دینھم   فان دینھموا۔ ان یقتل العرب

مردیں بنو ربیعہ اور ان کے بھائیوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ قبل اس کے کہ ان کی غضب آلودگی بے سود ہو جائے انہیں غصہ سے بھر جانا چاہیئے۔ اور جنگ کی ابتداء کر دینی چاہیئے کیونکہ لوگوں نے جنگ شروع کر دی ہے۔ ایسی جنگ جس کے تمام کناروں پر جنگ کا ایندھن جلایا جا رہا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم آپس ہی میں دست و گریباں ہو رہے ہو اور لڑ جھگڑ رہے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل والے تمہاری عقلوں سے پرے ہٹ گئے ہیں۔ تم نے اس دشمن کو چھوڑ رکھا ہے جو تمہارے سروں پر آ چکا ہے، نہ اس کا کوئی دین ہے نہ حسب ہے۔ وہ قدیم زمانہ سے ایک ایسے دین کی پیروی کرتے آئے ہیں جسے میں نے کسی رسول سے نہیں سنا اور نہ اسے لے کر کوئی کتاب نازل ہوئی۔ اگر کوئی شخص ان کے اہل دین کے بارہ میں سوال کرے تو ان کا دین محض یہ ہے کہ عربوں کو قتل کر دیا جائے [۱]

ابراہیم امام نے ابو مسلم خراسانی کو لکھا تھا کہ " اگر تمہیں یہ قدرت ہو کہ خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ چھوڑو۔ ہر عربی بولنے والے کو قتل کر دو تو ضرور ایسا کر ڈالو۔ ہر وہ لڑکا جو پانچ بالشت کا ہو چکا ہو اور تمہیں اس کے متعلق شبہ ہو تو اسے بھی قتل کر دو۔ مضر پر خصوصیت سے نظر رکھو کیونکہ یہ وہ دشمن ہے جس کا وطن بھی قریب ہی ہے۔ ان کی سرسبزی کا بالکلیہ صفایا کر دو۔ اور زمین پر ان کا کوئی متنفس زندہ نہ رہنے دو [۲]"

عباسی دعوت کا گہوارہ خراسان تھا۔ یہ ایک بڑا ملک تھا اور آج کی بہ نسبت اس کا علاقہ دوگنا تھا۔ اس کے گورنر عرب ہی ہوا کرتے تھے جو کبھی مضری ہوتے اور کبھی یمانی ہوتے تھے۔ ان کا اندازِ حکومت خالصۃً عربی بلکہ قبائلی ہوتا تھا۔ اس چیز نے ابتداءً تو عربوں اور خراسانیوں کے درمیان کینہ اور حسد کی آگ بھڑکائی اور اس کے بعد مضریوں اور یمانیوں میں بھی یہی آگ بھڑک گئی۔ قبیلہ ازد والے اہلِ یمن کی نمائندگی

---

[۱] العقد الفرید صفحہ ۲۵۲ جلد ۲ - [۲] شرح نہج البلاغۃ، صفحہ ۳۰۹ ج ۱

کرتے تھے اور قبیلہ تمیم اور قیس بنو مضر کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہر قبیلہ لیڈر شپ اور غلبہ و اقتدار کے لئے کوشاں تھا۔ اگر یمنی گورنر ہوتا تھا تو وہ اہلِ یمن کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا اور مخالف قبائل کو ذلیل کرتا۔ اگر مضری گورنر ہو جاتا تو وہ اس کے برعکس کرتا۔ خراسانی لوگ ان دونوں کے درمیان میں پس رہے تھے۔ مہلب بن ابی صفرہ اور اس کی اولاد طویل عرصہ تک خراسان کی گورنر رہی۔ یہ ازدی۔ یعنی یمنی تھے۔ حکومت ان کے ہاتھوں میں تھی اور عربی قبائلی طرز کی حکومت کرتے تھے کہ سب سے پہلے مال و جاہ کے ذریعہ سے یمنیوں کی مدد کرتے تھے۔ مدائنی کا بیان ہے کہ یزید بن مہلب کے وکیل نے ایک خربوزوں کی فالیز چالیس ہزار درہم میں فروخت کی جو یزید بن مہلب کی ملکیت تھی۔ اس کی اطلاع جب یزید کو ہوئی تو یزید نے اپنے وکیل سے کہا کہ تو نے ہمیں بقّال بنا دیا ہے۔ کیا قبیلہ ازد کی بوڑھی عورتیں نہیں رہی تھیں کہ اس فالیز کو ان میں تقسیم کر دیتا۔[1]

عمر بن عبدالعزیز، یزید بن مہلب اور اس کے اہلِ خاندان کو ناپسند فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ، "یہ تو جبابرہ ہیں۔ میں ان جیسے لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا۔"[2] قتیبہ ابن مسلم خراسان کا گورنر ہوا جو باہلی ۔۔۔ یعنی مضری ۔۔۔ تھا تو قبائل کے امراء بگڑ گئے کیونکہ اس نے ان کو ذلیل کیا اور ان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا اور بڑی دست درازیاں کی تھیں۔[3] آخر میں نصر بن سیار گورنر ہوا۔ یہ بھی مضری تھا۔ چار سال تک یہ گورنر رہا۔ خراسان میں کوئی حاکم غیر مضری مقرر نہیں کیا جاتا تھا[4] ۔۔۔ ان جیسی باتوں کی وجہ سے یمنی اور مضری قبائل میں تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔

جب عربوں نے محسوس کیا کہ ایرانی ان کے خلاف مجتمع ہو گئے ہیں تو انہوں نے بھی سوچا کہ وہ بھی اپنی طاقت کو یکجا کریں اور اپنی صفوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نصر بن سیار نے عربوں کو خبردار کر دیا تھا کہ ایرانی عربوں کو برباد کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ لہٰذا عربوں کو بھی ایرانیوں کی طرح متحد ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ معاملات اس سے بھی آگے بڑھ چکے تھے۔ ربیعہ، مضر اور یمن کے قبائل نے ایک حد تک اس امر پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ خراسانیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں

---

[1] ابن خلکان۔ صفحہ ۳۹۵ ج ۲۔ [2] ابن خلکان۔ صفحہ ۴۰۴ جلد ۲۔ [3] شرح نہج البلاغت۔ صفحہ ۳۰۹ ج ۱
[4] ابن خلدون۔ صفحہ ۱۲۱۔ جلد ۳۔

اور ابومسلم خراسانی سے جنگ کرنے پر متحد ہو جائیں [1]۔ لیکن ابومسلم خراسانی اور اس کی قوم نے از سرِ نو قبائل عرب کے مابین فتنہ کی آگ بھڑکا دی اور اپنی چالاکی سے وہ اس میں کامیاب رہے۔ ابومسلم نے شیبان خارجی کے نام خطوط لکھنے شروع کئے۔ کبھی ان میں اہلِ یمن کی مذمت ہوتی اور کبھی مضر کی۔ اور جو قاصد مضر والا خط لے کر جاتا اس سے کہہ دیتا کہ وہ یمنیوں کے سامنے جائے تاکہ وہ مضر کی مذمت پڑھ لیں اور جو قاصد یمنیوں والا خط لے کر جاتا اسے ہدایت کر دیتا کہ وہ یہ خط لے کر مضر والوں میں جائے تاکہ وہ یمنیوں کی مذمت پڑھ لیں [2]۔

ابومسلم، علی بن الکرمانی کے پاس آدمی بھیجتا ـــــ جو اہلِ یمن کا لیڈر تھا ـــــ جو اس سے جا کر کہتا تمہیں نصر بن سیار سے صلح کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کل اس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا اور اسے سولی دی تھی۔ مجھے تو کبھی یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ تم نصر بن سیار کے ساتھ ایک مسجد میں اکٹھے نماز بھی پڑھ سکو گے [3]۔ آخر میں مختلف حادثات اور سازشوں کے بعد ابومسلم کو کامیابی ہوگئی اور نصر بن سیار ابومسلم کے پاس گیا اور خواہش ظاہر کی وہ مضر کے ساتھ معاہدہ کر لے۔ ربیعہ اور قحطان نے بھی ابومسلم سے اسی قسم کی خواہش کی۔ آپس میں کچھ روز تک اس بارہ میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ آخر ابومسلم نے کہا کہ دونوں فریقوں کے وفد آنے چاہئیں تاکہ وہ ان سے گفتگو کر کے یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے کس فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔ چنانچہ دونوں وفد آگئے۔ ابومسلم اور اس کے ہم نواؤں نے دونوں وفدوں کی تقریریں سنیں۔ اس کے بعد ابومسلم نے اپنے فیصلہ کا اعلان کیا۔ اعلان یہ تھا۔ ہم علی بن الکرمانی اور اس کے ساتھیوں۔ یعنی قحطان اور ربیعہ کی دوستی کو اختیار کرتے ہیں۔ مضر کا وفد اُٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں اپنی ذلت اور رنج کا احساس تھا [4]۔

اموی سلطنت کے خلاف اہلِ یمن، قبیلہ ربیعہ اور ایرانی مجتمع ہو گئے۔ آگے نقیبوں میں [5] ـــــ یہی وہ کمانڈر اور لیڈر تھے جو اموی سلطنت کے خلاف نبرد آزما تھے ـــــ بیشتر عرب تھے۔ ان میں سے ایک قحطبہ طائی بھی تھا جس کا اپنی قوم میں اتنا اثر اور رسوخ تھا کہ شاید ہی کسی دوسرے عرب شخص کا ہو۔ اس نے اہلِ خراسان میں جو تقریر کی تھی اس میں عربوں کی تحقیر و تذلیل اور ایرانیوں کی عظمت کا اعتراف عجیب زبان میں کیا گیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ایرانیوں سے زیادہ ایرانی تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ "اے اہلِ خراسان! یہ شہر تمہارے

---

[1] ابن خلدون صفحہ ۱۲۱ ج ۳۔ [2] ابن خلدون صفحہ ۱۱۹ ج ۲۔ [3] طبری صفحہ ۹۷ ج ۹۔ [4] یہ قصہ بالتفصیل طبری صفحہ ۹۷ جلد ۹ پر موجود ہے۔ [5] ان نقیبوں کے نام اور ان کے قبائل کے نام طبری صفحہ ۹۸ ج ۹ میں ملیں گے۔

قدیم آباؤ اجداد کے تھے۔ لوگ ان کے عدل و انصاف اور حسنِ سیرت کی وجہ سے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرتے تھے حتّیٰ کہ ان کے رویّہ میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے ظلم کرنا شروع کر دیا۔ خدائے عزّوجل ان پر ناراض ہوا اور اس نے سلطنت ان سے چھین کر ایسی ذلیل ترین قوم کو ان پر مسلط کر دیا جو ان کے نزدیک روئے زمین کی تمام قوموں سے زیادہ ذلیل تھی۔ چنانچہ وہ ان کے شہروں پر غالب آگئے...... اور انہوں نے ان کے رہنے والوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ وہ لوگ ابتداءً عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ عہد کو پورا کرتے تھے، مظلوم کی مدد کرتے تھے۔ لیکن پھر ان کا رویّہ بھی تبدیل ہوگیا اور انہوں نے بھی ظلم و ستم شروع کر دیا۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عترت اور آل کے نیک اور متقی لوگوں پر زندگی تنگ کر دی۔ چنانچہ اب خدا نے تمہیں ان پر مسلط کر دیا ہے تاکہ تمہارے ذریعہ سے خدا ان سے انتقام لے تاکہ انہیں اپنے اعمال کی سخت ترین سزا مل سکے کیونکہ تم اس انتقام میں اپنا بدلہ لینے کا خیال بھی رکھو گے[1]"

لیکن جب ان عربوں نے اپنا کام پورا کر دیا اور بنو اُمیّہ کی سلطنت کا تختہ اُلٹا جا چکا تو ابو مسلم نے ان عربوں کا کام تمام کیا اور چُن چُن کر ان کے لیڈروں کو ختم کر دیا۔

(o)

دولتِ امویہ ختم ہوگئی اور دولتِ عباسیہ قائم ہوگئی۔ ایرانیوں کی تمام آرزوئیں تو نہیں البتہ ان کی کچھ آرزوئیں ضرور پوری ہوگئیں۔ اُن کی پوری آرزو تو یہ تھی کہ اپنے سلاطین اور اپنے گورنروں کے ساتھ ان کی اپنی حکومت قائم ہوتی لیکن اس انقلاب میں جو کچھ انہوں نے حاصل کر لیا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ عباسی خلفاء اس پر قانع تھے کہ ایرانیوں کے کندھوں پہ ان کی سلطنت قائم ہوگئی۔ علماء اور مؤرّخین بھی اس پر خوش تھے۔ داؤد بن علی[2] خطبہ دیتے ہوئے کہتا ہے: "اے اہلِ کوفہ! ہم

عہدِ عباسی میں دونوں عصبیتوں کی تاریخ

ہمیشہ مظلوم رہے اور ہمارا حق ہمیشہ دبایا جاتا رہا۔ حتّیٰ کہ خدا نے ہمارے مددگار یعنی اہلِ خراسان کو کھڑا کر دیا جن کے ذریعہ سے اس نے ہمارے حق کو زندہ کیا اور ہماری حجّت کو واضح کیا۔ ان کے ذریعہ سے خدا نے ہماری حکومت کرائی اور تمہیں وہ کچھ دکھلا دیا جس کے تم منتظر تھے

---

[1] طبری صفحہ ۱۰۶ جلد ۹ - [2] ابو جعفر بن منصور کا چچا۔

اور جس کا تمہیں زبردست اشتیاق تھا۔ خدا نے تم میں بنو ہاشم کا خلیفہ نمودار کر کے تمہارے چہروں کو سفید کر دیا اور تمہیں اہلِ شام کے خلاف فتح و نصرت بخشی"[1] ۔۔۔۔ ابو جعفر منصور کہتا ہے "اے اہلِ خراسان! تم ہماری جماعت، ہمارے مددگار اور ہمارے اہلِ دعوت ہو"[2] ۔۔۔۔ جاحظ کہتا ہے۔" بنو عباس کی حکومت، عجمی خراسانی تھی اور بنو مروان کی حکومت عربی اور بددیانہ تھی"[3]۔ بغداد میں بابِ دولت کو بابِ خراسان کے نام سے پکارا جاتا تھا کیونکہ دولتِ عباسیہ خراسان ہی سے آئی تھی[4] ۔۔۔۔ منصور نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی تھی کہ" میں تجھے اہلِ خراسان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ وہی تمہارے مددگار ہیں اور وہی تمہاری جماعت ہیں جنہوں نے تمہاری حکومت قائم کرنے کے لئے اپنے مالوں اور جانوں کو قربان کر دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں سے تمہاری محبت نکل نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا، جو ان میں بدی پیشہ ہوں ان سے درگذر کرنا اور جو احسانات انہوں نے کئے ہیں ہمیشہ ان کا بدلہ کرتے رہنا۔ اگر کوئی ان میں سے مر جائے تو ان کے بال بچوں کی برابر خبر گیری کرتے رہنا"[5]

اس کے بعد ایرانیوں کا غلبہ اور نفوذ بہت بڑھ گیا حتیٰ کہ مؤرخین نے اس عہد کی اہم خصوصیات میں سے ایرانی نفوذ کی قوت اور عربی نفوذ کی کمزوری کو گنایا ہے۔

لیکن عرب کس حد تک مغلوب ہو گئے تھے؟ کیا دولتِ عباسیہ میں ایرانیوں کا نفوذ اس نہج پر تھا جیسا کہ دولتِ اموریہ میں عربوں کا نفوذ تھا؟ کیا اہلِ عرب اور موالی کا تصادم اس مقام پر ختم ہو گیا تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی واقع نہیں ہوئی۔ عباسی خلفاء ہاشمی عرب تھے ۔۔۔۔ اگرچہ باپ کی طرف سے ہی عرب تھے ۔۔۔۔ وہ اس پر فخر کرتے اور اسے اپنے عظیم مناقب میں سے شمار کرتے تھے۔ انہوں نے اگرچہ ایرانیوں کی محنت اور کوشش کو ضرور یاد رکھا مگر وہ اپنی عربیت کو بھی نہیں بھول سکتے تھے جس دن انہیں یہ احساس ہوا کہ ایرانیوں نے سلطنت میں ان سے مزاحمت شروع کر دی ہے۔ انہوں نے ان کے خلاف فوراً کارروائی کی جیسا کہ منصور نے ابو مسلم کے خلاف، رشید نے برامکہ کے خلاف اور

---

[1] طبری۔ صفحہ ۱۲۷ ج ۹۔ [2] مسعودی۔ صفحہ ۱۹۰ جلد ۲۔ [3] البیان والتبیین۔ صفحہ ۲۰۶ ج ۳۔ [4] مسعودی صفحہ ۱۸۳ جلد ۲۔ [5] طبری۔ صفحہ ۲۸۲ جلد ۹۔

مامون نے فضل بن سہل کے خلاف. عباسی عہد کی ابتداء میں ایرانیوں کو بڑا نفوذ حاصل ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں عربوں کا اثر و نفوذ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بڑے سے بڑے مناصب مثلاً وزارت وغیرہ ایرانیوں کے ہاتھ میں تھے لیکن خلیفہ عربی اور ہاشمی ہوتا تھا۔ ان کی فوجوں کے کمانڈر جہاں ایرانی ہوتے تھے وہاں عرب بھی ہوتے تھے۔ ان کے گورنر جہاں ایرانی تھے، وہاں عرب بھی تھے۔ منصور کی فوج چار حصوں میں منقسم تھی۔ یمنی، مضری، ربیعی اور خراسانی۔ جس دن مامون رشید نے پولیس کی امارت طاہر کے حوالہ کی اسی دن بہت سے ہاشمیوں کو شام کے مختلف علاقوں کا حاکم بھی نامزد کیا[1]۔ منصور نے حرمین کی گورنری محمد بن خالد بن عبداللہ قسری کے حوالہ کی تھی[2]۔ رشید کے زمانہ میں مختلف شہروں کے جو امراء اور حکام تھے ان میں عرب بھی بہت سے تھے۔ اس عہد میں جو عرب اُمراء زیادہ نامور ہوئے ان میں سے سعید بن مسلم باہلی، معنی بن زائدہ شیبانی، ابودُلف عجلی، روح بن حاتم بن قبیصہ، مہلب بن ابی صفرہ اور ثمامہ ابن اشرس اور دوسرے ان جیسے اور بھی بہت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان امور کی موجودگی میں ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ عباسی انقلاب نے ایرانیوں کا پلڑا ضرور جھکا دیا تھا لیکن اس نے عربوں کے دوسرے پلڑے کو بالکل معدوم نہیں کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے عباسی دَور میں عربوں اور ایرانیوں کی مزاحمت برابر قائم رہی۔ اب ہمیں اس مزاحمت کو مختصراً تلاش کرنا چاہیئے۔

اس عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ برابر عربی نسب اور عربی ولاء پر فخر کرنے کا رجحان رکھتے تھے حتیٰ کہ ہم خود ابومسلم خراسانی کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے لئے ایک عربی نسب گھڑ لیتا ہے۔ چنانچہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سلیط بن عبداللہ بن عباس کی نسل میں سے ہے۔ کتاب الاغانی کا بیان ہے کہ اسحٰق موصلی ـــــ اس کو رشید کا کس قدر قرب حاصل تھا وہ سب جانتے ہیں ـــــ کی بحث رشید کی موجودگی میں ابن جامع کے ساتھ ہو گئی۔ دونوں کو تیزی آ گئی۔ ابن جامع نے اسحٰق کو گالی دے دی۔ اسحٰق، خازم بن خزیمہ کے پاس گیا خازم عربی تھا ـــــ اور اسحٰق نے خازم کا ولاء حاصل کیا اور اس کی طرف اپنی نسبت کی جسے خازم نے منظور کر لیا۔ تو اسحٰق نے یہ اشعار کہے ؎

إِذَا كَانَتِ الْأَحْرَارُ أَصْلِي وَمَنْصِبِي ۔۔۔ وَدَافِعُ ضَيْمِي خَازِمٌ وَابْنُ خَازِمٍ

عَطَسْتُ بِأَنْفٍ شَامِخٍ وَتَنَاوَلَتْ ۔۔۔ يَدَايَ الثُّرَيَّا قَاعِدًا غَيْرَ قَائِمٍ

چونکہ شرفاء اور آزاد لوگ میری اصل اور میرا منصب ہیں اور مجھ سے مظالم کو دفع کرنے والے خازم اور

---

[1] طیفور۔ صفحہ ۶۴۔ [2] جہشیاری۔ صفحہ ۱۳۸۔

خازم کے بیٹے ہیں تو (میں اس احساس کے ساتھ) اونچی ناک کے ساتھ چھینکتا ہوں اور میرے ہاتھ بیٹھے بیٹھے بغیر کھڑے ہوئے ثریا کو پا لیتے ہیں۔

اس واقعہ سے وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں ——— ایرانی شرفاء کو بھی ——— کسی عربی کی طرف ولاء کے طور پر منسوب ہونے کی ضرورت پڑتی تھی۔ تاکہ وہ اس کی حمایت میں رہ سکے اور وہ اس کی طرف سے مدافعت کر سکے۔ اغانی ہی نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ علی بن الخلیل کا ایک ایرانی دوست تھا جو ایک مدت تک غائب رہا اور کافی دولت اور شان کے ساتھ واپس آیا۔ جب وہ کوفہ میں واپس آیا تو اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ بنو تمیم قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے تو علی بن الخلیل نے اس کی ہجو میں یہ اشعار کہے۔

يَرُوحُ بِنِسْبَةِ الْمَوْلَى وَيُصْبِحُ يَدَّعِي الْعَرَبَا
فَلَا هٰذَا وَلَا هٰذَا لَكَ يُدْرِكُهُ إِذَا طَلَبَا

غلامی کی نسبت کے ساتھ جاتا ہے اور عرب ہونے کا مدعی بن جاتا ہے۔ جب وہ طلب کرے گا تو اسے یہ ملے گی نہ وہ۔

حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیتا ہے۔

يَشُمُّ الشِّيحَ وَالْقَيْصُو مَ كَيْ يَسْتَوْجِبَ النَّسَبَا
مَصَارَ تَشَبُّهًا بِالْقَوْ مِ جِلْفًا جَانِبًا جَشِبًا
إِذَا ذُكِرَ الْبَرِيرُ بَكَى وَأَبْدَى الشَّوْقَ وَالطَّرَبَا
وَلَيْسَ ضَمِيرُهُ فِي الْقَوْ مِ إِلَّا التِّينَ وَالْعِنَبَا

شیح اور قیصوم (دو درختوں کے نام ہیں) کو سونگھتا پھرتا ہے تاکہ نسب کو حاصل کر سکے۔ ایک قوم کی مشابہت میں وہ کمینہ، ذلیل اور جفا کار بن گیا ہے۔ جب ادرک کے (درخت کے) ابتدائی پھل کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو رونے لگتا ہے اور بڑا اشوق اور بڑی خوشی ظاہر کرتا ہے حالانکہ قوم میں اس کا دل سوائے ترنجبین اور انگور کے کسی اور پھل کو نہیں[1] جانتا۔

ایک دوسرے مقام پر نقل کرتے ہیں کہ والبہ بن الحباب عربی نسب کا مدعی تھا تو اس کے بارہ میں ابو العباہیہ نے

---

[1] پورا قصیدہ اغانی میں موجود ہے ایک دوسرا قصیدہ بھی موجود ہے جس کا مضمون بھی یہی ہے۔ (۱۸/۱۳)

کہا تھا ؎

اَوَالِبَ اَنْتَ فِی الْعَرَبِ　　مِثْلِ الشِّیْصِ فِی الرُّطَبِ

هَلُمَّ اِلَی الْمَوَالِیِ الصَّیْدِ فِی سَعَةٍ وَفِی رُحَبِ

فَاَنْتَ بِنَا لَعَمْرُ اللّٰهِ اَشْبَهُ مِنْكَ بِالْعَرَبِ

اے والبہ! تو عربوں میں ایسا ہی ہے جیسے عمدہ اور تازہ کھجوروں میں ایک ردی کھجور ہوتی ہے۔ غلاموں کو دیکھو، کس وسعت و فراخی میں شکار کھیلتے ہیں۔ خدا کی قسم تو ہمارے لئے عربوں سے زیادہ مشابہ ہے۔[1]

ایسے ہی کسی آدمی نے عربوں کی طرف اپنے کو منسوب کیا تو بشار نے کہا: ؎

اُرْفُقْ بِعَمْرٍو اِذَا حَرَّكْتَ نِسْبَتَهٗ　　فَاِنَّهٗ عَرَبِیٌّ مِنْ قَوَارِیْرِ

عمرو کے نسب کے متعلق جب الٹ پلٹ کرنے لگو تو ذرا نرمی کا برتاؤ کرنا کیونکہ وہ کانچ کا بنا ہوا عربی ہے۔

نیز اسی شخص کے بارہ میں کہتا ہے ؎

اِنَّ عَمْرًا فَاعْرِفُوْهُ　　عَرَبِیٌّ مِنْ زُجَاجِ

مُظْلِمُ النِّسْبَةِ لَا یُعْرَفُ اِلَّا بِالسِّرَاجِ

عمرو کو اچھی طرح پہچان لو وہ کانچ کا بنا ہوا عربی ہے۔ جس کی نسبت تاریک ہو اسے چراغ کی مدد سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔

مخلد موصلی کہتا ہے: ؎

اَنْتَ عِنْدِی عَرَبِیٌّ　　لَیْسَ فِی ذَاكَ كَلَامُ

عَرَبِیٌّ عَرَبِیٌّ　　عَرَبِیٌّ وَالسَّلَامُ!

شَعْرُ اَجْفَانِكَ قَیْصُوْ　　مٌ وَشِیْحٌ وَثُمَامُ

تو میرے نزدیک عربی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ عربی ہے۔ عربی ہے۔ عربی ہے۔ والسلام لیکن

[1] یہ قصیدہ اغانی میں موجود ہے صفحہ ۱۴۹ جلد ۱۶۔

تیری پلکوں کے بال قیصوم، شیح اور جھاؤ کے پتّے معلوم ہوتے ہیں۔[۱]

اگر اس عہد میں عرب اس قدر ذلیل ہو چکے تھے اور ان کی شان اتنی حقیر ہو چکی تھی جیسا کہ مؤرّخین کے بیانات سے معلوم ہوتی ہے تو کیا یہ ——— عربوں کی طرف منسوب ہونے اور اس طرح عزّت حاصل کرنے کا ——— رجحان اس حد تک پہنچ سکتا تھا؟

البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دور میں اس عربیت کے ساتھ ساتھ اس کے مقابلہ میں ایرانیت کا ایک دوسرا رجحان بھی موجود تھا اور جو اب تک نہایت ہی پست آواز میں اسماعیل بن یسار جیسے لوگوں کی زبان سے بنو امیّہ کے عہد میں سنائی دیتی تھی اب وہ نہایت سخت، قوی اور آزادانہ سنائی دینے لگی تھی۔

چنانچہ بشار جو اس رجحان کا نمائندہ ہے ایک مرتبہ خراسان پر فخر کرتا ہوا کہتا ہے:؎

وَهجَانِي مَعْشَرٌ كُلُّهُمْ ‌ ‌ ‌ حُمُقٌ، وَامَ لَهُمْ ذَاكَ الْحُمُقُ

لَيْسَ مِنْ جُرْمٍ وَلٰكِنْ غَاظَهُمْ ‌ ‌ ‌ شَرَفِي الْعَارِضُ قَدْ سَدَّ الْاُفُقْ

مِنْ خُرَاسَانَ، وَبَيْتِي فِي الذُّرىٰ ‌ ‌ ‌ وَلَدَى الْمَسْعَاةِ فَرْعِي قَدْ سَمَقْ!

ایک جماعت نے میری مذمّت کی ہے مگر وہ سب کے سب بیوقوف ہیں جن کی حماقت ہمیشہ بدستور رہتی ہے۔ میرا کوئی جرم نہیں مگر میرے چھا جانے والے شرف نے جس نے تمام اُفق کو پُر کر دیا ہے انہیں جلا دیا ہے۔ میرا وہ شرف خراسان سے متعلق ہے اور میرا گھرانا بہت بلند مرتبہ ہے۔ میرا خاندان ستاروں تک بلندی میں جا پہنچا ہے۔

نیز ایک مرتبہ وہ عجم پر فخر کرتا ہوا کہتا ہے:؎

وَنُبِّئْتُ قَوْمًا بِهِمْ جِنَّةٌ ‌ ‌ ‌ يَقُولُونَ مَنْ ذَا، وَكُنْتُ الْعَلَمْ!

اَلَا اَيُّهَا السَّائِلِي جَاهِدًا ‌ ‌ ‌ لِيَعْرِفَنِي، اَنَا اَنْفُ الْكَرَمْ!

نَمَتْ فِي الْكِرَامِ بَنِي عَامِرٍ ‌ ‌ ‌ فُرُوعِي وَاَصْلِي قُرَيْشُ الْعَجَمْ!

مجھے کچھ لوگوں کے متعلق بتایا گیا ہے جنہیں جنون ہو گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں ——— یہ کون ہے؟ اور میں ہی ان کا نشانہ ہوتا ہوں۔ میرے متعلق کوشش کر کے پوچھنے والے کو مجھے پہچان لینا چاہیئے

---

[۱] محاضرات الادبا، صفحہ ۲۲۲ جلد ۱ و مابعد۔

کہ میں شرافت کی ناک ہوں۔ میرے خاندان نے شرفاء یعنی بنو عامر میں نشوونما پائی ہے اور میری
اصل و بنیاد عجم کے قریش ہیں۔

وہ یہ سب کچھ خلیفہ مہدی کے سامنے کہتا ہے اور وہ اسے کوئی سرزنش نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہشام نے ابن یسار کو سرزنش کی تھی بلکہ اس سے مزید پوچھتا ہے کہ تم عجم کے کس خاندان سے ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ میں عجم کے اس خاندان سے ہوں جس میں سب سے زیادہ شہسوار ہیں اور جو بہادروں پر بڑا ہی بھاری ہے، میں اہلِ طخارستان میں سے ہوں بلکہ وہ تو ولاء کی نسبت سے بھی انکار کرتا تھا اور کہتا تھا ؎

أَصْبَحْتُ مَوْلَىٰ ذِي الْجَلَالِ وَبَعْضُهُمْ مَوْلَى الْعُرَيْبِ! فَخُذْ بِفَضْلِكَ فَافْخَرِ
مَوْلَاكَ أَكْرَمُ مِنْ تَمِيمٍ كُلِّهَا أَهْلِ الْفِعَالِ وَمِنْ قُرَيْشِ الْمَشْعَرِ
فَارْجِعْ إِلَىٰ مَوْلَاكَ غَيْرَ مُدَافِعٍ سُبْحَانَ مَوْلَاكَ الْأَجَلِّ الْأَكْبَرِ

میں خدائے ذوالجلال کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام) ہوں جبکہ بعض لوگ عربچیوں کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ تو اپنی اس فضیلت کو لے اور اس پر فخر کر۔ تیرا آقا سارے بنو تمیم ــــ اہل کردار ــــ سے اور مشعر الحرام کے قریش سے زیادہ شریف ہے تو اپنے آقا کی طرف رجوع کر جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تیرا آقا پاک ہے جو سب سے بزرگ تر اور سب سے بڑا ہے۔

بلکہ وہ غلاموں کو دعوت دیتا تھا کہ عربوں کا ولاء ان کو واپس کر دیں چنانچہ اغانی کا بیان ہے کہ بنو زید شریف میں سے کسی آدمی نے بشار سے کہا۔ "اے بشار! تو نے ہمارے غلاموں کو بگاڑ دیا ہے تو انہیں اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ ہمارا ولاء چھوڑ دیں اور دوبارہ اپنے اصلی خاندانوں کی طرف اپنی نسبت کریں اور عربی ولاء کو خیرباد کہہ دیں۔ حالانکہ نہ تیرا خاندان کچھ زیادہ صاف ہے اور نہ تو معروف الاصل ہے"! بشار نے جواب دیا۔ بخدا میرا خاندان سونے سے زیادہ خالص ہے اور میرا نسب ابرار کے اعمال سے زیادہ پاکیزہ تر ہے۔ زمین میں کون سا کتا ہوگا جو اپنا نسب چھوڑ کر تیرا نسب اختیار کرے گا[1]! کسی عربی نے اس سے کہہ دیا کہ غلاموں کو شعر سے کیا نسبت؟ تو بشار نے عربوں کی ہجو میں کہا ؎

أَحِينَ كُسِيتَ بَعْدَ الْعُرْيِ خَزًّا وَنَادَمْتَ الْكِرَامَ عَلَى الْعُقَارِ

---

[1] الاغانی۔ صفحہ ۵۱ جلد ۳۔

تُفَاخِرُ يَا ابنَ رَاعِيَةٍ وَرَاعٍ ! بَنِي الأَحْرَارِ، حَسْبُكَ مِنْ خَسَارِ
تَرِيغُ بِخُطْبَةٍ كَسْرَ المَوَالِي وَيُنْسِيكَ المَكَارِمَ صَيْدُ فَارِ
وَكُنْتَ إِذَا ظَمِئْتَ إِلَى تُرَاحٍ شَرِكْتَ الكَلْبَ فِي وَلْغِ الإِطَارِ
وَتَغْدُو لِلقَنَانِذِ تَدَّرِيهَا وَلَمْ تَعْقِلْ بِدُرَّاجِ الدِّيَارِ
وَتَتَّشِحُ الشِّمَالُ لِلَابِسِيهَا وَتَرْعَى الضَّانَ بِالبَلَدِ القِفَارِ

کیا اب جبکہ عریانی کے بعد تجھے خز کا لباس پہنا دیا گیا ہے اور شراب کی محفل میں تو شریف لوگوں کے ساتھ بیٹھنے لگا ہے۔ اے چرواہوں اور چرواہنیوں کی اولاد تو شرفاء کی اولاد پر فخر کرتا ہے۔ کتنے بڑے خسارہ کی بات ہے۔ تو موالی کی طاقت کو ایک خطبہ سے توڑ دینا چاہتا ہے حالانکہ چوہوں کے شکار کا مشغلہ تجھے شرافت کے کاموں کی کب مہلت دیتا تھا۔ جب تجھے پانی کی پیاس لگتی تھی تو گھر کے سامنے کے جوہڑ سے کتوں کے ساتھ ہی تو پانی پی لیتا تھا۔ تو عود بلاؤ کے شکار میں پینترے بدلا کرتا تھا۔ تجھے شہری تیتروں کا شعور بھی نہیں تھا۔ شمالی ہوائیں ہی اپنے پہننے والوں کا لباس بن جایا کرتی تھیں (کپڑوں کے بجائے) اور تو تو بنجر میدانوں میں بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔

بشار کے اس طرح اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب دشمنی کے رجحان کا یہ نمائندہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے اور اس جیسے لوگوں کو —— عربوں کی ہجو کرنے کی —— کس قدر چھوٹی مل گئی تھی۔ بنوامیہ کے عہد میں وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں لوگ بکثرت کسریٰ کی طرف بھی نسبتیں کرنے لگے تھے حتیٰ کہ جحظہ نے کہا تھا ؎

وَأَهْلُ القُرَى كُلُّهُمْ يَنْتَمُوْ نَ لِكِسْرَى ادِّعَاءً! فَأَيْنَ النَّبِيطُ؟

شہری باشندے سب کے سب دعوے کر کے کسریٰ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ ان نبطیوں کی کیا حیثیت ہے۔

—— (۰) ——

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں ایرانیوں کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا تھا اور دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

اُموی عہد میں شاذ و نادر موالی کو کوئی بڑی خدمت سونپی جاتی تھی جس پر لوگ ناگواری محسوس کرتے تھے۔ امویوں نے مثلاً رجاء بن حیوہ سے جو کندہ کے غلام تھے ـــــ کام لیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایک غلام کو گورنر بنا دیا تھا۔ اسے وادیٔ القریٰ کا گورنر بنایا گیا۔ مگر لوگ اس پر ناراض ہو گئے تھے۔ لیکن جو چیز اموی عہد میں شاذ و نادر ہوا کرتی تھی وہ عباسی عہد میں روزانہ کی پریکٹس ہو گئی تھی۔ منصور نے بکثرت غلاموں کو بڑی بڑی خدمات پر مامور کیا۔ سیوطی کہتے ہیں کہ "منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے سب سے پہلے موالی کو بڑی خدمات پر مامور کیا اور عربوں پر انہیں ترجیح دی۔ منصور کے بعد یہ بات بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ عربوں کی ریاست اور قیادت ہی ختم ہو گئی"[1]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ منصور سے پہلے خلفائے بنو امیہ نے کسی غلام کو کوئی ذمہ دارانہ خدمت کبھی سونپی ہی نہیں تھی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ منصور نے غلاموں کو ذمہ دارانہ خدمات حوالہ کرنا اپنی حکومت کی پالیسی ہی بنا لیا تھا اور انہیں عربوں کے سروں پر سوار کر دیا تھا۔ اس معنی میں یہ امر سب سے پہلے منصور ہی سے سرزد ہوا۔ جہشیاری نے اپنی کتاب تاریخ الوزراء میں بیان کیا ہے جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ منصور کے زیادہ تر امراء اور والی بھی غلام تھے[2]۔ مسعودی منصور کے بارہ میں کہتا ہے کہ

"وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے اپنے موالی اور غلاموں کو گورنر بنایا اور ان سے اپنی مہمات میں کام لیا اور عربوں پر انہیں ترجیح دی۔ منصور کے بعد دوسرے خلفاء نے ـــــ جو اس کی اولاد ہی میں سے تھے ـــــ یہی اپنا طریقہ بنا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کا تنزل شروع ہو گیا اور وہ برباد ہو گئے"[3]

طبری بیان کرتے ہیں کہ منصور کا ایک خادم تھا جو زرد رُو مائل بہ گندمی رنگ تھا۔ بڑا ماہر تھا اور قابلِ اعتماد تھا۔ منصور نے ایک دن اس سے دریافت کیا "تم کس جنس سے ہو؟" اس نے کہا "اے امیر المؤمنین میں عربی الاصل ہوں۔ منصور نے پوچھا کہ "عربوں کے کس خاندان سے ہو؟" اس نے بتایا کہ میں قبیلۂ خولان سے ہوں۔ مجھے یمن سے گرفتار کیا گیا۔ مجھے ہمارے ایک دشمن نے لے لیا اور خصی کرا دیا۔ پھر مجھے غلام بنا لیا گیا۔ کچھ دنوں تک میں بنو اُمیہ کے کچھ لوگوں کے پاس بھی رہا۔ اس کے بعد آپ کے پاس آگیا۔" منصور نے کہا "تم بہت اچھے غلام ہو۔ لیکن میرے محل میں کوئی عربی شخص داخل نہیں

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۰۵۔ [2] ملاحظہ ہو جہشیاری صفحہ ۱۳۹-۱۵۲-۱۵۵-۱۵۷۔ [3] مسعودی ص ۲۰۴۔ جلد ۲۔

ہو سکتا جو میرے حرم کی خدمت بھی کرے۔ جاؤ۔ خدا تمہیں عافیت کے ساتھ رکھے۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو[۱]۔ اغانی کا بیان ہے کہ ابو نخیلہ، ابوجعفر منصور کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ اس نے ملاقات کی اجازت چاہی مگر وہ تو اندر نہیں پہنچ سکے۔ البتہ خراسانی لوگ برابر آتے جاتے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک بوڑھا جاہل اعرابی کھڑا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے انہیں پہچان لیا اور ان سے دریافت کیا۔ ابو نخیلہ آپ کیسے ہیں؟ تو ابو نخیلہ نے یہ شعر پڑھے ؎

أَصْبَحْتُ لَا یَمْلِكُ بَعْضِی بَعْضَا   تَشْكُو الْعُرُوقُ الْأَبِضَاتُ أَبْضَا

كَمَا تَشَكَّى الْأَرْحِجُ الْقُرْضَا   كَأَنَّمَا كَانَ شَبَابِی قَرْضَا!

میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میرے جسم کے بعض اعضاء دوسرے اعضاء کے قابو میں نہیں رہے۔ خشک رگیں تھکن محسوس کرتی ہیں جیساکہ گویا کہ میری جوانی کوئی قرض تھی (جو قرض خواہ نے لے لی)۔

اسی آدمی نے اس سے پوچھا۔ "اس حکومت میں تم اپنی حالت کو کیسا پاتے ہو؟" ابو نخیلہ نے کہا ؎

أَكْثَرُ خَلْقِ اللهِ مَنْ لَا یُدْرَى   مِنْ أَیِّ خَلْقِ اللهِ حِینَ یُلْقَى؛

وَحُلَّةٍ تُنْشَرُ ثُمَّ تُطْوَى   وَطَیْلَسَانُ یُشْتَرَى فَیُغْلَى؛

لِعَبْدِ عَبْدٍ أَوْ لِمَوْلَى مَوْلَى   یَا وَیْحَ بَیْتِ الْمَالِ مَاذَا یَلْقَى؛

خدا کی بہت سی مخلوق ایسی ہے کہ جب ان سے ملا جاتا ہے تو ان کے متعلق پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی کونسی مخلوق میں سے ہیں خلعت شاہی کے جوڑے پھیلائے جاتے ہیں، لپیٹے جاتے ہیں، چادریں خریدی جاتی ہیں اور گراں قیمت خریدی جاتی ہیں مگر کس کے لئے؟ —— غلام کے غلام یا آزاد کردہ غلام کے لئے —— ہائے افسوس اے بیت المال (خزانہ حکومت) تجھے کیا دن دیکھنے پڑے ہیں[۲]

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منصور نے بعض عربوں کو بھی ذمہ دارانہ خدمات پر مامور کیا۔ چنانچہ مسلم بن قتیبہ باہلی کو اس نے بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا اگرچہ اس کے ساتھ بصرہ کے علاقہ اور اُبلّہ کا گورنر ایک

---

۱ طبری ص ۳۱۶ جلد ۹۔ ۲ اغانی۔ ص ۱۴۸۔ جلد ۱۸۔

غلام کو بنایا تھا[1]۔ اس سے پہلے آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ابوجعفر کی فوج عربوں اور عجمیوں دونوں پر مشتمل تھی۔

جب رشید کا زمانہ آیا تو برامکہ کی فضیلت کی وجہ سے ایرانیوں کا اثر و نفوذ اور بھی بڑھ گیا۔ برامکہ ہی حکومت اور حالاتِ حکومت میں مختارِ مطلق بنے ہوئے تھے۔ ان کے اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ ان کی جنس کا اثر و نفوذ بھی بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک مضبوط پالیسی بنائی تھی۔ چنانچہ اس پالیسی کا ایک جزو وہ تھا جو طبری نے بیان کیا ہے کہ "فضل بن یحییٰ برمکی نے خراسان میں ایرانیوں کی ایک فوج بنائی اور اس فوج کا نام "عباسیہ" رکھا۔ ان کا ولاء عباسیوں کے لئے تھا۔ ان کی تعداد پانچ لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ اس فوج میں سے بیس ہزار جوان خود بغداد میں آگئے تھے۔ بغداد میں ان کو "کرنبیتہ" کہتے تھے۔ باقی لوگ خراسان ہی میں رہے۔ وہاں ان کا نام عباسیہ تھا اور ان کے دفاتر بھی وہیں تھے[2]۔ اسی طرح ان کا اثر و نفوذ مامون کے عہد میں اور بھی بڑھتا گیا کیونکہ اس واقعہ میں ایرانیوں کو دوسری فتح حاصل ہوئی تھی۔ پہلی فتح وہ تھی جو

---

[1] عیون الاخبار صفحہ ۲۹۰ جلد ۱۔ [2] طبری صفحہ ۶۲ جلد ۱۰۔ اس اثر و نفوذ کے اضافہ میں ولاء کی ایک نئی قسم نے اور بھی مدد پہنچائی جو اسی عہد میں ملتا ہے۔ بنوامیہ کے عہد میں اس ولاء کا نام و نشان نہیں تھا ورنہ اس سے پہلے یہ ولاء کہیں نظر آتا ہے۔ ولاء کی یہ قسم ولاء کی ان تمام انواع سے الگ تھی جن کو ہم فجر الاسلام میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس نئے ولاء کا نام ابنِ خلدون نے "ولاء الاصطناع" رکھا ہے۔ (ابنِ خلدون صفحہ ۱۱۴ ج ۱) اس کی صورت یہ ہوتی تھی خلیفہ ایرانیوں کی کسی قوم کو مخصوص کر لیتا تھا یا ترکوں کی کسی قوم کو اور انہیں یہ اجازت دیتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خود خلیفہ یا حکومت کی طرف منسوب کر لیں۔ ان سے وہ مہمات ملکی اور جنگ وغیرہ میں کام لیتا تھا۔ ان کو تنخواہیں دی جاتی تھیں اور یہ خلیفہ کے یا حکومت کے موالی کہلاتے تھے۔ جیسا کہ ابتدائی خلفائے عباسیہ نے بنوبرمک اور بنوبختت (ایرانیوں) کے ساتھ کیا تھا۔ ان کو دولتِ عباسیہ کے موالی کہا جاتا تھا۔ یا جیسا کہ معتصم نے ترکوں کے ساتھ کیا تھا۔ یہ چیز ہمیں بنوامیہ کی سلطنت میں نہیں ملتی۔ اس معنیٰ میں بنوامیہ کی حکومت کے موالی نہیں ہوتے تھے ــــ جہاں تک مجھے معلوم ہے ــــ اس قسم کے ولاء نے اوّلاً ایرانیوں کا اثر و نفوذ بڑھایا اور اس کے بعد ترکوں کا۔ کیونکہ ان کی تعداد اور قوت دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت انہی کی حکومت ہے اور رعیت پر انہیں ایک قسم کا تسلط حاصل ہے جو ان کے خلیفہ کے توسط سے ان کو حاصل ہوا ہے۔ طبری کے بیان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کے موالی جو عباسیوں کے موالی کہلاتے تھے ایک زمانہ میں پانچ لاکھ تھے یہ موالی ان غلاموں سے الگ تھے جو قید کر کے غلام بنا لئے جاتے تھے۔ ملاحظہ کیجئے کہ عرب بیچارے کس طرح ان غلاموں کے بوجھ کے نیچے دب چکے تھے۔

عباسیوں اور امویوں کی جنگ میں انہیں پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ کیونکہ ایرانی ہی زیادہ تر عباسیوں کے ہوا خواہ تھے۔ اس دوسری جنگ میں جو مامون اور امین کے درمیان ہوئی تھی ایرانیوں کو دوسری فتح نصیب ہوئی۔ کیونکہ زیادہ تر ایرانیوں نے مامون الرشید کا ساتھ دیا تھا اور ان میں مامون کے لئے تعصب تھا جبکہ زیادہ تر عربوں نے امین کا ساتھ دیا تھا۔ لہٰذا مامون کی فتح دراصل ایرانیوں کی فتح و نصرت شمار ہوئی۔ طیفور اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ ایرانی لوگ ترکش اور کمانیں لئے ہوئے مامون کے سامنے سے ہو کر گذر جاتے تھے۔ طبریؒ کا بیان ہے کہ شام میں ایک آدمی بار بار مامون کے پاس آیا اور کہا اے امیر المومنین خراسان کے ایرانی تو آپ نے دیکھے ہیں ذرا شام کے عربوں کو بھی ملاحظہ فرما لیجیئے۔ مامون نے کہا۔ شامی بھائی! تو نے بڑے اصرار سے کام لیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے قبیلۂ قیس کے کسی آدمی کو گھوڑے کی پشت سے نہیں اتارا مگر محض اس وقت جب میں نے دیکھا کہ میرے خزانہ میں ایک درہم بھی باقی نہیں رہا۔ رہ گیا یمن تو نہ مجھے کبھی اس سے محبت ہوئی اور نہ یمن والوں کو مجھ سے۔ رہ گیا قضاعہ تو اس کے سردار تو سفیانی کے خروج کے منتظر ہیں۔ تو بھی اس کے مددگاروں ہی میں سے ہوگا۔ رہ گیا ربیعہ تو وہ تو اس وقت سے خدا سے ناراض ہے جب سے اس نے اپنا نبی مضر کے قبیلہ سے مبعوث کر دیا تھا۔ جب بھی دو آدمی نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک ناراض ہی نکلتا ہے۔ خدا تیرا ستیاناس کرے اب دور ہٹ جا۔[2]

جب معتصم کا زمانہ آیا تو اس نے ایرانیوں کی جگہ ترکوں کو دے دی اور ترکوں کے ذریعہ سے اسی نے عربوں اور ایرانیوں دونوں کا بندوبست کر دیا۔ یہ چیز عباسی حکومت کے دورِ ثانی پر گفتگو کرتے ہوئے واضح ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

———— (٠) ————

مَوالی اور خصوصاً ایرانیوں کے اثر و نفوذ کے چند مظاہر تھے۔

(۱) خلفاء کے محلات مَوالی اور غلاموں سے بھر گئے تھے۔ جن سے مختلف کاموں میں خدمت لی جاتی تھی۔ حرم خاص کے محلات خصی شدہ غلاموں سے بھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے یہ رسم بیزنطینیوں سے لی۔ عربوں میں یہ طریقہ عام طور سے رائج نہیں تھا۔

(۲) بڑی بڑی خدمات مثلاً وزارت وغیرہ ایرانیوں سے مخصوص ہو گئی تھیں۔

ط۱ تاریخِ بغداد طیفور صفحہ ۱۵۔ ط۲ طبری صفحہ ۲۹۶ جلد ۱۰

(۳) ایرانی عادات و رسوم کا مسلمانوں میں نفوذ مثلاً نوروز کا دن منانا۔ اور سر پر ٹوپی پہننا۔

(۴) ایرانی تہذیب کا پھیل جانا۔ اس موضوع پر ہم ایک الگ باب میں گفتگو کریں گے۔

(o)

مقابلہ کی صورتیں

غلاموں کی اس قوت اور اثر و نفوذ کے سامنے عربوں نے ہتھیار نہیں ڈال دیئے بلکہ انہوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ کبھی شدت اختیار کر لیتا تھا اور کبھی خفیف ہو جاتا تھا۔ اس مقابلہ کی صورتیں مختلف تھیں۔ مثلاً بعض اوقات یہ مقابلہ خلیفہ کے کان بھرنے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ چنانچہ عرب غلاموں کے خلاف سازشیں کرتے اور غلام عربوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً خلفاء اپنے وزیروں پر گرفت کرتے رہتے اور انہیں سزائیں دیتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ کسی شاعر کو کہہ دینا پڑا سے

اِنَّ الوَزِیرَ وَزِیرُ آلِ محمّد أودی، فمن یشنأک کان وزیرًا

بلاشبہ وزیر تو آلِ محمد کے وزیر ہیں جو ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا جو تجھے عیب لگائے گا وزیر ہو جائے گا۔

وزیروں کی پوری تاریخ درحقیقت سزاؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ ان سزاؤں کی وجہ زیادہ تر خلفاء کا ــــ ان سازشوں کے ماتحت ــــ یہ احساس ہی ہوتا ہو کہ ایرانیوں کا نفوذ و اثر بڑھتا اور ان کا تسلط طاقت پکڑتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اکثر معاملات میں خلیفہ سے استصواب کئے بغیر خود ہی فیصلے صادر کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ "ہارون رشید نے برامکہ پر اس لئے گرفت کی تھی کہ وہ حکومت پر بُری طرح چھا گئے تھے اور بیت المال میں جو کچھ اموال وصول ہوتے تھے انہیں وہ خلیفہ سے چھپاتے تھے۔ ہارون رشید اگر تھوڑا سا مال طلب کرتا تھا تو وہ بھی اُسے نہیں ملتا تھا۔ یہ لوگ اس کی حکومت پر غالب آگئے اور حکومت میں اس کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔ بلکہ امورِ سلطنت میں اس کا کوئی تصرّف ہی باقی نہیں رہا تھا۔ خود ان کے آثار کی عظمت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی شہرت دُور دُور تک پہنچتی جا رہی تھی۔ حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدے ان رؤسا سے پُر ہو چکے تھے جو خود ان برامکہ کی اولاد یا ان کے احسان مندوں میں سے تھے کسی دوسرے شخص کو کوئی عہدہ آسانی سے میسّر نہیں آتا تھا۔ وزارت، کتابت، قیادت، حجابت، سیف اور قلم غرضیکہ تمام ذمہ داریاں برامکہ اور ان کے وابستگان ہی میں بٹ گئی تھیں"۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ "برامکہ کی وہ مدحیں کی گئی ہیں جو خود ان کے خلفاء کی نہیں کی گئیں۔ وہ اپنے ہوا خواہوں کو بڑے بڑے انعامات، اور

بخششوں سے نوازتے رہتے تھے۔ تمام آبادیاں اور تمام زمینداریوں پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی اس روش نے خلیفہ کے خصوصی رازداروں تک کو آزردہ اور خواص کو حسد کا شکار کر دیا ...... چنانچہ منافست اور حسد کی گرم بازاری ہوئی اور چغلیوں کے بچھو ان کے بستروں کے نیچے پھیل گئے۔ حتیٰ کہ بنو قحطبہ ——— خود جعفر کے ماموں ——— ان کے خلاف سب سے بڑے چغلخور ثابت ہوئے۔[1]

مامون الرشید کے روبرو نعیم بن حازم عربی فضل بن سہل ایرانی سے دوبدو ہوتا ہے جبکہ فضل اس رائے کی خوبیاں بیان کرتا ہے کہ خلافت کو علویوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ تو نعیم فضل سے کہتا ہے۔ "تو چاہتا ہے کہ بنو عباس سے خلافت کو ختم کر کے علی کی اولاد میں پہنچا دے، پھر ان کے خلاف سازش کر کے حکومت کو آخرالامر کسرادی بنا ڈالے[2]"

ایرانیوں میں سے جو لوگ بڑے بڑے مناصب پا لیتے تھے وہ حتی الامکان عربوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے تھے۔ جیسا کہ افشین اور ابودلف عجلی کے واقعہ میں صاف نظر آتا ہے۔ افشین" اشروسنہ" کا ایک عجمی تھا۔ اشروسنہ ایشیائے کوچک کا ایک شہر ہے۔ وہ خلیفہ معتصم کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ اسے عربوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ مجھے جب بھی عربوں پر قابو حاصل ہوگا تو ان کے رئیسوں کے سروں کو گرزوں سے کچل ڈالوں گا۔" اس کا تذکرہ آئندہ بھی آئے گا جہاں ہم زندقہ پر گفتگو کریں گے۔ ابودلف عجلی قبیلۂ نزار سے ایک عربی النسل آدمی تھا۔ اس کی زندگی عربوں جیسی زندگی تھی۔ سخی، بہادر اور ممدوح تھا۔ اس کا دروازہ شعراء، ادباء اور ضرورت مندوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اور اس کے اموال ان لوگوں پر برابر تقسیم ہوتے رہتے تھے۔ یہ بھی معتصم کے کمانڈروں سے ایک کمانڈر تھا اپنے خاندان کا بزرگ اور اپنے قبیلۂ عجل اور ربیعہ وغیرہ کا رئیس تھا خود نہایت عمدہ شاعر، بہادر، پہلوان، اور مغنی تھا۔[3]

تنوخی اپنی کتاب" الفرج بعد الشدۃ" میں بیان کرتا ہے کہ افشین نے ابودلف کو قتل کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ اور اسے قتل کر دینے کے لئے افشین کے روبرو کھال پر بیٹھا دیا گیا۔ افشین اسے

---

[1] مقدمہ صفحہ ۱۳۔ [2] جہشیاری۔ ص ۳۹۷۔ [3] سعودی ص ۲۷۷۔ ج ۲۔

برابر دھمکیاں دے رہا اور نہایت غصّہ کے ساتھ خطاب کر رہا تھا۔ وہ قتل کا حکم دینے والا ہی تھا کہ احمد بن ابی داؤد (یہ عربی النسل تھا اور مامون معتصم کی طرف سے قاضی تھا) کو اس کی خبر لگی۔ وہ بھاگم بھاگ افشین کے پاس پہنچا اور اجازت لئے بغیر ہی اندر گھس گیا کیونکہ اُسے اندیشہ تھا کہ اتنے عرصہ میں ابودُلف کا کام تمام نہ ہو جائے۔ احمد بن ابو داؤد، افشین سے کہتا ہے، ابودلف عرب کا شہسوار اور نہایت شریف آدمی ہے اس کو معاف کردے اور اس پر احسان کر۔ اگر تو اسے اس قابل نہیں سمجھتا تو پورے عرب کی خاطر اسے معاف کردے۔ تم جانتے ہو کہ ایران کے شہنشاہ ہمیشہ عرب بادشاہوں پر احسان کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ کسریٰ نے نعمان پر بھی احسان کیا تھا اور اسے بادشاہ بنا دیا تھا۔ تو آج اُنہی ایرانی شہنشاہوں کی یادگار ہے، لہٰذا عرب کے ایک شریف آدمی کو معاف کرکے اس پر احسان فرما۔ مگر افشین اس سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ آخر ابن ابی داؤد کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ معتصم کے نزدیک اس کا اپنا کیا مرتبہ ہے حتیٰ کہ وہ خود اس کی طرف سے بھی بات کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ افشین سے کہتا ہے کہ اچھا سنو۔ مجھے امیرالمؤمنین نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ امیرالمؤمنین کا ارشاد ہے کہ قاسم بن عیسےٰ (ابودُلف) کے بارہ میں تم کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو یاد رہے اس کے بدلہ میں خود تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر ابن ابی داؤد سیدھا معتصم کے پاس پہنچا اور اسے واقعہ کی اطلاع دی۔ معتصم نے ابن ابی داؤد کے پیغام کی تصدیق کی۔ اور اس طرح ابودُلف، نے جو عربوں کا سردار تھا، عجمیوں کے سردار افشین سے نجات پائی۔[1]

احمد بن ابی داؤد، دوسری طرف اپنے منصب سے پورا پورا کام لیتا تھا اور عربوں کی ضروریات پوری کراتا تھا۔ وہ معتصم کے سامنے بات کرتا تھا تو کہا کرتا تھا۔

فلاں ہاشمی، فلاں قریشی، فلاں انصاری، فلاں عربی کی بات ایسی ایسی ہے۔ اور برابر نرمی اور ملاطفت سے کام لے لے کر ان کی ضروریات پوری کراتا رہتا تھا۔[2]

اس مقابلہ کی دوسری صورت ——— ادبی مقابلہ کی شکل میں جو بنو اُمیہ کے عہد میں زیادہ معروف تھا ———

---

[1] کتاب "الفرج بعد الشدۃ" میں آپ پورا قصّہ ملاحظہ فرمائیں۔ صفحہ ۲۸۔ جلد ۲۔

[2] اس واقعہ کو مسعودی میں دیکھئے۔ صفحہ ۲۹۴۔ جلد ۲۔

باپ کی طرف سے نسب پر فخر کرنے کی شکل میں ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے جو عبداللہ بن طاہر (ایرانی) کی طرف سے پیش آیا جبکہ وہ اپنے ایرانی نسب پر فخر کرتا ہے اور محمد بن یزید (عربی اموی) اس کا جواب دیتا ہے اور وہ عربوں پر فخر کرتا ہے۔ عبداللہ بن طاہر نے ایک قصیدہ کہا جس میں وہ اپنے والد اور اپنے خاندان کے کارنامے بیان کرتا ہے اور محمد الامین کے قتل کرڈالنے پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

اقصری عما لجت بہ　　ففراعی عنک مشغولُ
انا من تعرفی نسبی　　سلفی الغرا لبھالیلُ

اپنی بکواس بند کر۔ مجھے فرصت میں بھی تیری یہ باتیں سننے کی فرصت نہیں ہے۔ میں وہی ہوں جس کا نسب، تو جانتی ہے۔ میرے آبا و اجداد سفید پیشانیوں والے بہادر ہیں۔

اسی قصیدہ میں وہ کہتا ہے:۔

والدی من لا کفاء لہٗ　　من یساوی مجدہٗ؟ قولوا

میرا باپ وہی تو ہے جس کے برابر کا کوئی نہیں۔ شرف میں کون اس کی برابری کر سکتا ہے؟ ذرا کہو تو!!

اس کے بعد کہتا ہے:۔

انظر المخلوع کلکلہٗ　　وحوالیہ المقاویلُ
فثوی والترب مضجعہٗ　　غال عنہ ملکہٗ غولُ
قاد جیشا نحوہا ثلۃ　　ضاق عنہ العرض والطولُ
من خراسان مصمصہم　　کلبوث ضمہا غیلُ
وھبوا اللہ انفسہم　　لا سعازیلٌ ولا میلُ

ذرا اسے دیکھو جس کا تاج چھین لیا گیا۔ اس کے گرد اس کی باتیں بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ گارا اور مٹی اس کی آرام گاہ تھی۔ اس کی سلطنت دیوؤں نے چھین لی تھی۔ جو اس کی طرف ایک ایسا لشکر لائے تھے جس سے زمین کا عرض اور طول تنگ ہو گیا تھا۔ یہ لشکر خراسان سے آیا تھا جو دیوؤں کی کچھار ہے۔ وہ شیروں کی طرح آئے جنہوں نے جنگلی کچھاروں میں پرورش پائی تھی۔ خدا کے لئے ان کے متعلق اور کچھ نہ کہو وہ نکلے یا سرمہ کی سلائیاں نہیں تھے۔

محمد بن یزید کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ عقیدہ سنا تو عربوں کی وجہ سے میرا چہرہ سکڑ گیا۔ مجھے اس سے بڑی ہی عار آئی کہ ایران کا ایک آدمی عربوں کے خلاف یوں علانیہ فخر کرے کیونکہ اس نے انکے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اپنی تلوار سے نہیں بلکہ خود اس کے بھائی کی تلوار سے قتل کر دیا تھا۔ وہ اس واقعہ پر اس طرح فخر کرتا ہے اور یہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ میں نے اس کے قصیدہ کا جواب دیا:

لا یرعك القال والقیل — کل ما بلغت تضلیل

یا ابن بیت النار موقدها — ما لحاذیه سراویل

من حسین، من ابوك ومن — مصعب غالتمکو غول

نسب فی الفخر مؤتشب — وابوات اراذیل

قاتل المخلوع مقتول — ودم المقتول مطلول

یہ قال وقیل تجھے اندیشہ میں نہ ڈال دے۔ جو باتیں تو نے پہنچائی ہیں سراپا گمراہ کن ہیں۔ آتش خانوں کی آگ روشن رکھنے والے بیٹے۔ آتش خانوں میں چلنے والے پاجامے بھی نہیں پہنتے حسین کون تھا تیرا باپ، کون تھا، مصعب کون تھا۔ تمہیں غول بیابانی کھا جائیں۔ فخر کے میدان میں تو بہت ہی کمزور نسب ہے۔ اور یہ آباؤ اجداد تو رذیل اور کمینے ہیں۔ معزول بادشاہ کا قاتل قتل کر دیا جائے گا اور اس کے خون کا کوئی خون بہا بھی نہیں دیا جائے گا۔

اسی عقیدہ میں آگے چل کر کہتے ہیں:

ماجری فی عود اثلتکم — ماء مجد فهو من خول

قدحت فیه اسافله — فاعالیه مهازیل

تمہارے خاندان کی کڑی میں جو کچھ شرف کا پانی چل رہا ہے وہ کہیں باہر سے آیا ہوا ہے۔ نچلے لوگ اس میں کوچے مارتے ہیں تو اوپر کے لوگ لاغر اندام ہوئے جاتے ہیں۔

کسی ایرانی کا شعر ہے:

بهالیل غر من ذؤابة فارس — اذا انتسبوا الا من عرنیة اوعکل!

هم وراضة الدنیا، وسادة اهلها — اذا افتخروا، لاراضة الشاء والابل

وہ بہادر اور سفید پیشانیوں والے ہیں۔ جب وہ نسب بیان کرتے ہیں، تو ایرانی پیشانیوں سے اپنا نسب بیان کرتے ہیں۔ عرنیہ اور عکل سے نہیں جب

فخر کرتے ہیں تو وہ دنیا کے منتظم ہیں اور دنیا والوں کے سردار ہیں، بکریوں اور اونٹوں کے خدمتگار نہیں۔
کوئی عربی شاعر اس کے جواب میں کہتا ہے:۔

لاتغترر انك من فارس　　　في معدن الملك وديوانه

لوحدثت كسرى بذ انفسه　　　صفعته في جوف ايوانه

اس پر دھوکہ نہ کھا کہ تو ایران سے تعلق رکھتا ہے اور تو حکومت کی کان اور حکومت کے دفتر میں پیدا ہوا ہے اگر کسریٰ کے دل میں بھی اس قسم کا اندیشہ گذرے تو میں خود اس کے محل کے بیچ میں اسے تھپڑ رسید کر سکتا ہوں۔
اس مقابلہ کی ایک تیسری شکل بھی تھی۔ اور یہ علمی مقابلہ تھا۔ اس موضوع پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اس کا نتیجہ مگر اس مقابلہ کا نتیجہ عربوں کی شکست اور غلاموں کے غلبہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ لیکن ہمیں یہاں یہ اعتراف ضرور کرنا ہوگا کہ عربوں کو مکمل شکست سیاسی اور انتظامی شعبوں ہی میں حاصل ہوئی تھی۔
جہاں تک دینی اور لسانی شعبہ کا تعلق تھا اس شعبہ میں عرب ہی غالب رہے۔ مجوسیت اسلام کے سامنے نہیں چل سکتی تھی۔ ایسے ہی غلاموں کی زبانیں عربی زبان کی شان کو کم نہیں کر سکتی تھیں۔ بلکہ ان تمام زبانوں نے عربی زبان کی خدمت کی اور مختلف جہات سے اس کی ترقی کے لئے کام کیا۔ غلاموں کی یہ قوم جو در اصل خود اپنی سیاسی اغراض کی خدمت کرتے تھے اور ان میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ ہی دین اور زبان کی خدمت بھی برابر انجام دے رہے تھے۔ ان کے قواعد و ضوابط مقرر کر رہے تھے اور ان کو نظم و ترتیب دے رہے تھے —— زندقہ کی حرکت جو کبھی کبھی سر ابھارتی رہتی تھی قوت کے ساتھ دبا دی گئی۔ اگرچہ وہ اپنا تھوڑا سا اثر ضرور چھوڑ گئی —— جیسا کہ عباسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسی کوشش کر رہے تھے کہ وہ عربی زبان کی جگہ فارسی زبان کی عظمت کا پھریرا اڑائیں لیکن ان کی ان باتوں کو سننے والا بھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ عربی زبان ہی قانونی زبان قرار پائی۔ یہی دین کی زبان تھی اور یہی علم کی۔ غلاموں نے عربی زبان کو عمدگی کے ساتھ سیکھنے کی کوشش کی اور ان کی یہ کوشش اس حد تک بار آور ہوئی کہ وہ عربوں کے لگ بھگ پہنچ گئے۔ اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ ابو مسلم خراسانی جیسا آدمی بھی بے تکلف عربی زبان بولتا اور رؤبہ کے اشعار کو بخوبی سمجھ سکتا تھا[1] عربی زبان کے زیادہ تر عمدہ میر منشی ان دنوں ایرانی ہوتے تھے۔ اصمعی اپنے زمانہ کی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی عربی شہر میں فارسی زبان میں بولنا شرافت و مروت کے خلاف سمجھا جاتا ہے[2]

———— (۰) ————

[1] اغانی صفحہ ۱۲۳ جلد ۱۸۔　　　[2] عیون الاخبار۔ صفحہ ۲۹۶ جلد ۱۔

تیسری فصل

(شعوبیت)

پچھلی فصل میں جو باتیں ہم بیان کر چکے ہیں ان کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں تین قسم کے رجحانات چھائے ہوئے تھے۔

عربی سیادت کا رجحان

(پہلا رجحان) یہ تھا کہ تمام قوموں میں عرب قوم سب سے افضل اور بہتر ہے۔ ان لوگوں کے جو دلائل تھے وہ اجمالاً ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:۔

(۱) عربوں نے اپنی زندگی ہمیشہ استقلال و حریت کے ساتھ گذاری۔ جاہلیت کے زمانہ میں بھی وہ دو حکومتوں ــــ ایران اور روم ــــ کے پڑوسی رہے۔ دونوں حکومتوں نے بڑے بڑے شہروں کو فتح اور بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ دونوں کے پاس فوج، تعداد اور جنگی ساز و سامان کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن انہیں کبھی اس کی جرأت نہ ہو سکی کہ عربوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں اور اُن کے شہروں پر لشکر کشی کر سکیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ ان کی چاپلوسی کرتے رہے۔ چنانچہ حیرہ میں لخمی عربوں کے ساتھ اور شام میں غسانی عربوں کے ساتھ ان کے اس قسم کے تعلقات تھے۔ یہ ان کو مال بھی دیتے تھے اور جزیرۂ عرب کے عربوں کے حملوں سے حفاظت کی خاطر اپنے شہروں میں ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ لہذا وہ عربوں کی بہ نسبت خود عربوں کے زیادہ محتاج تھے۔

اس رجحان کے ماننے والے اسے تسلیم نہیں کرتے کہ ایران اور روم کو سرزمین عرب کی طرف اس لئے توجہ نہیں ہوئی کہ جزیرۂ عرب کی سرزمین میں کوئی ایسی خیر و ثروت ہی نہیں تھی جس کی طرف لالچ کیا جاتا۔ بلکہ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کو ان کی طرف اس لئے توجہ نہیں ہو سکی کہ وہ عربوں کی شجاعت

صہامت اور ثابت قدمی سے واقف تھے۔ ان کی سرزمین پر قدرتی حفاظت کے سامان اس قسم کے موجود ہیں کہ وہ عرب کی جنگ کو چھوٹی چھوٹی فوجوں کی جنگ بنا دیتی ہیں جس کی وجہ سے کوئی منظم بڑی فوج ان کی جنگی صورتوں کا نہ مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ ان کے سامنے قدم جما سکتی ہے۔

یہ تو زمانۂ جاہلیت کی بات تھی۔ اب زمانۂ اسلام کی بات دیکھئے۔ تو عربوں نے مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی حریت و استقلال کی پوری پوری حفاظت کی بلکہ ایرانیوں کی حریت و استقلال کو ضائع کر کے انہیں اپنی حکومت کا تابع فرمان بنا لیا۔ رومیوں کی فوجوں کو شکست دے کر اُن کے مملوکہ علاقوں سے انہیں نکال باہر کیا۔

(۲) ان میں کچھ خلقی صفات ایسی موجود تھیں جن سے وہ ممتاز تھے۔ وہ بڑے مہمان نواز اور فریادرس ہوتے تھے۔ رات کو اگر کوئی مہمان آجاتا تو ایک عرب میزبان اپنی اکیلی اونٹنی کو اس کی مہمان نوازی کے لئے ذبح کر دیتا تھا جبکہ اس کی ساری کائنات محض یہی اونٹنی ہوتی تھی۔ اس کا ہاتھ ہر وقت گھوڑے کی لگام پر رہتا تھا۔ کہیں فریاد کی آواز بلند ہوتی تو اُڑ کر وہاں پہنچتا تھا۔ ساری قوموں سے زیادہ انہیں اپنی بات کا پاس ہوتا تھا۔ کسی کی زبان سے ایک بات نکل جاتی تھی تو وہ پتھر پر لکیر ہو جاتی تھی۔ کوئی پناہ گیر اس کے پاس پناہ لیتا تو وہ اس کی پناہ گزینی کا حق ادا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اس پناہ گزین کے ساتھ ان کے ہاں بالکل ویسے ہی سلوک کیا جاتا تھا جیسا کہ خاندان میں اپنے بچہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان امتیازات کے ساتھ ساتھ قوتِ بیان اور حسنِ تعبیر میں وہ تمام قوموں کے پیشرو تھے۔ شعر و شاعری کا مخزن تھے۔ عمدگی کے ساتھ بدیہہ گوئی اور چلتی پھرتی ضرب الامثال بنانے اور نئی نئی باتیں پیدا کرنے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ اپنے نسب کی وہ بڑی حفاظت کرتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص اپنا نسب جانتا تھا اور ہر شخص سے اس کا شجرۂ نسب سنا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنے آباؤ اجداد کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف منسوب ہو جاتا تھا تو ساری قوم میں مشہور ہو جاتا تھا کہ وہ (دَعِیٌّ) دوسری کی طرف نسبتیں کرنے والا ہے۔ وہ اپنے نسب ناموں کی حفاظت کرتے اور اپنے حسب کی انہی پر بنیاد رکھتے تھے۔

(۳) اسلام نے ان کے درمیان نشوونما پائی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی عربوں میں سے ایک تھے۔ دوسری قوموں میں اسلام کو پھیلانے والے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والے، اسلامی دعوت کی حفاظت کرنے والے یہی عرب تھے۔ اہلِ عجم میں سے جسے بھی اسلام نصیب ہوا اس کی گردن پر عربوں کا یہ

اتنا بڑا احسان تھا جس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عرب ہی تھے جنہوں نے اسے اس کے پرانے دین کی تاریکی سے نجات دی اور شرک سے توحید کی طرف لے آئے۔ عرب ہی تھے جنہوں نے اسلام کی ہدایت کو چار دانگ عالم میں پھیلانے کے لئے جنگ کی آگ کی تپش سہی۔ عرب ہی تو تھے جنہوں نے اسلام کو زندگی بخشنے کے لئے اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھائی۔!!

یہ ہیں وہ اہم ترین دلائل و براہین جو اس رائے کی طرف جانے والے پیش کرتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ کچھ لوگ مقامِ مربد میں جمع تھے اور ابن المقفع بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابن المقفع نے ان لوگوں سے پوچھا کہ دنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ عقل مند قوم کونسی ہے؟ لوگ ایک دوسرے کے مُنہ کو دیکھنے لگے۔ لوگوں نے اپنے دل میں سوچا کہ ابن المقفع چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایرانی ہے اس لئے ایران کی طرف ہی اس کا اشارہ ہوگا۔ چنانچہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ایرانی قوم سب سے زیادہ عقل مند ہے۔ ابن المقفع نے کہا کہ ایرانی قوم میں تو یہ بات نہیں ہے۔ وہ بڑے حصّۂ زمین پر قابض رہے۔ بڑی سلطنت انہوں نے پائی۔ بے شمار مخلوق پر ان کو غلبۂ و اقتدار حاصل رہا مگر انہوں نے اپنی عقلوں کے سہارے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔ لوگوں نے کہا کہ پھر رومی قوم سب سے زیادہ عقل مند ہوگی۔ ابن المقفع نے کہا کہ رومی تو صناع اور کاریگر ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ پھر چینی قوم عقل مند تر ہوگی۔ ابن المقفع نے اسے بھی رد کرتے ہوئے کہا کہ وہ عجوبہ پسند قوم ہے۔ لوگوں نے ہندوستانی قوم کا نام لیا تو ابن المقفع نے اس سے بھی اتفاق نہیں کیا اور کہنے لگا کہ وہ تو نرے فلسفی ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ پھر سوڈانی قوم ہوگی۔۔۔۔ ابن المقفع نے کہا کہ لاحول و لا قوۃ۔ وہ تو خدا کی مخلوق میں بدتر ہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ اچھا پھر آپ خود ہی بتائیے۔ ابن المقفع نے کہا کہ دنیا میں سب سے زیادہ عقل مند قوم عرب کی قوم ہے۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ ابن المقفع نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ میری موافقت نہیں کرو گے۔ لیکن اگر مجھے عرب سے نسبی شرف حاصل نہیں تو میں اسے کس طرح پسند کر لوں کہ مجھے عربوں کی معرفت سے بھی کچھ حصّہ نہ ملے۔ عربوں نے حکومت کی جبکہ ان کے سامنے کوئی پہلے سے قائم شدہ نمونہ نہیں تھا۔ ان کے ہاں کوئی ایسے آثار نہیں تھے جو منتقل ہوتے آرہے ہوں وہ بھیڑوں بکریوں اور اونٹوں میں زندگی بسر کرتے، اون اور چمڑے کے خیموں میں رہتے تھے۔ ان میں ہر شخص اپنی قوت اور قوتِ بازو سے کمائی ہوئی دولت سے سخاوت کرتا تھا۔ اور تنگی ترشی ہر حالت میں اس کا سامنا کرتا تھا۔ اپنی عقل کے

زور پر کسی چیز کو بیان کرنے پر آتا تو لوگوں کا امام بن جاتا۔ کام کرنے پر آتا تو حجت بن جاتا۔ جس کی تعریف کرنے پر آتا اسے اچھا کر دکھاتا۔ جس کی مذمت کرنے پر آتا اُسے بُرا بنا ڈالتا۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو ادب سکھایا۔ ان کی ہمتوں نے انہیں بلند مراتب تک پہنچایا۔ ان کے دلوں اور زبانوں نے انہیں عالی مرتبگی بخشی۔ خدا نے اپنے دین اور خلافت کی ابتدا رحشر تک کے لئے ان سے فرمائی۔ جو شخص ان کے حقوق میں ان سے کوتاہی کرتا ہے وہ خود ہی خسارہ میں رہتا ہے۔ جو ان کی فضیلت سے انکار کرتا ہے اسے دلائل سے ساکت کیا جا سکتا ہے۔

ابن المقفع سے ہی مروی ہے کہ ایک مرتبہ شعر و شاعری اور اس کی فضیلت کا ذکر اس کے سامنے چھڑ گیا تو وہ کہنے لگا اس بدوی لڑکے کی حکمت سے کونسی حکمت زیادہ بلیغ، زیادہ عجیب اور زیادہ غریب ہو سکتی ہے جس نے سبزہ زاروں کو کبھی نہیں دیکھا کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ بات کرنے سے اُسے وحشت ہوتی۔ لوگوں کے پاس گھبرا گھبرا کر آتا ہو، اسے ریگستانوں، گوہوں اور ہرنوں کی طرف پناہ ملتی ہو، غول ہائے بیابانی کے ساتھ زندگی گذارتا ہو اور سانپوں کے ساتھ مانوس ہو۔ لیکن جب وہ شعر کہنے پر آتا ہو تو ایسی ایسی باتوں کو بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو جو نہ اس نے کبھی دیکھی نہ سنی اور نہ جن سے وہ کبھی آشنا رہا۔ اس کے بعد وہ محاسنِ اخلاق اور مساوی اخلاق کو بھی بیان کرتا ہے، مدح بھی کرتا ہے اور ہجو و مذمت بھی۔ شکوے بھی کرتا ہے اور عاشقانہ تشبیہیں بھی، وہ ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ لوگ انہیں لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکا مر جاتا ہے مگر لوگ اس کی باتیں نقل کرتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ جاتی ہیں[1]۔" اگرچہ ہمیں اس میں پورا شبہ ہے کہ ابن المقفع کی یہ روایت صحیح ہو لیکن اس کے باوجود ہم اسے نقل کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ یہ روایت ایک صحیح رجحان کی تصویر کشی کرتی ہے۔

جاحظ کہتے ہیں کہ فصیح اور عقلمند بدویوں کی لمبی چوڑی باتیں سننے سے زیادہ روئے زمین پر کوئی بات زیادہ سبق آموز، فائدہ مند، عمدہ کانوں کے لئے لذیذ تر، عقول سلیمہ سے شدید ترین لگاؤ رکھنے والی، زبان کی گرہیں کھول دینے والی اور قوتِ گویائی کو عمدگی اور درستگی بخشنے والی نہیں ہوتی[2]۔

---

[1] زہر الآداب بر حاشیہ العقد الفرید ص۲ ج ۲ - [2] زہر الآداب۔ ص۲ جلد ۲

اس رجحان کا نمونہ اشراف عرب اور بدوی لوگ تھے جیسا کہ اس رجحان کا نمونہ وہ عجمی لوگ بھی تھے جو دل کی گہرائیوں سے اسلام لائے تھے اور جن کے اعماق قلب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں تھی اور وہ عربوں سے بھی اس لئے محبت کرتے تھے کہ ایک تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود ان میں سے تھے اور دوسرے اس لئے بھی کہ یہ لوگ خود انہی عربوں کے ہاتھوں اسلام لائے تھے۔

مساوات کا رجحان

(دوسرا رجحان) یہ تھا کہ عرب دوسری قوموں سے افضل نہیں اور نہ ہی کوئی قوم کسی قوم سے افضل ہو سکتی ہے۔ سارے انسان ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور ایک ہی انسان کے نطفہ سے ان سب کی تخلیق ہوئی ہے۔ ایک دوسرے پر فضیلت افراد میں تو ہو سکتی ہے مگر اقوام میں نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کے درمیان فضیلت اپنے آباؤ اجداد اور حسب نسب سے نہیں ہو سکتی بلکہ اپنے اخلاق اور اعمال سے ہوتی ہے۔ یا ان کی شرافتِ نفس اور بلند ہمتی سے ہو سکتی ہے۔ آدمی اگر پست ہمت اور بے مروت ہو تو اسے شریف نہیں کہا جا سکتا خواہ اس کے گیسو بنو ہاشم سے وابستہ ہوں اور اس کی ناک بنو امیہ کی ناک سے بندھی ہو اور بنو قیس کے شریف ترین قبیلہ سے اس کا شمار ہوتا ہو۔ بلکہ شریف اور کریم وہ ہے جس کے افعال و اعمال شریف ہوں اور جس کی ہمت اور جرأت شرف و کرم کی حامل ہو۔

یہ لوگ ایک مؤقف اختیار کرتے ہیں ——— تمام اقوامِ عالم کی مساوات کا مؤقف ——— کہ کوئی عربی کسی عجمی سے اس لئے افضل نہیں کہ وہ عربی ہے اور کوئی عجمی کسی عربی سے اس لئے بالاتر نہیں ہے کہ وہ عجمی ہے۔ عربیت اور عجمیت تفاضل کے عوامل میں سے کوئی عامل ہی نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے نزدیک تفاضل کا عامل محض دینداری ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک شرافت اور بلند اخلاقی یہی مضمون ہمیں قرآنِ کریم میں بھی ملتا ہے جہاں وہ کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹/۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے اور شعوب و قبائل میں اس لئے تقسیم کر دیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً خدا کے نزدیک تم میں شریف تر

وہ ہے جو خدا کے قوانین سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

حدیث میں ہے ــــ "کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت ہے تو تقویٰ کے ساتھ ہے" ــــ ایک دوسری حدیث ہے ــــ "مومنوں کے خون برابر ہیں ان میں سے ادنیٰ ترین شخص بڑی سے بڑی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے۔ وہ مخالفین کے مقابلہ میں ایک متحدہ قوت ہیں" ــــ مامون کا قول ہے کہ شرافت نسبی چیز ہے۔ عرب کا شریف آدمی عجم کے شریف آدمی کے ساتھ زیادہ قریب ہے، بہ نسبت عجم کے کمینہ آدمیوں کے عرب کے شرفاء کے ساتھ۔ ایسے ہی عجم کا شریف آدمی عرب کے شریف آدمیوں کے ساتھ زیادہ قریب ہے۔ بہ نسبت عرب کے کمینہ آدمیوں کے عجم کے شرفاء کے ساتھ"[1] ابن قتیبہ نے عربوں کی طرف سے مدافعت کرنے اور دوسری قوموں پر ان کی فضیلت واضح کرنے کے بعد اپنی کتاب کے آخر میں کہا ہے کہ "میرے نزدیک صحیح ترین قول یہی ہے کہ سارے آدمی ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے، ایک مٹی سے بنے اور ایک ہی زمین میں لوٹا دیئے جائیں گے۔ سب کے نطفے پیشاب کی نال سے نکلے اور سب پر گندیاں لپٹی رہیں۔ یہ ہے ان کا بلند ترین نسب نامہ جس سے ہر عقل مند آدمی کو تعظیم، تکبر اور فخر بالآباء سے باز آجانا چاہیئے۔ اس کے بعد ان سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے جہاں تمام نسب اور حسب ختم ہو جائیں گے بجز ان لوگوں کے جن کا حسب تقویٰ ہوگا یا جن کی ساخت اللہ کی فرمانبرداری اور اطاعت کیساتھ ہوئی ہوگی"[2]

ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ ہر قوم میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر قوم میں کچھ خوبیاں اور برائیاں ہوتی ہیں۔ اعمال کا وزن کرنے کے لئے بہترین میزان دین اور اخلاق ہی ہو سکتے ہیں۔ ہم قوموں کے اخلاق کا تو وزن نہیں کر سکتے۔ البتہ افراد کے اعمال کا وزن کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنے دین اور اخلاق کے لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو "اہل التسویہ" کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ ہیں جو اقوام و ملل میں مساوات کے قائل ہیں۔ اور کسی قوم کو دوسری قوم پر فضیلت دینے کے قائل نہیں ہیں۔ اکثر دیندار اور عرب و عجم کے علماء اسی خیال کے گذرے ہیں۔ کیونکہ اسلام کی روح اور اس کی بنیادی تعلیمات اس رجحان کی تائید کرتی ہیں۔

ـــــــــــــــــــ

[1] محاضرات الادباء۔ ص۲۱۹ جلد ۲ [2] العقد الفرید۔ ص۹۰ جلد ۲۔

غیر عربی سیادت کا رجحان

(تیسرا رجحان) عربوں کی شان کمتر دکھانے کی طرف مائل ہے اور وہ دوسری قوموں کو عربوں سے افضل قرار دیتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ

(۱) ہر قوم کا کوئی نہ کوئی امتیاز ہوا کرتا ہے جس پر وہ فخر کرتی ہے مگر عربوں کا ایسا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ رومیوں کو دیکھئے وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اُن کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ ان کے ہاں بڑے بڑے شہر تھے۔ ان کی تہذیب نہایت عالی شان تھی۔ ہندوستان والے اپنی حکمت و فلسفہ اور طب پر فخر کرتے تھے۔ اپنی کثرتِ تعداد، بہتی نہروں، سرسبز و شاداب زمینوں اور پھلوں پھلواریوں کی کثرت پر فخر کرتے تھے۔ چین کے لوگ اپنی صنعتوں اور فنونِ جمیلہ پر فخر کرتے تھے۔ وغیر ذٰلک لیکن عربوں کے ہاں ہمیں کوئی ایسی امتیازی بات نظر نہیں آتی جس پر وہ فخر کر سکیں۔ ان کی زمین بنجر اور خشک، زندگی میں بدویت، زمانۂ جاہلیت میں فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اپنی اولاد تک کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ ان کی ساری زندگی محض لوٹ مار، جنگ و جدل تھی جس کی وجہ سے ان کی کوئی حالت بھی مستقل اور استوار نہیں ہوتی تھی۔ ذرا سا کوئی اچھا کام کر دیتے مثلاً کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا، یا کسی مظلوم کی مدد کر دی تو نظم و نثر کے ذریعہ سے اس ایک واقعہ کا وہ شور مچاتے کہ ساری دنیا میں غلغلہ بلند کر دیتے اور اس پر فخر کر کے بُری طرح اکڑتے تھے۔

(۲) فخر کن چیزوں پر ہوا کرتا ہے؟ حکومت و سلطنت پر؟ تو فراعنۂ مصر عمالقہ، اکاسرہ، اور قیاصرہ کے مقابلہ میں ان کی حکومت و سلطنت کچھ حیثیت بھی رکھتی تھی؟ کیا کسی ایسے سلیمان پر فخر کیا جا سکتا ہے جسے روئے زمین کی اتنی بڑی حکومت دی گئی ہو کہ اس کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوئی ہو؟ کیا عربوں میں کوئی ایسا سلیمان گذرا تھا؟

یا کسی ایسے سکندرِ اعظم کی حکومت پر فخر کیا جا سکتا ہے جس کی فتوحات مشرق و مغرب تک جا پہنچی ہوں؟ تو کیا عرب کوئی ایسا سکندرِ اعظم پیش کر سکتے ہیں؟ یا نبوت پر فخر کیا جا سکتا ہے؟ اگر نبوّت پر فخر ہو سکتا ہے تو سارے انبیاء غیر عرب تھے۔ بجز ان چار انبیاء کے۔ ہوُدؑ۔ صالحؑ۔ اسماعیلؑ اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم، یا صنعت و حرفت اور علم پر فخر کیا جا سکتا ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے عرب لیگ کے لوگ تمام اقوام کے مقابلہ میں کمزور تر تھے۔ ان کے ہاتھ اس خصوصیت میں سب سے زیادہ بانجھ تھے۔ ان کی عقلیں اس

حیثیت سے سب سے زیادہ بنجر اور شور تھیں۔ یا شعر پر فخر کیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے جس میں عرب ہی منفرد ہوں۔ یونانیوں کے ہاں موزوں اور مقفیٰ اشعار ہوتے تھے۔ رومیوں کے ہاں بھی اشعار ہوتے تھے ـــــ یا زوردار خطبوں اور لیکچروں پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یونانیوں اور رومیوں کے پُرشوکت خطبے اور سحر آمیز تقریریں کچھ ان سے کم نہیں تھیں۔ آخر وہ کونسی چیز ہے جس پر یہ لوگ فخر کر سکتے ہوں۔ عرب کے لوگ سخاوت اور وفا پر بڑا فخر کرتے تھے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جتنی لمبی چوڑی وہ باتیں بناتے ہیں اتنا انہوں نے کبھی کر کے نہیں دکھایا۔ اس کے بعد وہ حسب ونسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ حالانکہ زمانۂ جاہلیت میں ان کے ہاں نکاح اور شادی کی بھی پابندیاں نہیں تھیں جو اسلام نے ان پر عائد کردی ہیں۔ بلکہ ان کی شادیوں کی ایک قسم ایسی بھی تھی جس میں ایک عورت، چند مردوں میں مشترک ہوا کرتی تھی۔ وہ مختلف جنگوں میں ایک دوسرے کی عورتوں کو قید کر کے باندیاں بنا لیا کرتے تھے اور بغیر شادی کئے ہوئے ان سے استمتاع کرتے رہتے تھے اس سے ظاہر ہے کہ کون یقین سے جان سکتا تھا کہ اس کا باپ کون ہے؟

(۳) اگر وہ اسلام پر فخر کرتے ہیں تو اسلام تنہا عربوں کا دین نہیں ہے۔ وہ تو پوری نوعِ انسانی کا دین ہے۔ خود اسلام نے بھی ان کے اس رجحان سے جنگ کی ہے اور عصبیتِ جاہلیہ کو اس نے مٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے شرافت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا دین تو ہمارے اور عربوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ رہ گئی دنیا تو اس میں سے ہم ان سے بہت آگے ہیں۔ ہمیں دنیا کے امور کا ان سے کہیں زیادہ علم ہے۔ ہمیں دنیوی احوال وظروف سے استفادہ کے زیادہ مواقع مہیا ہیں۔
اس صنف کے نمائندے ـــــ جو عربوں کی تحقیر اور ان کی تذلیل شان کر کے ہر قوم کو ان سے افضل اور بہتر قرار دیتے تھے ـــــ وہ لوگ تھے جو ابھی تک اپنے پرانے دینوں پر قائم تھے یا اسلام تو لے آئے تھے مگر اسلام ابھی تک ان کے حلق کے نیچے نہیں اترا تھا۔ یا وہ لوگ تھے جن پر وطنی رجحانات کا غلبہ تھا اور وہ عربوں کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ انہوں نے ان کی حکومت کو ختم کر کے ان کی آزادی اور استقلال کو کھو دیا تھا۔

اس عہد میں یہ تین رجحانات پائے جاتے تھے۔ اور انہی رجحانات کے ماتحت لوگ آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ آخری دونوں رجحان (یعنی دوسرا اور تیسرا رجحان) رکھنے والے گروہوں پر "شعوبیہ" کا لفظ بولا جانے

لگا۔ حالانکہ دوسرے رجحان والے لوگ اس لقب کے زیادہ مستحق تھے۔ وہ اس کے قائل تھے کہ شرف اور ذلت کے اعتبار سے عربوں اور دیگر اقوام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے لئے موزوں تر ایک تو وہ نام ہو سکتا تھا جو لفظ "مساوات" سے مشتق اور ماخوذ ہوتا۔ یا وہ نام ہو سکتا تھا جو لفظ "شعوب" سے ماخوذ ہوتا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ اس کے قائل ہیں کہ تمام قومیں برابر ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے دوسرے نام کو اختیار کیا اور اپنا نام "شعوبیہ" رکھ لیا۔ اس لئے صاحب عقد الفرید کہتے ہیں کہ "شعوبیہ" قوموں کے درمیان مساوات اور تسویہ کے قائل لوگوں کو کہتے ہیں۔ جوہری نے صحاح میں کہا ہے کہ

شعوبیت کا لفظ اور اس کا اصل سرچشمہ

"شعوبیہ" اس فرقہ کو کہتے ہیں جو عجمیوں پر عربوں کی فضیلت کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس نام کا اطلاق تیسرے رجحان والوں پر کرنے لگتے ہیں۔ اگر ہم جاحظ کی تحریرات اور صاحب عقد الفرید کے بیانات کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ چیز مل جاتی ہے کہ یہ حضرات ان لوگوں کو بھی "شعوبیہ" کے نام سے پکارتے ہیں جو عربوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ابتداءً اس نام کے ساتھ انہی لوگوں کو موسوم کیا گیا تھا جو مساوات کے قائل تھے۔ لیکن آگے چل کر پھر بعد میں تیسرے رجحان والوں کو بھی اس نام سے پکارا جانے لگا۔ تیسرے رجحان والا گروہ تاریخی اعتبار سے بھی دوسرے رجحان والے گروہ سے بعد میں ہی پیدا ہوا تھا۔ اور یہ بات بالکل فطری ہے کہ بنو امیہ کے دورِ حکومت میں عرب کے لوگ متغلب تھے۔ اور پہلا رجحان اپنی پوری شدت، قوت اور غلبہ کے ساتھ چھایا ہوا تھا ـــــ مَوالی نے اس بات کو محسوس کیا ہوگا اور ابتداءً انہوں نے اسی پر اکتفاء کیا ہوگا کہ وہ مساوات کا رجحان پیدا کریں۔ اس وقت ان کی آخری خواہش یہی ہوگی کہ وہ اس رجحان کو کامیاب بنا سکیں۔ حتّٰی کہ جب اس مقابلہ نے شدت اختیار کر لی اور ہارون رشید اور مامون کے زمانہ میں مَوالی نے اپنی قوت اور تسلط کو محسوس کر لیا تو پھر تیسرا رجحان پیدا ہوا ہوگا جس میں انہیں عربوں کی شان گھٹا کر غیر عربوں کی شان بلند کرنے کی سوجھی ہوگی۔ اس کے بعد "شعوبیہ" کا لفظ ان پر بھی بولا جانے لگا ہوگا۔ اور ایک ساتھ دونوں رجحان رکھنے والے گروہوں کو اس نام سے پکارا جانے لگا ہوگا۔ رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو گئی کہ زیادہ تر یہ نام تیسرے رجحان والوں پر بولا جانے لگا ہوگا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے کہ "شعوبی" اس شخص کو کہتے ہیں جو عربوں کی شان گھٹانے کا قائل ہو اور غیر عربوں پر ان کی کسی فضیلت اور برتری نہ مانتا ہو"

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ "شعوبیہ" کا لفظ "شُعُوْبٌ" سے ماخوذ ہے جو شَعْبٌ کی جمع ہے۔ شَعَبٌ لوگوں کے گروہ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قبیلہ سے زیادہ وسیع اور عام مفہوم کا مالک ہے۔ زبیر بن بکار کا قول ہے کہ عربی میں قومیت و خاندان کے مفہوم میں ترتیب یہ ہوتی ہے۔ سب سے اوپر شَعْبٌ اس کے نیچے قَبِیْلَۃٌ۔ اس کے نیچے عِمَارَۃٌ، پھر بَطْنٌ پھر فَخِذٌ اور سب سے نیچے فَصِیْلَۃٌ بولتے ہیں۔ اس قول کی بنا پر قوم عرب ایک شَعْب ہے اور ایرانی قوم ایک شَعَب ہے اور روس تو ایک شعب۔ وقس علیٰ ذٰلک کچھ حضرات اس طرف گئے ہیں کہ شعوبیہ کا لفظ قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں شعوب سے مراد عجمی خاندان ہیں اور قبائل سے مراد عربی خاندان۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ اس کے غلط ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ عرب کے لوگ آیت کے نزول کے زمانہ میں اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں بے شمار صحابہؓ اور تابعین کی آراء نقل کی ہیں جو سب اسی نقطہ کے گرد گھومتی ہیں کہ شعوب سے مراد اوپر کا دور کا نسب ہوتا ہے۔ یا بطون کو کہتے ہیں اور قبائل کا لفظ اس کے نیچے ہوتا ہے — بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعوب کی تفسیر عجمی خاندانوں کے ساتھ اور قبائل کی تفسیر عربی خاندانوں کے ساتھ کسی شعوبی کی تفسیر ہے جو کسی عجمی نے گھڑی ہے جس سے اس کا مقصد عربوں پر عجمیوں کی برتری ثابت کرنا ہے کیونکہ خدا تعالےٰ نے شعوب کا ذکر پہلے کیا ہے اور قبائل کا بعد میں۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ "مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کسی عجمی نے قرآن کریم کی آیت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ الآیہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ شعوب عجمی لوگوں کو کہتے ہیں اور قبائل عربی لوگوں کو اور جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہو وہ مؤخر الذکر سے افضل ہوتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی محسوس کیا ہے کہ مساوات کے قائل لوگ اس آیت سے استدلال کرتے رہے ہیں۔ مگر ان کا استدلال دو وجہوں سے غلط ہے۔ اوّل تو یہ ہے کہ تذکرہ میں مقدم کرنا فضیلت اور برتری کی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کہہ کر جنات کو انسانوں سے مقدم ذکر کیا گیا ہے حالانکہ انسان جنات سے برتر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربوں کے مقابلہ میں عجمی لوگ لفظ شعب کا مصداق بننے کے کچھ زیادہ حق دار نہیں ہیں۔ معنی اور مفہوم کے لحاظ سے جو قوم کثیر التعداد اور شاخ در شاخ پھیلی ہوئی ہو اسے شعوب کہہ سکتے ہیں۔

شعوبیت کی ابتدا

ہو سکتا ہے کہ شعوبیہ کا نام آیت کی یہ تفسیر کر لینے کے بعد ہی شعوب سے ماخوذ مانا گیا ہو۔ لیکن یہ استدلال بہرحال ایک غلط بنیاد پر قائم ہے —— میرے نزدیک ایک

راجح بات یہی ہے کہ شعوبیہ کا لفظ عباسی عہد کے شروع ہی میں استعمال ہوا ہے جس کی دو دلیلیں میرے پاس موجود ہیں۔ جو اگرچہ قطعی دلیلیں تو نہیں ہیں تاہم اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

(اوّل) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عربوں کے برابری یا ان کی تحقیر کا رجحان قوی اور واضح صورت میں کہ اس کے متقاضین پر کسی نام کا اطلاق کرنے کی ضرورت پیش آ جائے عباسی عہد ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہ رجحان در پردہ اور مخفی سا تھا جس میں ظاہر ہونے کی قدرت ہی نہیں تھی۔ کبھی سر ابھارتا بھی تھا تو اُسے کچل دیا جاتا تھا۔ نام رکھنے کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے۔ جب کوئی رجحان ایک عام عقیدہ کی شکل یا ایک بڑی جماعت کی ہیئت اختیار کر لے۔ (دوّم) اموی دور حکومت میں ہمیں کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جس نے اس رجحان پر اس نام کا اطلاق کیا ہو۔ البتہ اصفہانی نے اغانی میں کہا ہے کہ "اسمٰعیل بن یسار شعوبی تھا" لیکن یہ بات تو ظاہر ہے کہ خود اصفہانی کا تعلق عباسی دورِ حکومت سے ہے جس نے اسمٰعیل کو یہ نام دیا ہے جس کا وہ مستحق تھا کیونکہ اس نے عجمیوں کی شان بڑھانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔ اور ہشام بن عبد الملک کے روبرو اس نے اپنے اشعار میں اسی کے گیت گائے تھے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اسماعیل بن یسار خود اپنے زمانہ میں بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے لوگ سلمان فارسیؓ کو صوفی شمار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے عہد میں صوفیہ کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں تھا۔ اسی طرح مسروق کی ایک روایت میں ہے کہ "شعوب" میں سے ایک آدمی مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد بھی اس سے جزیہ والوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔" مسروق تابعی ہیں اور بنو امیہ کے عہدِ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابن الاثیر نے اس روایت میں شعوب کی تفسیر عجمی آدمی سے کی ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ یہاں شعوب، شعوبی کی جمع ہو۔ شعوبی اس آدمی کو کہتے ہیں جو عربوں کی شان کو گھٹاتا ہو۔ جیسے کہ یہود اور مجوس یہودی اور مجوسی کی جمع ہے

ہمارے نزدیک یہ دوسری تفسیر بہت مستبعد ہے۔ یہ تفسیر متاخرین نے کی ہے اور مسروق کے زمانہ کے بعد جو کچھ ان کے زمانہ میں معروف تھا اسی کے مطابق انہوں نے تفسیر کر دی۔ ہمارا خیال یہی ہے کہ مسروق کا مطلب اتنا ہی تھا کہ عرب قوم کے علاوہ دوسری اقوام میں سے کوئی آدمی مسلمان ہو گیا۔ الغرض اس صورت میں اس قول سے کوئی استدلال کرنا صحیح نہیں رہتا۔

ہمارے اس قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر ان مذاہب کے نام جو اموی دولت کے ابتدائی زمانہ میں پیدا ہوئے تھے سب کے سب یائے نسبتی سے خالی ہیں۔ مثلاً خوارج، شیعہ، مرجئہ، معتزلہ، وغیرہ۔ یائے نسبتی

کا اضافہ اموی عہد کے آخر یا عباسی عہد کے شروع میں ہونے لگا تھا۔ مثلاً جہمیہ، قدریہ، راوندیہ، خرمیہ، شعوبیہ، وغیرہ —— سب سے قدیم ترین کتاب جس نے شعوبیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" ہے۔

"شعوبیت" کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے مندرجہ ذیل نتائج نکالے جاسکتے ہیں :-

(۱) شعوبیت کے مبلغین نے اپنی دعوت کی بنیاد ابتداءً خود اسلام کی تعلیمات ہی پر رکھی تھی۔ اسلام ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری کا قائل نہیں ہے۔ جزاء اور سزا اس کے نزدیک اعمال کے مطابق ہوتی ہے اجناس و اقوام کے مطابق نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ذلیل غلام اور ایک حقیر نبطی اللہ کے ہاں اعلیٰ علیین میں ہو اور اس کا آقا اور مالک جو بکثرت اہل و عیال اور مال و دولت رکھتا تھا اسفل سافلین میں ہو۔ اس کے آگے بڑھ کر آہستہ آہستہ انہوں نے عربوں کی تحقیر اور ان کے احوال کی تضحیک اور ان کے خلاف دوسری اقوام کے امتیازات گنانے شروع کر دیئے۔ دولت عباسیہ میں ایرانیوں کا اثر و نفوذ چونکہ کافی بڑھ چکا تھا اس بات نے ان کی اور بھی مدد کی۔

شعوبیت کے اوصاف

(۲) شعوبیت کوئی ایسا عقیدہ نہیں تھا کہ اس کی تعلیمات مشہور و محدود اور شعائر و رسوم ظاہر اور متعین ہوں۔ جیسا کہ دینی مذاہب کے بارہ میں ہم دیکھتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی شافعی ہے اور فلاں حنفی ہے کیونکہ ہم ان کے اختلافات کی حد بندی اور رسوم و شعائر وغیرہ میں ان کے امتیازات کو واضح کر سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی اہل سنت والجماعت میں سے ہے اور فلاں آدمی معتزلی ہے اور اس کا پتہ چلا سکتے ہیں لیکن ہم شعوبیت کے بارہ میں یہ کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں عقیدہ کی بہ نسبت رجحان کا زیادہ تعلق ہے۔ یہ رجحان در اصل ارستقرائیت (Aristocracy) اور دیمقراطیت (Democracy) سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ بلکہ درحقیقت دیمقراطیت (Democracy) ہی کی ایک شکل تھی جو عربوں کی ارستقرائیت (Aristocracy) سے برسرپیکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے ہم نواؤں کا احصار نہیں کر سکتے۔ وہ ہر شہر، ہر ملک اور ہر جنس میں پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ آج ہم ان لوگوں کو شمار نہیں کر سکتے جو دیمقراطیت (Democracy) یا اشتراکیت (Communism) کا رجحان رکھتے ہیں۔

(۳) جس چیز نے شعوبیت کے اس رجحان کو مدد پہنچائی یہ بھی تھی کہ یہ رجحان در اصل وطنی رجحان اور دینی عصبیت سے ہم آہنگی رکھتا تھا۔ عربوں نے ایران کی آزادی کو ختم کر دیا تھا۔ وہ مصر، شام اور بلاد مغرب کے مالک بن گئے تھے۔ ان ملکوں کے باشندے عرب نہیں تھے اس کے بعد اکثر ایرانیوں کے دل میں اپنی آزادی اور استقلال کی تمنائیں کروٹ لیتی تھیں۔ شام اور مصر کے اکثر نصاریٰ ان عرب مسلمانوں کو ناپسند کرتے تھے جنہوں نے رومی

نصاریٰ کو ان کے شہروں سے نکال دیا تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنے ملک میں خود اپنی ہم حکومت قائم کریں اور اگر محکوم بن کر ہی رہنا ہو تو کم از کم اپنے ہم مذہبوں کے محکوم بن کر رہیں۔

اتنی بات واضح ہے کہ ایرانیوں میں سے، ایسے ہی مصر، شام اور اندلس کے باشندوں میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ ان میں یہ وطنی رجحان اتنا شدید نہیں تھا۔ لیکن ان میں بھی کتنے تھے جن کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلام اتر گیا ہو اور ان کے حواس پر اس حد تک چھا گیا ہو کہ وہ ان دینی اور وطنی رجحانات پر غلبہ پا سکے۔

(۴) مذکورہ بالا تصریحات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شعوبی لوگ مختلف اصناف سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ ان میں سے ایرانی تھے، کچھ نبطی اور کچھ قبطی اور کچھ اندلسی تھے۔ ان میں سے ہر صنف کی شعوبیت ایک خاص رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ایرانیوں کی شعوبیت وطنی رنگ میں رنگی ہوئی تھی جو آزادی کی داعی تھی، اور بعض اوقات زندقہ اور الحاد کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ نبطیوں کی شعوبیت زمین اور زراعت کی عصبیت کی شکل میں رنگی ہوئی تھی اور وہ کھیتی باڑی کی زندگی کو صحرا اور صحرائی معیشت پر برتری دیتے تھے۔ قبطیوں نے کئی مرتبہ عربوں کے خلاف بغاوتیں کیں اور انہیں اپنے ملک سے نکال دینے کا ارادہ کیا۔ ان کی طرف سے آخری بڑی بغاوت مامون کے عہدِ حکومت میں ہوئی۔ جب انہیں ہر مرتبہ شکست کھانی پڑی تو آخر انہوں نے مکر و فریب کی پناہ لی اور حیلہ اور تدبیروں سے کام نکالنا چاہا۔ بالآخر دفترِ خراج پر قابض ہو کر انہوں نے اپنے انتقام کی آگ بجھائی[1]۔ اندلس میں ظہرا ابن غرسیہ نے شعوبیت کے موضوع پر اپنا ایک رسالہ تصنیف کیا جس کا اکثر علماء وقت نے جواب لکھا۔

(۵) اس شعوبیت کے مختلف درجات تھے۔ ابتداءً وہ نہایت معتدل اور پُرسکون رہتی تھی اور آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی جاتی تھی۔ ہم ایسے لوگوں کو پہلے دیکھ چکے ہیں جو عربوں اور غیر عربوں میں محض مساوات اور برابری کے قائل تھے۔ ان کے بعد ایسے لوگوں کو بھی ہم نے دیکھا ہے جو عربوں کی تحقیر و تذلیل کر کے ان سے ہر فضیلت کو سلب کر لینا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہم نے دیکھے ہیں جو عربوں میں اور اسلام میں فرق کرتے ہیں وہ عربوں کا اس حیثیت سے مقابلہ کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک قوم ہیں اور اس مقابلہ میں وہ اسلام کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہتے بلکہ واضح طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام تو پوری نوعِ انسانی کا مذہب ہے۔ تنہا عربوں کا مذہب تھوڑے ہی ہے۔ اکثر وہ لوگ جنہوں نے عربوں کی مذمت کی ہے زیادہ تر اسی صنف سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ غالباً بے جا نہ ہوگا اگر ہم ابن خلدون کو بھی اس معنی میں شعوبی شمار کر لیں۔ ابن خلدون کی رائے کا خلاصہ عربوں کے بارہ میں ہم "فجر الاسلام" کے جزو اوّل میں نقل کر چکے ہیں[2]۔ ابن خلدون کی وہ رائے عربوں اور ان کی خصوصیات کے خلاف

---

[1] ملاحظہ ہو مقریزی صفحہ ۷۹ - ۸۰ جلد ۱ ❖ [2] فجر الاسلام صفحہ ۳۶ ❖

نہایت ہی سخت اور شدید ہے۔ ہم نے بہت کم کسی شعوبی کو دیکھا ہوگا جس نے اشاروں کنایوں میں وہ باتیں کہی ہوں جو ابن خلدون کھلم کھلا اور صراحتاً کہہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ ابن خلدون سچے مسلمان تھے اور حدود دین میں رہتے ہوئے آزادیٔ فکر کے قائل تھے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے لوگ بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں جو اس ضمن میں عربوں اور اسلام کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ چنانچہ عربوں کی ناپسندیدگی ان میں اتنی شدت سے پائی جاتی ہے کہ وہ ہر اس چیز کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں جس کا کچھ بھی عربوں سے تعلق ہو۔ انہی چیزوں میں سے دین بھی ہے۔ جاحظ نے اس قسم کے لوگوں کے متعلق بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ "بسا اوقات عداوت تعصب کی بناء پر ہوتی ہے۔ عموماً وہ لوگ جنھیں اسلام میں شبہات پیدا ہوئے ان کے یہ شبہات عموماً شعوبیت کی راہ ہی سے آئے تھے۔ جب کوئی آدمی کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے تو اس کی ہر بات ہی اسے ناپسند ہونے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زبان کو ناپسند کرتا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اس جزیرہ نما کو پسند کرے جس کی یہ زبان ہے۔ حالات ایسے آدمیوں کو ایک کیفیت سے دوسری کیفیت تک پہنچاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اسلام سے بالکل ہی نکل جاتا ہے۔ کیونکہ عرب ہی تو وہ لوگ تھے جو اسلام کو لے کر آئے تھے اور وہی اسلام کے پیشرو تھے۔"[1] اس بات نے کچھ لوگوں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ شعوبیت سے بیزاری ظاہر کریں کیونکہ یہ تو دراصل الحاد کا ایک دروازہ بن جاتا ہے۔

(۶) خوارج، شیعہ، اور معتزلہ کی بعض تعلیمات میں ہمیں توافق اور ہم آہنگی نظر آتی ہے چنانچہ خوارج ـــ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ـــ کی رائے میں خلیفہ کا قریشی ہونا بلکہ عربی ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کے اس رجحان کا مقصد عربی کی تحقیر اور غیر عربوں کی برتری ثابت کرنا نہیں تھا۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ اکثر خارجی خالص عرب کے لوگ تھے۔ یہ رائے انہوں نے اس وقت قائم کی تھی جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ رضی اللہ عنہما میں اختلاف پیدا ہوا، شعوبیت کا ان دنوں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ خالص اجتہاد سے انہوں نے یہ رائے قائم کی تھی جس کا داعی محض مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کا شوق تھا اور بس! رہ گئے معتزلہ تو مسعودی نے بیان کیا ہے کہ متکلمین کی ایک جماعت، جن میں ضرار بن عمرو، ثمامہ بن اشرس، اور عمرو بن عثمان جاحظ بھی شامل ہیں، کا خیال ہے کہ نبطی لوگ عربوں سے بہتر ہیں۔ یہ تینوں معتزلہ کے سرداروں میں سے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسعودی کی یہ رائے جس میں گولڈ زیہر بھی ان کے ہمنوا ہیں[2] ـــ غلط ہے۔

---

[1] الحیوان، صفحہ ۹۸ جلد ۷ عبارت میں ذرا سقم ہے ہم نے ذرا مختصر کر دیا ہوا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو گولڈ زیہر کی کتاب (Muhammedanische Studien) اس کتاب میں گولڈ زیہر نے شعوبیت کے مسئلہ پر ایک فصل میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ہم نے اپنی تحقیقات میں اس سے بڑا استفادہ کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کو اس بات سے مغالطہ ہوا ہے کہ ضرار اور اس کے ساتھی خلافت کے مسئلہ میں خوارج سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر صرف اتنا کہنے پہ اکتفا نہیں کرتے کہ خلافت کے لئے خلیفہ کا قریشی بلکہ عربی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ انہوں نے اس پہ اضافہ کر کے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "غیر عربی اگرچہ وہ نبطی ہی کیوں نہ ہو ایک قریشی خلیفہ سے زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اگر وہ ظلم و جور کرنے لگے تو اسے معزول کر دینا زیادہ سہل ہوگا"۔ ہمارے اس خیال کی دلیل امام نووی کا وہ بیان ہے جو انہوں نے صحیح مسلم کی شرح میں نقل کیا ہے کہ ضرار بن عمرو کے اس قول کی بیہودگی ناقابلِ التفات ہے کہ قوم نبط وغیرہ سے ایک غیر قریشی آدمی خلافت کے لئے قریشی پر مقدم ہوگا۔ کیونکہ اگر اس سے کسی ناپسندیدہ امر کا ظہور ہو تو اسے معزول کر دینا زیادہ آسان ہے[1]۔ سمجھنے والوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ ضرار اور اس کے ساتھیوں نے نبطیوں کو عربوں پر برتری دی ہے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس سے تو وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی آدمی افضل اور اشرف ہوتا ہے لیکن مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایسے آدمی کو خلیفہ بنائیں جس کی زیادہ عزت نہ ہو تاکہ اسے معزول کرنا آسان ہو سکے خصوصیت کے ساتھ نبطی کا تذکرہ انہوں نے اس لئے کیا ہے کہ نبطی آدمی کمینگی میں ضرب المثل مانے جاتے ہیں۔ اور جاحظ کو تو خاص طور پر شعوبی شمار کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ جاحظ نے تو شمشیر برہنہ ہو کر اپنی کتاب "البیان والتبیین" میں شعوبیت کے مطاعن کا رد کیا ہے۔ اور ان لوگوں کی رائے کی بیہودگی اس انداز سے ثابت کی ہے جس سے ان کا خلوص ٹپکتا ہے — یہ ضرور ہے کہ انہوں نے مَوالی کی فضیلت اور ان کے مناقب کے بیان میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے لیکن اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ خود مَوالی ہی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ امام جاحظ نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے یہ رسالہ معتصم کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا جس نے ترکوں کو جمع کر لیا تھا۔ جاحظ نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ رسالہ اس لئے نہیں لکھا کہ فوج کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ پہ برتری دیں۔

افواجِ خلافت ان دنوں پانچ اصناف پہ مشتمل تھیں۔ خراسانی، ترکی، غلام، عربی، دولتِ عباسیہ کے داعیوں کی اولاد — بلکہ اس لئے تصنیف کیا ہے کہ اگر ان کے دلوں میں اختلافات موجود ہوں تو ان میں یک جہتی اور دل جمعی پیدا کی جائے۔ اور اگر ان کے دلوں میں اتحاد و اتفاق ہو تو اس یگانگت میں مزید اضافہ کیا جا سکے[2]۔ اس رسالہ کی تصنیف کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ منافقین کی دسیسہ کاریوں سے انہیں آگاہ کر دیا جائے جو وہ فوج کے سینوں میں اختلافات کی آگ بھڑکانے اور دلوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے کرتے رہتے ہیں"۔ امام جاحظ کہتے ہیں کہ "اگر ترکوں کے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۶۵ جلد ۴ ۔ [2] رسائل جاحظ صفحہ ۱۷ ۔

مناقب کا تذکرہ اس کے بغیر ممکن نہ ہو کہ باقی فوجوں کی برائیاں بیان کی جائیں تو پھر ان باتوں کا تذکرہ چھوڑ دینا ہی بہتر اور اس کتاب کی تصنیف سے احتراز کرنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔"[1] بہرحال جاحظ نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ "بغیر اس کے کہ کسی غیر ترکی کی مذمت کی جائے وہ ترکوں کے مناقب بیان کرنے کی کوشش کریں گے"۔ اگرچہ وہ اپنے قلم پہ پورا قابو نہیں رکھ سکے اور بعض اوقات ایک منہ زور گھوڑے کی طرح ان کا قلم بعض معاملات میں ترکوں کو دوسری فوجوں پر برتری دے گیا ہے لیکن اتنی سی بات کو شعوبیت میں شمار کر لینا بھی تو بڑا ہی دشوار ہے۔

علاوہ ازیں ہماری نظر میں امام جاحظ جب کسی چیز کی تعریف یا مذمت کرتے ہیں تو وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ کسی بڑے آدمی کے دعوے کا جواب دینے کے لئے بھی چیزوں کی تعریف یا مذمت کر دیتے ہیں۔ یا بعض مرتبہ وہ کسی چیز کی دو مختلف اور متضاد صورتوں میں تصویر کشی کر کے اپنی قدرت بیان کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان قرائن پر ہم اعتماد کر سکیں تو کتاب البیان و التبیین میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ جاتی جسے خود امام جاحظ کی رائے قرار دیا جا سکے۔ اس لئے ہمارے نزدیک یہی ملئے راجح ہے کہ امام جاحظ شعوبی نہیں تھے۔

(۷) ابن قتیبہ اس طرف گئے ہیں کہ جن لوگوں نے شعوبیت کو اختیار کیا تھا وہ کمینے اور نچلے طبقہ کے لوگ تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "اس شعوبیت میں، میں نے کمینوں، کھوکھلے لوگوں نبطی اوباشوں اور دیہاتی مزدور پیشہ لوگوں سے زیادہ کسی کو اتنا زیادہ راسخ العداوة اور عربوں کا شدید دشمن نہیں پایا۔ رہ گئے عجمی اشراف اور بلند مرتبہ لوگ نیز ان کے متدین طبقہ کے آدمی تو وہ عربوں کی فضیلت کو مانتے اور ان کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ شرافت کا بڑی حد تک نسب سے بھی تعلق ہوتا ہے۔" لیکن ظاہر ہے کہ ابن قتیبہ صرف ان لوگوں کو بیان کر رہے ہیں جو علی الاعلان شعوبیت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ لوگ واقعی ابن قتیبہ کے بیان کے مطابق نچلے طبقہ کے لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ رہ گئے ان کے اشراف تو ان کی حرکات زیادہ تر در پردہ اور مخفی ہوا کرتی تھیں۔ اپنے بلند مرتبہ مناصب کی وجہ سے ان میں اظہار کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ انہیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خلیفہ کی بارگاہ میں ان کی وفاداری مشکوک نہ سمجھی جائے۔ لہٰذا یہ لوگ —— پردے کے پیچھے سے —— اس قسم کی تحریکات کی تائید کیا کرتے تھے۔ جو ابن قتیبہ جیسے لوگوں کو نظر نہیں آ سکتی تھیں۔ ابن قتیبہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ شعوبیت کا مسلک اختیار کرنے والوں میں سے "ایسے لوگ بھی تھے جو ادب کے زیور سے آراستہ ہو کر اشراف کی مجلسوں میں بیٹھنے لگے تھے اور دفتری ذمہ داریوں کو سنبھال کر سلطان کے مقرب بن گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے دماغوں میں اپنے

---

[1] رسائل جاحظ صفحہ ۲۲ +

آداب و رسوم کی عصبیت اور اپنی قدر و منزلت کی برتری سما گئی۔ کیونکہ یہ لوگ بد اصل اور خبیث باطن تھے۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی نکلے جنہوں نے اپنی نسبت اشراف عجم کے ساتھ کی اور اپنے نسب عجمی بادشاہوں اور نوابوں سے ملائے۔ اس طرح وہ ایک ایسے فراخ دروازہ میں داخل ہو گئے جس پر کوئی پردہ ہی نہیں تھا اور ایک ایسے وسیع خاندان میں گھس گئے جس سے انہیں نکالنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی طینت اور کمینگی ہی پر قائم رہے اور اپنی کمینگی کا یوں مظاہرہ کرنے لگے کہ سارے عجمیوں کی شرافت اور برتری کے دعویدار بن بیٹھے تاکہ وہ خود بھی شریف کہے جا سکیں۔ عربوں کی تنقیص کر کے ان کے ساتھ اپنے بغض کا اظہار کرنے، انہیں گالیاں دینے میں اپنی تمام کوششیں صرف کرنے، اُن کی بُرائیاں گنانے، ان کے مناقب میں تحریف کرنے ہی میں سکون محسوس کرتے تھے۔ عربوں کی زبان میں بولتے تھے مگر ان کی بلند حوصلگیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے آداب سے مسلح ہو کر ان کے خلاف ہی حملے کرتے تھے۔ اگر عربوں کی کوئی بھلائی انہیں نظر بھی آتی تھی تو اسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر وہ ظاہر ہی ہو جاتی تھی تو اسے حقیر بنانے کی سعی کرتے تھے۔ اور اگر تاویلوں سے کام بن سکتا ہو تو توڑ مروڑ کر بدترین صورت میں اسے پیش کرتے تھے۔ اگر عربوں کی کوئی بُرائی اُن کے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو اسے چار دانگ عالم میں پھیلاتے تھے۔ اگر کوئی بُرائی نظر نہیں آتی تھی تو خود اپنی طرف سے گھڑنے کی کوشش کرتے تھے[1]۔

واقعہ یہ ہے کہ شعوبیت تنہا نچلے طبقہ کے لوگوں ہی میں نہیں تھی کمینہ لوگوں کے ہاتھ میں ہی اس کی باگیں نہیں تھیں بلکہ ان کے ساتھ بہت سے تعلیم یافتہ اور اونچے طبقہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ اگرچہ نسبی اعتبار سے ان کے خاندان بادشاہوں اور اشراف تک نہ بھی پہنچتے ہوں یہی وہ لوگ تھے جن کے ادب اور علم میں شعوبیت کے اثرات نمایاں تھے ــــ جیسا کہ آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے ــــ ان کے اور ان کے پیچھے پس پردہ وہ لوگ تھے جو حکومت میں بلند تر منصبوں پر فائز تھے۔ وہ اپنے رتبہ اور مال سے درپردہ ان کی مدد کرتے تھے۔ عِلّان شعوبی نے عربوں کی بُرائیوں پر ایک کتاب تصنیف کی تو طاہر ابن الحسین نے اسے تیس ہزار درہم انعام میں دیئے۔

چونکہ یہ عقلاء اور رمکار ہی دراصل اس تحریک کے علمبردار تھے اس لئے ان کی جنگ ظاہری بغاوتوں سے زیادہ علمی، ادبی اور دینی رنگوں میں لڑی جاتی رہی۔

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

تیسری صدی ہجری میں تحریک اپنے اوج کمال پر پہنچ چکی تھی۔ اس بات نے ان کی اور بھی مدد کی کہ خلفائے بنو عباس

---

[1] کتاب العرب من رسائل البلغاء صفحہ ۲۷۰

ہیں اسلام کے لئے تو تعصب تھا۔ مگر عربیت کے لئے کچھ زیادہ تعصب نہیں تھا ـــ انہوں نے زندقہ کا تو مقابلہ کیا مگر ـــ سختی کے ساتھ ـــ اس عجمی رجحان کا مقابلہ نہیں کیا ـــ اور یہ بات ایک حد تک طبعی بھی تھی۔ کیونکہ زیادہ تر خلفائے عباسی ـــ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ـــ عجمی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ عربوں کو ان کے عہد میں بڑی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وزراء زیادہ تر عجمی لوگ ہوتے تھے۔ محلات شاہی میں عربی اثرات کو کم کرنے کے لئے برابر سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ عرب کے لوگ جب جزیرہ نمائے عرب یا اس کے اطراف میں کوئی شورش کرتے تھے تو عجمی کمانڈر اور عجمی افواج انہیں سخت ترین سزائیں دیتی تھیں۔ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ شعور کروٹیں لیتا تھا کہ وہ آج ان سے قادسیہ کی جنگ کا انتقام لے رہے ہیں۔ ترکی افواج کا شعور بھی جنہیں معتصم نے جمع کیا تھا ایرانی افواج کے شعور سے کچھ بہتر نہیں تھا۔ اس صدی ہجری اور اس کے بعد کی صدی میں بکثرت اشعار ان عجمیوں کے ملیں گے جنہوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی۔ اور وہ اپنے نسب پر فخر اور اپنی قوم پہ ناز کرتے تھے۔ اس کی ابتدا ـــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں بشار ابن برد نے کی اور مشہور شاعر دیک الجن نے اس کی پیروی کی۔ اغانی میں ہے کہ "دیک الجن عربوں کے خلاف عصبیت اور جوانمردی کے اظہار میں نہایت ہی سخت تھا۔ وہ

لٹریچر پر اہل شعوبیت کے اثرات

کہا کرتا تھا کہ عربوں کو ہم پہ کون سی فوقیت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد وہ بھی ہیں اور ہم بھی ہیں جیسے وہ اسلام لائے ہم بھی اسلام لائے۔ ان میں سے اگر کوئی ہمارے آدمی کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے بدلہ میں اسے بھی قتل ہونا پڑتا ہے۔ خداوند تعالے نے اپنی کتاب میں کہیں بھی انہیں ہم پہ کوئی فضیلت نہیں دی۔ کیونکہ دین میں ہم اور وہ دونوں یکساں شریک رہیں"۔

ان کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

فَلَسْتَ بِتَارِكٍ إِيْوَانَ كِسْرٰى
لِتُوْضَحَ اَوْ لِحَوْمَلَ فَالدَّخُوْلِ
وَضَبٍّ فِى الْفَلَاةِ سَاعٍ، وَذِئْبٍ
بِهَا يَعْوِيْ وَ لَيْثٍ وَسْطَ غِيْلِ

میں توضح، حومل یا دخول مقامات کی خاطر اور چٹیل میدان میں دوڑنے والی گوہ، وہاں بھونکنے والے بھیڑیے اور هولناک بیابانی کے درمیان رہنے والے شیر کی وجہ سے ایوان کسریٰ کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

مشہور شاعر "خریمی" بکثرت اپنے اشعار میں اپنے ایرانی نسب پر فخر کرتا اور عربوں کی تنقیص و تحقیر کرتا تھا چنانچہ وہ کہتا ہے

؎ اِنِّیْ امْرُؤٌ مِنْ سَرَاةِ الصُّغْدِ الْبَسَنِیْ

عِراقُ الاعاجم، جلد ۱ مکتبۃ الخدیو

میں سغد کے سرداروں میں سے ایک سردار ہوں عجمیوں کے خون نے مجھے ایسی جمرّی عطا کی ہے جس سے معطر خوشبو نکلتی ہے

خزیمی کہتا ہے ؎

أَبا الصُّغْدِ بَأْسٌ إِذْ تُعَيِّرُنِي جُمْلُ   سِفَاهًا وَمِنْ أَخْلَاقِ جَارَتِيَ الْجَهْلُ

فَإِنْ تَفْخَرِي يَا جُمْلُ أَوْ تَتَجَمَّلِي   فَلَا فَخْرَ إِلَّا فَوْقَهُ الدِّينُ وَالْعَقْلُ

أَرَى النَّاسَ شَرْعًا فِي الْحَيَاةِ وَلَا أَرَى   بِقَبْرٍ عَلَى قَبْرٍ عَلَاءً وَلَا فَضْلُ

وَمَا ضَرَّنِي أَنْ لَمْ تَلِدْنِي يُحَابِرٌ   وَلَمْ تَشْتَمِلْ جَرْمٌ عَلَيَّ وَلَا عُكْلُ

إِذَا أَنْتِ لَمْ تَحْمِي الْقَدِيمَ بِحَادِثٍ   مِنَ الْمَجْدِ لَمْ يَنْفَعْكِ مَا كَانَ مِنْ قَبْلُ

خاندانِ صُغد پر کیا مضائقہ ہے جب کہ اونٹ (یعنی عرب کے لوگ) مجھے اپنی حماقت سے عار دلائیں اور میری پڑوسن کی تو عادت ہی جہالت ہے۔ اے اونٹنی! اگر تو فخر کرے یا بناؤ سنگار کرے تو فخر کی ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے اوپر دین اور عقل کے تقاضے موجود نہ ہوں۔ زندگی میں تو میں سب لوگوں کو برابر دیکھتا ہوں اور مرنے کے بعد ایک قبر کو دوسری قبر پر کوئی بلندی اور فضیلت نہیں ہوتی۔ مجھے اس سے کیا نقصان ہے، اگر مجھے قبیلۂ یحابر نے نہیں جنا اور قبیلۂ جرم اور عکل مجھ پر مشتمل نہیں ہوا اگر تو نئے شرف کے ساتھ پرانے شرف کی حفاظت نہ کر سکے تو جو کچھ شرف تجھے پہلے حاصل رہا ہے وہ تجھے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔

خزیمی ہی کہتا ہے ؎

وَنَادَيْتُ مِنْ مَرْوٍ وَبَلْخٍ فَوَارِسًا   لَهُمْ حَسَبٌ فِي الْأَكْرَمِينَ حَسِيبُ

فَيَا حَسْرَتَا لَا دَارَ قَوْمِي قَرِيبَةٌ   فَيَكْثُرُ مِنْهُمْ نَاصِرِي وَيَطِيبُ

وَإِنَّ أَبِي سَاسَانُ كِسْرَى بْنُ هُرْمُزٍ   وَخَاقَانُ لِي لَوْ تَعْلَمِينَ نَسِيبُ

مَلَكْنَا رِقَابَ النَّاسِ فِي الشِّرْكِ كُلَّهُمْ   لَنَا تَابِعٌ طَوْعُ الْقِيَادِ جَنِيبُ

نَسُومُهُمُ خَسْفًا وَنَقْضِي عَلَيْهِمُ   بِمَا شَاءَ مِنَّا مُخْطِئٌ وَمُصِيبُ

فَلَمَّا أَتَى الْإِسْلَامُ وَانْشَرَحَتْ لَهُ   صُدُورٌ بِهِ نَحْوَ الْإِلَهِ تُنِيبُ

تَبِعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ حَتّٰى كَأَنَّمَا

سَمَاءٌ عَلَيْنَا بِالرِّجَالِ تَصُوبُ

میں نے مرو اور بلخ کے ان شہسواروں کو پکارا جن کا اپنا حسب و نسب ہے اور جو شریف لوگوں میں صاحب حسب شمار کئے جاتے ہیں۔ ہائے افسوس! میری قوم کا وطن قریب نہیں ہے کہ ان میں سے میرے مددگار بکثرت اور بخوشی نکل آتے۔ میرا باپ ساسان کسریٰ ابن ہرمز ہے اور خاقان بھی میرا ہی ہے اگر تمہیں معلوم ہو تو وہ بڑا صاحب نسب بزرگ تھا۔ زمانۂ شرک میں ہم لوگوں کی گردنوں کے مالک تھے۔ لوگ مطیع و فرمانبردار ہو کر ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے چلتے تھے۔ ہم تمہیں ملک یمن میں گاڑ دیا کرتے تھے اور تمہارے خلاف ہم میں سے خطا کار اور راست کار جو چاہتے تھے فیصلے کر دیا کرتے تھے۔ جب اسلام آ گیا اور سینے اس کے لئے کھل گئے اور وہ لوگوں کی طرف مڑنے لگے۔ تو ہم نے رسول اللہ کی پیروی اختیار کر لی حتیٰ کہ حالت یہ ہو گئی کہ گویا آسمان سے ہم پر لوگ اتر رہے تھے۔

نیز متوکلی شاعر کہتا ہے: یہ خلیفہ متوکل کے ندیموں میں سے تھا ۔

أَنَا ابْنُ الْأَكَارِمِ مِنْ نَسْلِ جَمّ وَحَائِزُ إِرْثِ مُلُوكِ الْعَجَمْ

وَمُحْيِي الَّذِي بَادَ مِنْ عِزِّهِمْ وَعَفَّى عَلَيْهِ طِوَالُ الْقِدَمْ

وَطَالِبُ أَوْتَارِهِمْ جَهْرَةً فَمَنْ نَامَ عَنْ حَقِّهِمْ لَمْ أَنَمْ

مَعِي عَلَمُ الْكَابِيَانِ الَّذِي بِهِ أَرْتَجِي أَنْ أَسُودَ الْأُمَمْ

فَقُلْ لِبَنِي هَاشِمٍ أَجْمَعِينَ هَلُمُّوا إِلَى الْخَلْعِ قَبْلَ النَّدَمْ

مَلَكْنَاكُمُ عَنْوَةً بِالرِّمَا حِ طَعْنًا وَضَرْبًا بِسَيْفٍ خَذِمْ

وَأَوْلَاكُمُ الْمُلْكَ آبَاؤُنَا فَمَا إِنْ وَفَيْتُمْ بِشُكْرِ النِّعَمْ

فَعُودُوا إِلَى أَرْضِكُمْ بِالْحِجَازِ لِأَكْلِ الضِّبَابِ وَرَعْيِ الْغَنَمْ

فَإِنِّي سَأَعْلُو سَرِيرَ الْمُلُوكِ بِحَدِّ الْحُسَامِ وَحَرْفِ الْقَلَمْ

میں جمشید کی نسل سے شرفاء کی اولاد ہوں اور شاہان عجم کی وراثت کو حاصل کرنے والا ہوں۔ اور جو لوگ ختم ہو چکے ہیں اور جن کو طویل قدامت نے مٹا دیا ہے ان کی عزت کو دوبارہ زندگی بخشنے والا ہوں میں علی الاعلان ان کی قوت کا طلبگار ہوں۔ جو کوئی ان کے حق سے سو گیا ہو وہ سو گیا ہو، میں تو کبھی نہیں سویا۔ میرے پاس علم کاویانی ہے جس سے مجھے توقع ہے کہ میں قوموں کی سیادت کر سکوں گا۔ تمام بنو ہاشم سے کہہ دو کہ اس سے پہلے کہ انہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے رضاکارانہ

طور پر وہ خود ہی معزول ہو جائیں ہم طاقت کے بل پر تمہارے حاکم رہ چکے ہیں۔ نیزوں کی مار اور تیز کاٹنے والی تلواروں کے ذریعہ سے۔ ہمارے آباؤ اجداد حکومت کے زیادہ حق دار تھے۔ تم نے نعمتوں کا شکریہ پورا پورا ادا نہیں کیا۔ تم حجاز میں اپنی سرزمین کی طرف جاؤ تاکہ وہاں جاکر گوہیں کھا سکو اور بکریاں چرا سکو۔ کیوں کہ میں تلوار کی دھار اور نوک قلم کے ذریعہ سے شہنشاہوں کے تخت پر اب چڑھنے والا ہوں۔

عربوں نے ان لوگوں کے مؤقف کی خطرناکی کو محسوس کر لیا تھا۔ مگر ان میں یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ اس آنے والے شر کو اپنے سے دُور کر سکیں۔ اس زمانہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے اکثر اشعار میں حسرت و الم کی پرچھائیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار ہم پچھلی فصل میں نقل کر چکے ہیں۔ آگے چل کر یہی رجحان واضح طور پر ہمیں متنبّی کے ہاں ملتا ہے۔ ایران میں — درّۂ بُوّان کو دیکھ کر — وہ نہایت رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے کہ وہاں عربی زبان کس قدر کمزور ہے۔

مُلَاعِبُ جِنَّةٍ لَوْ سَارَ فِيهَا ۔ سُلَيْمَانُ لَسَارَ بِتَرْجُمَانِ

جنات کے ساتھ کھیلنے والا سلیمانؑ بھی اگر وہاں جائے تو یقیناً ترجمان کو ساتھ لے کر جائیگا

اور کہتا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْفَتَى الْعَرَبِيَّ فِيهَا ۔ غَرِيبُ الْوَجْهِ وَالْيَدِ وَاللِّسَانِ

لیکن وہاں عربی نوجوان کس قدر چہرہ، ہاتھ اور زبان کے اعتبار سے اجنبی اور غریب ہے۔

متنبّی ہی اپنے ایک دوسرے قصیدہ میں کہتا ہے ؎

وَإِنَّمَا النَّاسُ بِالْمُلُوكِ وَمَا ۔ تُفْلِحُ عُرْبٌ مُلُوكُهَا عَجَمُ

لَا أَدَبٌ عِنْدَهُمْ وَلَا حَسَبٌ ۔ وَلَا عُهُودٌ لَهُمْ وَلَا ذِمَمُ

بِكُلِّ أَرْضٍ وَطِئْتُهَا أُمَمٌ ۔ تُرْعَى بِعَبْدٍ كَأَنَّهَا غَنَمُ

يَسْتَخْشِنُ الْخَزَّ حِينَ يَلْمَسُهُ ۔ وَكَانَ يُبْرَى بِظُفْرِهِ الْقَلَمُ

لوگ اپنے بادشاہوں کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ وہ عربی لوگ کب فلاح پا سکتے جن کے بادشاہ عجمی ہوں۔ نہ ان کے پاس ادب ہے نہ حسب ہے۔ نہ عہدوں اور معاہدوں کی ذمہ داری کا

کچھ پاس ہے۔ ہر سرزمین میں جہاں بھی تم جاؤ ایسی قومیں ملیں گی جن پہ غلام حکومت کر رہے ہوں گے گویا کہ وہ قومیں محض بکریاں ہیں۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ ریشم کو بھی چھوتے ہیں تو وہ انہیں سخت اور کھردرا نظر آتا ہے۔ حالانکہ کبھی ان کے ناخنوں سے قلم بنائے جایا کرتے تھے۔

شعوبیت کی مختلف صورتیں جن کے ساتھ اس نے عربوں سے جنگ کی

اب ہم وہ مختلف صورتیں

بیان کرتے ہیں جن کے ساتھ اس شعوبیت نے عربوں کے خلاف جنگ کی:

انہوں نے سب سے پہلے عربوں کی اس برتری کو لیا جس پہ انہیں بڑا فخر اور بڑا ناز تھا۔ یہ چیز عربوں کی بلاغت، قوت خطابت اور بدیہہ گوئی کی خصوصیات تھیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مختلف جہات سے ان کی تنقیص کرنا شروع کی۔

عرب کے لوگ جب خطبہ دیتے تھے تو اکثر ہاتھوں سے اشارے کرتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے مقاصد کی تصویر کشی کرتے اور مضمون کی توضیح میں ان اشارات سے مدد لیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سننے والوں پہ اس طرح اثر اندازی میں قوت آجاتی ہے۔ زیادہ تر اپنے اشارات میں وہ اس چیز سے کام لیتے تھے جو ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ (عصا، ہتھوڑا، گرز یا درخت کی کوئی شاخ) صلح کے خطبوں میں وہ زیادہ تر ان چیزوں سے اشارہ کرتے تھے اور جنگ کے خطبوں میں وہ عموماً کمانیں استعمال کرتے تھے۔ اکثر خطبوں کے دوران وہ اپنی کمانوں پہ ٹیک لگا لیا کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ خطبہ دینے کے لئے وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہن لیتے تھے۔ چنانچہ ایک خاص ہیئت کے ساتھ عمامہ سر پہ رکھ لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خطبہ دینے کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔ شعوبیت پیدا ہوئی تو اس نے ان باتوں کا استہزاء اور مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے "بات اور لاٹھی میں کیا جوڑ اور خطبہ اور کمان میں کیا تک ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو عقل کو کسی اور طرف لگا دیتیں، دلوں کو کسی اور بات کی طرف موڑ دیتی اور ذہن کو پراگندہ کر دیتی ہیں۔ لاٹھی یا کمان اٹھانے سے ذہن میں کچھ جلا تھوڑے ہی ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ اشارہ کرنے سے الفاظ تو کھنچے چلے نہیں آتے۔ گویوں کا بیان ہے کہ جب کوئی مغنی خود ہی ساز بجاتا ہے تو اس کے گانے میں وہ زور نہیں رہتا جو اس مغنی کے گانے میں ہوتا ہے

جو اپنے ہاتھ سے ساز نہ بجا رہا ہو۔ لاٹھیاں لے کر چلنا تو کسانوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ چیزیں سخت دل اعرابیوں اور سنگ دل بدوؤں کو ہی زیادہ زیب دیتی ہیں جو راستوں پر اپنے اونٹوں کو اِدھر اُدھر منتشر ہونے سے روکنے میں ہر وقت لگے رہتے ہیں۔[1]" جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں ان لوگوں کا جواب دیا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک مستقل باب الگ رکھا ہے جس کا نام کتاب العصا ہے۔ ان لوگوں نے خطابت وغیرہ کے طریقوں ہی پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ خود نفسِ خطابت وغیرہ پر بھی عیب چینیاں کی ہیں۔ چناں چہ وہ کہتے تھے:" خطابت کوئی ایسا امتیاز تو نہیں ہے جس میں صرف تم ہی امتیازی درجہ رکھتے ہو۔ یہ چیز تو ساری قوموں میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ حبشی لوگ بھی باوجود اپنی غباوت اور فسادِ مزاج کے طویل سے طویل خطبے دے لیتے ہیں۔ بہترین خطیب ایرانی ہوتے ہیں نہ کہ عرب۔ خطبوں سے زیادہ ایرانیوں کے ہاں صنعت بلاغت اور غریب الفاظ سے متعلق تصنیفات تک موجود ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب "کارروند" ملاحظہ ہو۔ جس کسی کو عقل، ادب، مراتب کا علم، عبرتوں، تمثیلوں، نرم و نازک الفاظ اور لطیف معانی درکار ہوں تو اسے بادشاہوں کی سیرتوں (ملوک الفرس) کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تمہارے مضامین، حکمتیں، خطبے اور طرزِ فکر اس کا پاسنگ بھی نہیں جو ایرانیوں، یونانیوں اور ہندوستانیوں کے ہاں مل سکتا ہے۔ تمہاری درشت اور تلخ باتوں، بھدی اور موٹی آوازوں میں (کیوں کہ تمہیں زیادہ تر اونٹوں کے ساتھ مخاطبت کی عادت رہی ہے) وہ دقیق مضامین، نرم و نازک الفاظ، باریک اور سریلی آوازیں کہاں جو ان اقوام میں ہمیں ملتی ہیں"۔[2] جاحظ نے ایرانیوں اور رومیوں کی بلاغت اور عربوں کی بلاغت میں مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کی بلاغت فکر اور تدبر کا نتیجہ ہوتی ہے اور عربوں کی بلاغت بدیہہ گوئی اور تیزیٔ ذہن کا شاہکار ہوتی ہے۔

اسی طرح انہوں نے عربوں کے آلاتِ جنگ پر بھی نکتہ چینیاں کیں اور ان کے نیزوں، ان کے ننگی پیٹھ والے گھوڑوں اور ان کے ٹھوس گرزوں کا مذاق اڑایا، حالانکہ کھوکھلے گرزوں کا اُٹھانا بھی آسان ہوتا ہے اور اُن کی مار بھی سخت ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ان کی فوجی تنظیم سے ناواقفیت کا بھی مذاق اڑایا کہ انہیں اس کا بھی پتہ نہیں تھا کہ میمنہ، میسرہ اور قلب اور جناح کسے کہتے ہیں۔ آلاتِ جنگ میں سے انہیں

---

[1] البیان والتبیین صفحہ ۲ جلد ۳۔ [2] البیان والتبیین۔

عرّادہ اور منجنیق تک کی خبر نہیں تھی۔ انہوں نے عربی افواج اور ایرانی افواج کا تنظیمی معاملات اور آلاتِ جنگ میں موازنہ کر کے بتایا کہ عربی افواج نہایت ہی حقیر اور ایرانی افواج نہایت شان دار ہوتی تھیں۔ مگر شعوبیت کو شاید اس کا احساس نہیں رہا کہ اس موازنہ اور مقابلہ سے خود ان کی ذلت اور کمینگی ہی کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اِن عربوں نے اپنے اُن سادہ اور حقیر ہتھیاروں کے ساتھ ہی ایرانیوں کو ان کے شان دار اور بڑے بڑے آلاتِ جنگ اور منظم اور کثیر افواج کے باوجود پیس کر رکھ دیا تھا[۱]۔

شعوبیت کی ان راہوں میں سے ایک دوسری قسم بھی تھی۔ اور وہ قسم یہ تھی کہ اس عہد میں انہوں نے اہلِ عجم کے مناقب میں بکثرت کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ سعید بن حمید بختکان ــــ جو میر منشی ہونے کے علاوہ شیریں الفاظ اور پُرگو شاعر بھی تھا۔ اس کا دعوٰے تھا کہ وہ ایرانی بادشاہوں کی اولاد میں سے ہے۔ اسے عربوں کے خلاف شدید قسم کا تعصب تھا ــــ اس نے "انتصاف العجم من العرب" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ نیز ایک دوسری کتاب "فضل العجم علی العرب وافتخارها" کے نام سے تصنیف کی تھی[۲]۔ ابن الندیم نے اس کی ایک تیسری کتاب کا تذکرہ بھی کیا ہے جس کا نام انہوں نے "مفاخر العجم" بتایا ہے[۳]۔ اس کے بالمقابل عربوں کی بُرائیوں میں بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں۔ مثلاً ہیثم ابن عدی ــــ جو تاریخ اور روایات کے مشہور ترین علماء میں سے ہے، منصور، مہدی، ہادی اور رشید کا ہم نشین رہا ہے ــــ عربوں کی بُرائیوں کے بیان میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سے "کتاب المثالب الصغیر"، "کتاب المثالب الکبیر" اور "کتاب مثالب ربیعہ" اور "اسماء بغایا قریش فی الجاهلیه واسماء من ولدن" اور اسی سلسلہ کی پانچویں کتاب "کتاب من تزوج من الموالی فی العرب" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں[۴]۔ ایسے ہی "بیت الحکمۃ" والے سہل بن ہارون کے متعلق بھی ابن ندیم نے بیان کیا ہے کہ وہ صاحبِ حکمت، اور نہایت فصیح شاعر تھے۔ ایرانی الاصل اور مسلک کے اعتبار سے شعوبی تھے۔ عربوں کے خلاف انہیں شدید تعصب تھا، اس موضوع پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں[۵]۔ انہوں نے بخل کے بارہ میں اپنا ایک مشہور رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ بھی وہی شعوبیت کا رجحان تھا

---

[۱] اس سلسلہ میں کتاب البیان والتبیین کی تیسری جلد ملاحظہ فرمائیے۔ [۲] فہرست ابن الندیم۔ صفحہ ۱۲۳۔
[۳] الفہرست صفحہ ۲۴۴۔ [۴] الفہرست صفحہ ۹۹-۱۰۰۔ [۵] الفہرست صفحہ ۱۲۰۔

کیوں کہ عرب کے لوگ کرم اور سخاوت کی بڑی تعریفیں کرتے اور اسے اپنے بہترین فضائل میں شمار کرتے تھے جیسا کہ ایرانی لوگ بخل میں بہت زیادہ مشہور تھے۔ سہل نے یہ رسالہ تصنیف کرکے سخاوت اور بخل کی قیمت میں تبدیلی کرنی چاہی ہے۔ چنانچہ اس نے کرم اور سخاوت کو ایک بُرائی ثابت کیا ہے اور بخل کو ایک بڑی فضیلت۔ "زہرالاداب" کے مصنف نے ان صاحب کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں جن سے ان کی شعوبیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان اشعار میں وہ اپنی ایرانیت پر فخر کرتا اور عربیت کی مذمت کرتا ہے۔ اور وہ میسان میں اپنے گھر کا مقابلہ ایک دوسرے عربی گھر سے کرتا ہے اور کہتا ہے۔

أَتَجْعَلُ بَيْتَنَا ذَا رَابِيَةٍ فَرَعَ النُّجُومَ كَأَنَّهُ نَجْمُ

كُبَيْبِيتِ شَعْرٍ وَسْطَ مَجْهَلَةٍ بِفِنَائِهِ الْجِعْلَانُ وَالْبُهْمُ

کیا تُو نے اس گھر کو جو ایک اونچے ٹیلہ پر ہو، جس کے کنگورے ستاروں سے سرگوشیاں کر رہے ہوں اور وہ خود بھی ایک ستارہ معلوم ہوتا ہے اس اونی خیمہ کے برابر کر دیا ہے جو کسی جہالت کدہ کے وسط میں کھڑا ہو اور جس کے صحن میں بکریوں کے چھوٹے چھوٹے کالے کیڑے بچے دوڑ رہے ہوں

علّان شعوبی نے بھی ـــــ یہ بھی اصل کے اعتبار سے ایرانی ہے ـــــ ایک کتاب "المیدان فی المثالب" کے نام سے تصنیف کی تھی۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں عربوں کی بڑی توہین کی ہے اور ان کی برائیاں گنائی ہیں۔ تیم ابن مرہ کی بھی۔ اسد بن عبدالعزیٰ کی بھی اور بنو مخزوم کی بھی۔ اس میں عرب کے سارے ہی قبیلے گنا دیئے گئے ہیں اور سب کی برائیاں بیان کر دی گئی ہیں۔[1]

اور ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ نے ـــــ یہ نحو اور اخبار عرب کے مشہور ترین علماء میں سے تھے اور ان کی اصل ایران کے یہودیوں میں سے تھی ـــــ بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں عربوں پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: "کتاب لصوص العرب (عرب کے چوروں سے متعلق کتاب)"[2] "کتاب ادعیاء العرب" "کتاب فضائل الفرس"[2]۔ ابن خلکان نے ان کے بارہ میں کہا ہے کہ وہ عربوں کو ناپسند کرتے تھے اور ان کی برائیوں میں انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں[3]۔ ابن قتیبہ نے اس طعن و تشنیع کی نوعیت کی صورت بیان کی ہے جسے ابوعبیدہ کام میں لاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابوعبیدہ نے مفاخر عرب

---

[1] الفہرست صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶ ۔ [2] الفہرست صفحہ ۵۴ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ ۔

کا بیان کیا اور ان کا مذاق اُڑایا ۔ انہوں نے بتایا کہ عرب کے لوگ حاجب کی کمان پر بڑا فخر کرتے اور اس کی وفاداری پر بڑا ہی ناز کرتے تھے ۔ اس کے بعد اس کی خود بھی ہنسی اُڑائی ۔ اور لوگوں کو بھی ہنسایا اور حاجب کے کردار کا مذاق اُڑایا ۔ بتایا کہ اس کی کمان کی لکڑی نہایت ہی ذلیل قسم کی تھی جس کی قیمت بہت ہی معمولی ہوتی ہے ۔ ایک مرتبہ کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا ۔ ؎

أَيَا ابْنَةَ عَبْدِ اللهِ، وَابْنَةَ مَالِكٍ وَيَا ابْنَةَ ذِي الْبُرْدَيْنِ وَالْفَرَسِ الْوَرْدِ

اے اللہ کے ایک بندہ کی بیٹی ! اور مالک کی بیٹی ۔ اے اس شخص کی بیٹی جس کے پاس دو چادریں تھیں اور جس کے پاس ورد نامی گھوڑا تھا ۔

چناں چہ وہ شعر کا مذاق اُڑاتا ہے اور مذاق اُڑاتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہو سکتی ہے کہ اس لڑکی کے باپ کے پاس دو چادریں تھیں اور ورد نامی ایک گھورا تھا ۔ اس کے بعد وہ اس کا مقابلہ ایران کے بادشاہوں اور ان کے تاجوں کے ساتھ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ پرویز کے اصطبل میں نو سو پچاس ہاتھی بندھے ہوئے ہوا کرتے تھے ۔ اس کی خدمت کے لئے ہر وقت ایک ہزار باندیاں پرے باندھے رہتی تھیں ۔ اس کے کمرہ میں جس سے ہو کر اندر محل میں جاتے تھے ایک ہزار برتن سونے کے سجے ہوئے تھے۔[1]

برائیوں کی ان کتابوں میں ـــــ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ ـــــ کسی قبیلہ کے کسی ایک گھرانے کی کوئی بات لے لی گئی جو قابلِ عار تھی ۔ یا کسی ایک فرد کا کوئی ایسا قابل مؤاخذہ عمل یا کوئی جرم لے لیا گیا اور اسے لے کر پورے قبیلہ کو بدنام کرنے کے لئے سارے عرب میں اس کی اچھی طرح تشہیر کر دی گئی اور ثابت کیا گیا کہ عرب کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جیسا کہ ان کتابوں میں جو ایرانیوں کے مناقب و فضائل میں لکھی گئی تھیں ایرانیوں کی کوئی اچھی عادت لے لی گئی یا ان کے بادشاہوں کی عظمت ، فوجی نظام ، ملکی سیاست کی قسم سے کوئی چیز لے لی گئی اور اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ سارے ایرانی ایسے ہوتے ہیں ۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم تک ان کتابوں میں سے ـــــ جہاں تک مجھے معلوم ہے ـــــ کوئی کتاب نہیں پہنچ سکی ۔ جیسا کہ ہم تک کوئی ایسی کتاب بھی نہیں پہنچ سکی جو خود شعوبیت کے دعوے کے بیان میں لکھی گئی ہو ۔ ہم تک ان کے چیدہ چیدہ اقوال اور خالی خالی آراء ہی پہنچ سکی ہیں ۔ ان میں سے زیادہ

---

[1] رسائل البلغاء صفحہ ۱۷۲ و مابعدہٗ ۔

اہم وہ باتیں ہیں جو امام جاحظ کی کتاب "البیان و التبیین" میں اور ابن عبد ربہ کی کتاب "العقد الفرید" میں یا ابن قتیبہ کی کتاب "العرب" میں نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔

ظاہر یہ ہے کہ ان کتابوں کے ضائع ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے شعوبیت کے اس رجحان کو اسلام کے خلاف شمار کیا۔ لہٰذا انہوں نے اس موضوع پر تصنیف شدہ کتابوں کو نقل کرنے سے احتراز برتا بلکہ ان کتابوں کو ضائع اور معدوم کر دینے ہی میں خدا کا تقرب سمجھا۔ جو لوگ مخلص تھے انہوں نے اس رجحان سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا جیسا کہ زمخشری نے اپنی کتاب "المفصّل" کے شروع ہی میں خدا کا اس پر شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کے دل میں عربوں کے لئے عصبیت پیدا کر دی اور شعوبیت کے رجحان کی طرف میلان سے محفوظ رکھا۔

لٹریچر پر اہل شعوبیت کے اثرات

ان علمائے شعوبیت نے جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے عربوں کی برائیوں پر مشتمل کتابیں تصنیف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے لٹریچر میں گھڑ گھڑا کر ایسے قصے کہانیاں بھی شامل کر دیں جو ان کے مقصد کو پورا کرنے والی تھیں۔ یہ قصے کہانیاں سرتاپا ان کی من گھڑت ہوتی تھیں۔ یہ بات ظاہری جنگ سے زیادہ عربوں کے لئے نقصان دہ تھی کیوں کہ اس کا توڑ بہت ہی دشوار تھا اور ان کے غلط ہونے پر واقف ہونا اور اس کا ثبوت بہم پہنچانا اور بھی مشکل تھا۔ اس بات کو معلوم کر لینا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں دو قسم کے طریقے اختیار کئے تھے۔ (پہلا طریقہ) تو یہ تھا کہ وہ شعراء کے اشعار اور ضرب الامثال کی شرح اور تفسیر میں نہایت ہی شنیع قسم کے قصے گھڑ دیتے تھے۔ مثلاً ابو عبیدہ نے اس ضرب المثل

جَبَانٌ مَا يَلْوِي عَلَى الصَّفِيرِ (بزدل آدمی سیٹی کی طرف مڑتا بھی نہیں)

کی شرح میں یہی کچھ کیا ہے۔ بکری نے اپنی کتاب "التنبیہ علی اوھام ابی علی القالی فی امالیہ" میں ابو عبیدہ سے ایک شرمناک حکایت نقل کی ہے جسے ہم اس کی شرمناکی کی وجہ سے بیان تک نہیں کر سکتے[1]۔

ہیثم ابن عدی نے ایک مسابقہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبیلۂ تنوخ کا ایک آدمی بنو عامر کے کسی قبیلہ میں آکر اترا۔ ایک لڑکی باہر آئی اور اس نے اس سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ قبیلۂ تمیم سے

---

[1] التنبیہ صفحہ ۷۷

اس لڑکی نے کہا کہ اچھا تم اسی تمیم سے ہو جس کی شان میں شعراء نے یہ کہہ چھوڑا ہے اور بنو تمیم کی مذمت میں کچھ اشعار پڑھ سُنائیے ۔ اس پر اس آدمی نے کہا کہ نہیں میں قبیلۂ تمیم کا آدمی نہیں ہوں، میں تو قبیلۂ عجل سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لڑکی نے قبیلۂ عجل کی مذمت میں کچھ اشعار سُنا دیئے ۔ وہ آدمی اسی طرح برابر ایک ایک قبیلہ کا نام لیتا رہا اور وہ لڑکی اس قبیلہ کی مذمت میں کچھ اشعار سُناتی رہی۔ حتّٰی کہ عرب کے سارے قبیلوں کے نام وہ لے چکا ۔ اور آخر میں جب اس نے اپنے آپ کو بنو ہاشم کے ساتھ منسوب کیا تو وہ لڑکی بولی ، تم اس آدمی کو جانتے ہو جس نے یہ اشعار کہے ہیں ؎

بَنِیْ هَاشِمٍ عُوْدُوْا اِلٰی نَخْلَاتِکُمْ ۔ فَقَدْ صَارَ هٰذَا التَّمْرُ صَاعًا بِدِرْهَمٍ

فَاِنْ قُلْتُمُوْا رَهْطُ النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ ۔ فَاِنَّ النَّصَارٰی رَهْطُ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمٍ

اے بنو ہاشم ! تم اپنے کھجوروں کے درختوں کی طرف لوٹ جاؤ ۔ اس کھجور کا بھاؤ ایک درہم میں ساڑھے تین سیر کا ہوگیا ہے ۔ اگر تم کہو کہ ہم نبیؐ یعنی محمدؐ کا قبیلہ ہیں تو نصاریٰ بھی تو عیسیٰؑ ابن مریم کا قبیلہ ہیں[1]

یہ حکایت اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ میں شعوبیت کے من گھڑت قصّوں میں سے ایک ہوں ۔ ہو سکتا ہے کہ اسے خود ہیثم ابن عدی نے ہی گھڑا ہو اور اس کا مقصد عرب کے تمام قبیلوں کی بُرائیاں بیان کرنا ہو ۔

(دوسرا طریقہ) یہ تھا کہ چیزوں کو ان لوگوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا جنہوں نے وہ نہیں کہی تھیں اس راستہ کو انہوں نے اس لئے اختیار کیا کہ عربی لٹریچر کو خراب کر کے اس کے نشانات کو مٹا دیں حتّٰی کہ عربوں کے پاس اپنا کوئی قابلِ اعتماد لٹریچر باقی نہ رہے ۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی تمنا تھی ۔ اس کی مثال میں ابو عبیدہ کا یہ قول پیش کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے مندرجہ ذیل دو شعروں کے بارہ میں کہا ہے ؎

هَیْنُوْنَ لَیْنُوْنَ اَیْسَارٌ ذَوُوْ کَرَمٍ ۔ سُوَّاسُ مَکْرُمَةٍ اَبْنَاءُ اَیْسَارٍ

اِنْ یُسْئَلُوْا الْخَیْرَ یُعْطُوْهُ وَاِنْ خُبِرُوْا ۔ فِی الْجَهْدِ اُدْرِکَ مِنْهُمْ طِیْبُ اَخْبَارٍ

نرم و نازک ، فارغ البال ، سخی ، عزت کے مالک و حاکم ، فارغ البالوں کی اولاد ہیں ۔ اگر ان سے مال مانگا جائے تو وہ مال عطا کر دیں اور اگر کسی مشقت میں ان کی آزمائش کی جائے تو ان سے اچھی اطلاعات حاصل کی جائیں ۔

ابو عبیدہ نے کہا کہ یہ دونوں شعر عزدس کلابی کے ہیں جن سے وہ بنو عمرو غنویین کی تعریف کر رہا ہے ۔ اصمعی اس کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی کلابی کسی غنوی کی مدح کرے کیوں کہ دونوں قبیلوں میں سخت عداوت تھی[2] ۔ اگر ہم اس

---

[1] یہ حکایت تفصیل کے ساتھ مسعودی کی "مروج الذہب" میں صفحہ ۱۷۵، جلد ۲ سے لیکر صفحہ ۱۸۰ جلد ۲ ۔ [2] التنبیہ صفحہ ۱۷۱/۲

زاویہ نگاہ سے عربی لٹریچر کی تحقیق کریں تو بہت سی باتیں ہمیں اس میں من گھڑت ملیں گی جس کا مقصد عربوں کا رتبہ کم کرنا اور ان کے سٹینڈرڈ کو خراب کرنا ہی تھا۔ اور یہ چیزیں اس کثرت سے ملیں گی کہ ہمارے لئے ان سب کا پتہ لگانا بھی ممکن نہیں ہوگا۔

اس عہد میں تین آدمی لغت، شعر، اور علوم عرب کے امام مانے جاتے تھے کہ نہ ان سے پہلے ان جیسے مرتبہ کا کوئی آدمی گذرا ہے نہ ان کے بعد۔ اس علم کا بڑا حصہ بلکہ کل کا کل جو آج لوگوں کے ہاتھ میں ہے تین آدمیوں ہی سے لیا گیا ہے۔ یہ تین آدمی۔ ابو زید انصاری، ابو عبیدہ اور اصمعی ہیں[1]۔ ابو زید انصاری کی شہرت غریب الفاظ اور غریب اصول گریمر کی یاد داشت سے تعلق رکھتی تھی۔ باقی دونوں میں برابر مقابلہ رہا کہ کس کی علمی ریاست کو تسلیم کیا جائے۔ ظاہر یہی ہے کہ اصمعی اپنے عربی ہونے کی وجہ سے عربوں کے لئے تعصب رکھتے تھے، اور روایات میں بڑے ہی متشدد تھے۔ صحیح ترین لغات کے علاوہ واہی تباہی باتوں کو نقل کرنا جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن اور حدیث کے بارہ میں ان سے کچھ پوچھا جاتا تو وہ اس اندیشہ کے تحت جواب نہیں دیا کرتے تھے کہ کہیں ان سے کوئی غلطی نہ ہو جائے[2]۔ کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ ان اشعار کی شرح بھی نہیں کرتے تھے۔ جن میں کسی کی ہجو کی گئی ہو۔ وہ ایسے اشعار کی شرح کرنے کو اپنی دین داری کے خلاف سمجھتے تھے[3]۔ کیوں کہ ہجو گوئی میں اس آدمی یا اس آدمی کے قبیلہ کا رتبہ گرایا جاتا ہے جس کی ہجو کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات عربیت کے بھی خلاف ہے۔ حسن گفتگو اور حسن آواز میں وہ ابو عبیدہ سے امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ابو عبیدہ کا علم زیادہ وسیع تھا اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے وہ اصمعی سے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ ایرانی ہونے کی وجہ سے ایران کی تاریخ سے بھی واقف تھے۔ ان کے آباؤ اجداد چوں کہ یہودی تھے اس لئے یہودی تہذیب ثقافت سے بھی بہرہ یاب تھے۔ اسلامی ثقافت سے تو واقف تھے ہی کیوں کہ اسی میں انھوں نے نشوونما پائی تھی۔ لیکن حسن تعبیر میں اصمعی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ آزاد رائے تھے۔ قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر دیتے تھے اور اس امر پر اصمعی ان سے مؤاخذہ کیا کرتے تھے[4]۔ ان کے دل میں عربوں کی عزت نہیں تھی کیوں کہ وہ خود عربی نہیں تھے۔ بلکہ ان کے دل میں عربوں کی ناپسندیدگی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ عربوں کی ہجو اور ان کی برائیاں بیان کرنے میں ان کی زبان بڑی آزادی سے چلتی تھی۔ ان کی وسعت معلومات کی وجہ سے لوگ مرعوب ہو جاتے اور گمراہ ہوتے تھے جیسا کہ اصمعی کی فصاحت اور حسن بیان سے لوگ مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔ جاحظ کا بیان ہے کہ "روئے زمین پر کوئی خارجی اور اجماعی ابو عبیدہ سے بڑھ کر

---

[1] المزہر صفحہ ۲۰۲ جلد ۲ ۔ [2] المزہر السیوطی ۔ [3] المزہر صفحہ ۲۰۴ جلد ۲ ۔ [4] ابن خلکان صفحہ ۱۵۵ جلد ۲

تمام علوم کا سب سے زیادہ جاننے والا نہیں تھا۔[1] لوگ کہا کرتے تھے کہ طالبانِ علم جب اصمعی کے حلقۂ درس میں جاتے ہیں تو وہ موتیوں کے بازار میں سے مینگنیاں خرید کر لاتے ہیں۔ اور جب وہ ابو عبیدہ کے حلقۂ درس میں جاتے ہیں تو وہ مینگنیوں کے بازار میں سے موتی خرید کر لاتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ اصمعی خوش الحان اور پُر مذاق آدمی تھے۔ معمولی قسم کے اشعار اور واقعات بھی بیان کرتے تھے تو اُن کی زبان سے معمولی باتیں بھی اچھی اور خوش نما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر علمی اعتبار سے طلبہ کو فائدہ کم ہوتا تھا۔ ابو عبیدہ کے ہاں طلبہ کو سوءِ تعبیر کے باوجود بے شمار فوائد اور بے انتہا علمی نادر معلومات حاصل ہوتی تھیں۔[2]

ظاہر ہے کہ اصمعی اور ابو عبیدہ اپنے عہد میں ایک الگ فکر کے نمایندہ تھے۔ اصمعی تو عربیت کی نمایندگی کرتے اور عربوں کے لئے تعصب رکھتے تھے۔ انہیں عربوں سے بڑی محبت تھی۔ ان کا مشغلہ عربوں کی جلالتِ شان کا اظہار اور ان کے تذکروں کو پھیلانا تھا۔ اور ابو عبیدہ شعوبیت کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کو عربوں کے عیوب کی تلاش اور ان کا ڈھنڈورہ پیٹنے ہی سے کام تھا، دونوں امام تھے اور دونوں کے گرد ایسے لوگ جمع رہتے تھے جو ان کی فکر کی تائید اور مدد کرتے اور اس کے لئے تعصب رکھتے تھے۔ عرب کے لوگ اصمعی کے گرد جمع تھے اور ایران کے لوگ ابو عبیدہ کے گرد۔ اسحٰق بن ابراہیم موصلی کو دیکھئے ــــ یہ ایرانی ہیں ــــ فضل بن الربیع سے کہتے ہیں۔

عَلَيْكَ اَبَا عُبَيْدَةَ فَاصْطَنِعْهُ ۔۔۔ فَاِنَّ الْعِلْمَ اَنِّيْ عُبَيْدَةُ

وَقَدِّمْهُ، وَاٰثِرْهُ عَلَيْهِ ۔۔۔ وَدَعْ عَنْكَ الْقُرَيْدَ ابْنَ الْقُرَيْدَةِ

ابو عبیدہ کو نہ چھوڑنا۔ اس پر احسانات کرتے رہنا کیوں کہ علم ابو عبیدہ کے پاس ہی ہے اسے ہمیشہ مقدم رکھنا اور اصمعی پر اسے ترجیح دینا پچھڑی کے بیٹے پچھڑی کا خیال چھوڑدو۔ یعنی اصمعی کو لے کر کیا کروگے۔

ابو الفرج اصفہانی کا بیان ہے کہ اسحٰق موصلی ہارون رشید کے سامنے اصمعی کے عیوب گناتا رہتا اور بتاتا رہتا کہ اس میں ممنونیت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ بڑا ہی بخیل اور کمینہ خصلت انسان ہے۔ اس پر احسانات کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ابو عبیدہ میں ثقاہت، سچائی، سخاوت اور علم ہے۔

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۱۵۴ جلد ۲   [2] ابن خلکان صفحہ ۱۵۶ جلد ۲

یہی کچھ وہ فضل بن الربیع وزیرِ سلطنت کے سامنے کہتا رہتا تھا۔ اس کی برابر یہی کوشش رہی حتیٰ کہ دربار میں اصمعی کی وہ عزت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی اور لوگوں کی نگاہوں میں اصمعی بہت ہی گر گئے۔ ان لوگوں نے مل کر ابوعبیدہ کو بڑھا دیا اور اس کی شان کو اونچا کر دیا۔[۱]

ابونواس کو دیکھیئے ـــــ ابونواس کا ایرانی رجحان تو مسلّم ہے ـــــ وہ بھی اصمعی پر ابوعبیدہ کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، "ابوعبیدہ کی کیا بات ہے، اگر لوگ اسے موقع دیں تو وہ اولین و آخرین کی تاریخ ان کے سامنے پڑھ کر سنا سکتا ہے۔ رہ گیا اصمعی تو وہ تو ایک بلبل ہے جو اپنے چہچہوں سے لوگوں کا دل ہی خوش کر سکتا ہے"۔ دوسری طرف اصمعی کو دیکھیئے وہ برامکہ کی مذمت کرتا ہوا کہتا ہے ؎

إِذَا ذُكِرَ الشِّرْكُ فِي مَجْلِسٍ   أَضَاءَتْ وُجُوهُ بَنِي بَرْمَكِ

وَإِنْ تُلِيَتْ عِنْدَهُمْ آيَةٌ   أَتَوْا بِالْأَحَادِيثِ عَنْ مَزْدَكِ

جب کسی محفل میں شرک کا تذکرہ ہوتا ہے تو بنو برمک کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے قرآن کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ مزدک کی باتیں بیان کرنے لگتے ہیں۔

ابوعبیدہ ایران کو شہرت دوام بخشنا چاہتا ہے چنانچہ "فضائل الفرس" کے نام سے ایرانیوں کے فضائل میں ایک کتاب تصنیف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھتا ہے جس میں گذشتہ اور موجودہ بادشاہوں کے مختلف طبقات بیان کرتا ہے۔ ان کے واقعات کو پیش کرتا ہے ان کے خطبے نقل کرتا ہے۔ ان کے مختلف شاخ در شاخ نسب نامے بیان کرتا ہے۔ جو شہر اور قصبے انہوں نے آباد کئے تھے ان کو گناتا ہے۔ جو نہریں انھوں نے کھودی تھیں ان کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے مختلف گھرانوں کا تذکرہ کرتا ہے اور سرداروں کے ہر فریق کے خصوصی امتیازات کو ایک ایک کر کے گناتا ہے۔[۲]

شعوبیت کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ ان لوگوں نے ایران کی جو تاریخ نقل کی ہے اسے نہایت ہی خوش نما اور خوش گوار رنگ دیا ہے۔ ایرانی بادشاہوں کی طرف نہایت شان دار، پُر حکمت اقوال اور سیاسی استحکامات وغیرہ منسوب کئے ہیں، ایران کو ان لوگوں نے نہایت ہی شان و شکوہ کا لباس پہنایا ہے اور اس میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ایرانی حضرت اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام کی

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۰۷ جلد ۵۔ [۲] مسعودی صفحہ ۱۱۳ جلد ۱۔

اولاد سے ہیں جب کہ عرب حضرت اسماعیل ابن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اسحاق علیہ السلام حضرت سارہ کے بیٹے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی بیوی تھیں اور آزاد تھیں اور اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بیٹے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی حرم یعنی باندی تھیں۔ لہٰذا وہ عربوں سے افضل ہیں کیوں کہ آزادوں کی اولاد ہیں جب کہ عرب کے لوگ باندیوں کی اولاد ہیں[1]۔ یہ ایسا دعویٰ تھا جو علمی اعتبار سے قطعاً غلط ہے۔ یہ بات محض اس لئے گھڑی گئی تاکہ ایرانیوں کی شان بلند کی جاسکے اور اس طرح وہ عربوں پر فخر کر سکیں۔ ساتھ ہی وہ اس کے بھی مدعی تھے کہ ذوالاکتاف شاپور کا لقب تھا جس نے عراق میں عربوں کو شکست دے کر ان کے مونڈھے نکلوا دیئے تھے[2]۔

سب سے بڑھ کر عجیب و غریب وہ روایت ہے جو نبط کے شعوبیوں نے گھڑ کر حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی طرف منسوب کر رکھی تھی کہ کسی آدمی نے حضرت علیؓ سے پوچھا "اے امیر المومنین! ہمیں اپنی اصل یعنی خاندان قریش کی اصل کے متعلق بتایئے!" تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہم کوثیٰ کے نبطیوں کی ایک قوم ہیں۔ نیز ان لوگوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم یعنی خاندان قریش نبطیوں میں سے ہیں اور کوثیٰ کے باشندے ہیں۔ حضرت علیؓ ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو کوئی ہمارے نسب کے متعلق پوچھنا چاہے تو اسے بتا دو کہ ہم نبطی ہیں اور کوثیٰ کے رہنے والے ہیں[3]۔ بیچارے علماء نے بڑی مشکل سے ان احادیث کے مطلب بتائے چناں چہ کچھ حضرات نے فرمایا کہ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا مطلب یہ تھا کہ ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم نبط سے تھے اور کوثیٰ میں رہتے تھے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ ان دونوں حضرات کا مطلب ایسا کہنے سے یہ تھا کہ وہ نسبوں پر فخر کرنے سے اپنی بیزاری ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ کچھ اور علماء نے یہ فرمایا کہ کوثیٰ مکہ مکرمہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے لیکن اگر یہ حضرات تحقیق اور انصاف سے کام لیتے تو اس طرح کی بکواس کی تاویل کرنے کی انہیں ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ فارسی کو بہت زیادہ آسمان پر چڑھایا۔ زہد، حکمت اور علم کی وہ وہ باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں جو کسی دوسرے صحابی کی طرف منسوب نہیں کی گئیں حتیٰ کہ ان کی عمر بھی عام لوگوں کی عمر سے زیادہ ہی گھڑ لی۔ ان کے متعلق کہا گیا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا تھا۔ ابو الشیخ نے

---

[1] ملاحظہ ہو رسائل البلغاء صفحہ ۲۶۵ ، [2] مسعودی صفحہ ۲۴۳ جلد ا ، [3] یہ تمام حدیثیں لسان العرب صفحہ ۸۰ ، ۸۴ جلد ۲ اور معجم یاقوت میں کوثیٰ کے بیان میں ملاحظہ فرمایئے۔ کوثیٰ سواد عراق کا ایک شہر ہے۔

طبقات الاصفہانیسین میں نقل کیا ہے کہ اہل علم کہتے ہیں کہ سلمانؓ فارسی تین سو پچاس سال زندہ رہے۔ بہرحال دو سو پچاس سال میں تو علماء کو کوئی شک و شبہ ہی نہیں[1]۔ انہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک روایت نقل کی کہ آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (اگر تم لوگ اسلام سے پھر گئے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا) لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ ہماری جگہ کون سی دوسری قوم لے آئے گا؟ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سلمانؓ کے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا سے بندھا ہوا بھی ہوگا تو ایران کے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی پالیں گے۔ یہی سلمانؓ ہیں جن کے بارہ میں یہ روایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ سلمانؓ ہم میں سے ہیں یعنی اہل بیت میں سے۔ یہی وہ بزرگوار ہیں جنہوں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور اس وقت سے عربوں کو معلوم ہوا کہ خندقوں سے جنگوں میں کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس بارہ میں بھی عرب کے لوگ ایرانیوں کے ممنون احسان ہیں۔ غرضکہ ایرانیوں نے سلمانؓ فارسی کی شخصیت کو اپنی عظمت کے اظہار کا ایک وسیلہ بنا لیا ہے اور گویا کہ مسلمانوں پر ان کا بہت ہی بڑا احسان ہے[2]۔

حدیث کی دنیا میں تو ایرانیوں کو ایک بڑا وسیع میدان مل گیا۔ بے شمار حدیثیں ایرانیوں کی فضیلت میں گھڑ گھڑ کر انہوں نے متعدد صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب کر دیں۔ مثلاً یہ روایت کہ عجمیوں کا تذکرہ رسول اللہؐ کے سامنے کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے ان عجمیوں پر تم سے کہیں زیادہ اعتماد ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کے کچھ لوگوں پر مجھے تمہارے کچھ لوگوں سے زیادہ اعتماد ہے[3]۔ ایک تیسری روایت میں ہے کہ "عنقریب عجم کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ دمشق کے علاوہ تمام شہروں پر قابض ہو جائے گا[4]۔"

ایک حدیث میں ہے کہ ایران کو برا نہ کہو، کسی نے آج تک برا نہیں کہا مگر اس سے جلد یا بدیر انتقام ضرور لیا گیا۔

---

[1] اصابہ الابن حجر صفحہ ۱۱۳ جلد ۳۔ [2] ان لوگوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علیؓ کو ایک یادداشت لکھوائی تھی۔ اس یادداشت میں یہ بات بھی لکھوائی تھی کہ رسول اللہؐ نے سلمانؓ کا فدیہ ادا فرمایا تھا۔ اور ان کا ولاء حضرت علیؓ کو عطا فرما دیا تھا۔ یہ یادداشت جمادی سنہ ایک ہجری میں لکھوائی گئی تھی۔ خطیب بغدادی نے اس یادداشت کی علمی حیثیت کے نہایت رقیق سطحی کے ساتھ پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ تاریخ خطیب صفحہ ۱۷۰ جلد ۱ میں اس بحث کو ملاحظہ فرمایئے۔

[3] تیسیر الوصول صفحہ ۱۱۱ جلد ۳۔ [4] ایضاً صفحہ ۱۲۷ جلد ۳۔

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے پیچھے پیچھے کالی بکریاں چل رہی ہیں۔ پھر کچھ سفید بکریاں بھی آپ کے پیچھے ہو لیں اور وہ اتنی زیادہ ہیں کہ کالی بکریاں ان میں گم ہو کر رہ گئیں۔ نبی اکرمؐ نے یہ خواب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سنایا اور فرمایا کہ کالی بکریاں عرب کے لوگ ہیں جو اسلام لے آئیں گے اور سفید بکریاں عجم کے لوگ ہیں جو ان کے بعد اسلام لائیں گے اور وہ اتنے زیادہ ہوں گے کہ عرب کے لوگ ان میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھے آج صبح ہی ایک خاص فرشتہ نے اس کی خبر دی ہے[۱]۔ اسی قبیل سے وہ بے شمار حدیثیں ہیں جو امام ابوحنیفہؒ — آپ ایرانی الاصل ہیں — کے سلسلہ میں گھڑ دی گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان احادیث میں آپ ہی کی طرف اشارہ فرمایا تھا یا تصریح فرما دی تھی۔ مثلاً یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر علم ثریا سے لٹکا ہوا بھی ہوگا تو اسے ایران کا ایک آدمی ضرور پا لے گا"۔ یا مثلاً روایت ہے کہ "آدمؑ نے مجھ پر فخر کیا تھا اور میں اپنی امت کے ایک آدمی پر فخر کرتا ہوں جس کا نام نعمانؒ ہوگا اور کنیت ابوحنیفہ ہوگی وہ میری امت کا ایک چراغ ہوگا"۔ اور یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ تمام انبیاء مجھ پر فخر کرتے رہے ہیں اور میں ابوحنیفہؒ پر فخر کرتا ہوں۔ جس نے اس سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ اور جس نے اس سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا[۲]۔

سچ بات یہ ہے کہ عربوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جن میں عربوں کے لئے تعصب تھا ان چیزوں کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کیا۔ انہوں نے بھی عربوں کی فضیلت میں حدیثیں گھڑ گھڑ کر ڈھیر لگا دیئے۔ مثلاً یہ حدیث ملاحظہ ہو کہ "جس نے عربوں سے فریب کیا وہ میری شفاعت میں داخل نہیں ہوگا اور نہ اسے میری محبت حاصل ہو سکے گی"۔ اور مثلاً "جب لوگوں میں اختلاف ہو تو حق وہ ہے جس پر مضر ہوں"۔ اور مثلاً "عربوں کے ساتھ تین وجہوں سے محبت کرو۔ اس لئے کہ میں عربی ہوں۔ اور اس لئے کہ قرآن عربی ہے۔ اور اس لئے کہ جنت میں جنت والوں کی زبان عربی ہوگی"۔ ان میں سے سب سے زیادہ پُرلطف وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خود سلمانؓ فارسی کے ساتھ گفتگو فرماتے ہیں۔ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "اے سلمانؓ! مجھ سے عداوت نہ رکھنا ورنہ تم دین سے خارج ہو جاؤ گے۔

---

[۱] محاضرات الادباء للاصفہانی صفحہ ۲۱۹ جلد ا ۔ [۲] ملاحظہ ہو ابن عابدین اور اس کا حاشیہ صفحہ ۵۴ - ۵۵ جلد ا ۔

سلمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "اے رسول اللہؐ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپؐ سے عداوت رکھوں حالانکہ خُدا نے آپؐ کے ذریعہ سے مجھے ہدایت دی ہے"۔ تو آپؐ نے فرمایا "بس عربوں سے عداوت نہ رکھنا کہ اس طرح تم مجھ سے عداوت رکھنے کے مرتکب ہو گے"[1] الخ۔ اسلامی تعلیمات جو مساوات کی دعوت دیتی ہیں اور یہ سکھاتی ہیں کہ فضیلت کا امتیاز محض تقویٰ پر ہے، ایرانیوں یا عربوں یا کسی تیسری قوم کی محض ان کی جنسیت کی بنا پر کسی قسم کی تعریف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔

علم پر اہلِ شعوبیت کے اثرات

ہمیں ہر علم میں اس شعوبیت کی ٹانگ اڑی ہوئی ملتی ہے حتیٰ کہ فقہ میں بھی۔ مثال کے طور پر ذرا کتاب النکاح میں کفاءت کا باب پڑھ جائیے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ خود ائمۂ فقہ پر تو اس عصبیت نے کچھ اثر نہیں کیا تھا۔ چناں چہ امام مالکؒ کو دیکھیے وہ عربی ہیں مگر انہوں نے نکاح میں کفاءت کا امتیاز نہیں کیا۔ ان کے نزدیک ایک عجمی آدمی عربی عورت سے شادی کر سکتا ہے اور عورت کے ولی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ——— امام صاحب ایرانی الاصل ہیں ——— اس بارہ میں یہ ہے کہ کفاءت کا اعتبار کیا جائے گا۔ چنانچہ قریش کے سب خاندان، آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں لیکن غیر قریشی آدمی ایک قریشی کا کفو نہیں ہے۔ عجمی آدمی ایک عربی عورت کے لیے کفو نہیں ہے۔ لیکن بہت جلد ہمارے سامنے ایک دوسرا نظریہ آ جاتا ہے۔ جو بحث کی بساط پر آ جانے کے بعد عربی عصبیت کے بڑے حصّہ کو منہدم اور کالعدم کر دیتا ہے۔ اور وہ نظریہ ہے کہ علمی شرافت نسبی شرافت سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ قاضی خاں میں ہے۔ صاحب حسب آدمی صاحب نسب کا کفو ہو سکتا ہے۔ لہٰذا عجمی عالم ایک عربی جاہل مرد اور عورت بلکہ علوی خاندان کی عورت کا بھی کفو ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ علم کی شرافت نسبی شرافت پر مقدم ہے[2]۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ یا امام حسن بصریؒ جیسے آدمی بھی جو عربی النسل نہیں تھے ایک جاہل قریشی لڑکی کے کفو نہیں ہو سکتے یا ایک ایسی عربی لڑکی کے کفو نہیں بن سکتے جو اپنی ایڑیوں پر پیشاب کر لیتی ہو[3]۔ اگر ہم ہر علم میں شعوبیت کے

---

[1] ابن قتیبہ رسائل البلغاء صفحہ ۲۹۳۔ [2] سرخسی کی مبسوط میں ہے کہ سفیان ثوری عرب تھے مگر ان میں تواضع تھی چنانچہ ان کے نزدیک مُوالی عربوں کے کفو ہو سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ مُوالی میں سے تھے ان میں بھی تواضع تھی۔ انہوں نے خود کو عربوں کے برابر کا نہیں سمجھا۔ صفحہ ۲۲ جلد ۵۔ [3] ابن عابدین صفحہ ۹۸ جلد ۲۔

اثرات گنانا شروع کر دیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی ۔

بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ شعوبیت اس عہد میں پروان چڑھی جو علوم کی تدوین کا زمانہ تھا۔ چنانچہ ہر علمی حرکت جو بعد میں پیدا ہوئی اس کی بنیاد انہی علوم پر استوار ہوئی جن کی تدوین بنو عباس کے اس شعوبیت آشنا دور میں ہو چکی تھی ۔ اس سے پہلے کوئی علم مدوّن صورت میں موجود نہیں تھا ۔ اس بنا پر شعوبیت کے اثرات کی تحقیق کرنا اور ان کی نشان دہی کرنا اور بھی مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے ۔ اگر ہمارے پاس اُموی عہدِ حکومت کی مدوّن کی ہوئی کوئی تاریخ ہوتی تو ہم سمجھ سکتے کہ عباسی عہدِ خلافت میں شعوبیوں نے کیا کیا کھیل کھیلے ۔ اسی طرح اگر ہمارے پاس ایران کی کوئی معتمد تاریخ ایرانی دورِ حکومت کی مدوّن شدہ ہوتی تو ہم وضاحت کے ساتھ اس امر کا پتہ لگا سکتے کہ ان شعوبیوں نے اس دور کو کس طرح مصنوعی طور پر خوش نما بنایا تھا ۔ اسی طرح اگر عربوں نے اپنے ابتدائی زمانۂ اسلام میں کچھ کتابیں ، انساب عرب ، مناقب عرب ، اور مثالبِ عرب میں تصنیف کی ہوتیں اور وہ ہم تک پہنچ جاتیں تو ہم یہ معلوم کر سکتے کہ ان شعوبیوں نے عربوں کے امتیاز کو خراب کرنے اور ان کی شان کو گرانے کے لئے کیا کیا چیزیں گھڑی تھیں ۔ یہی حال تمام علوم کا ہے ۔ لیکن تقدیر نے تدوینِ علوم کے زمانہ کا جوڑ شعوبیت کے دبدبہ سے ملا دیا اور یہ علم کے لئے بڑی ہی بدقسمتی کی بات ہوئی ۔ علماء نے بڑی کوششیں کیں کہ شعوبیت کے اسرار و خفایا کا پتہ لگائیں اور علم میں اس کے آثار کی نشان دہی کر سکیں لیکن اس کے لئے میدان ان کے سامنے ہمیشہ وسیع رہے گا اور تحقیق و تفتیش ہمیشہ اپنے گہوارہ ہی میں رہے گی ۔

اس کے ساتھ ساتھ شعوبیت کا ایک اچھا پہلو بھی تھا ۔ شعوبیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ ہر اس چیز کی عظمت و عزت کی جاتی تھی جس پر عربی چھاپ ہوتی تھی ۔ عربی نسب ۔ عربی زبان ۔ عربی رائے ۔ عربی عادات و رسوم غرض ہر چیز تقدس کی نظر سے دیکھی جاتی تھی ۔ شعوبی حضرات نے تمام چیزوں کو تنقید و تحلیل کی کسوٹی پر رکھ دیا ۔ انساب عرب پر انہوں نے تنقید کی جیسا کہ ابو عبیدہ نے پورے غلو کے ساتھ کیا ۔ وہ ان لوگوں کی تردید کرتے تھے جو اپنے آپ کو غلط طور پر عربوں سے منسوب کرتے تھے اور ثابت کرتے تھے کہ یہ نسبت جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہے ۔ کتاب الاغانی میں ابو عبیدہ کی بہت سی ایسی چیزیں ہمیں ملتی ہیں ۔ انہوں نے عربی زبان پر تنقید کی ۔ چنانچہ سیبویہ کو دیکھئے وہ علم نحو پر اپنی کتاب میں خود عربوں کی بعض غلطیاں نکالتے ہیں ۔ عرب کے لوگ مدعی تھے کہ بلاغت صرف انہی کا حصہ ہے ۔ شعوبیت نے اس کا جواب دیا کہ دنیا میں اور بھی بہت سی قومیں

ہیں ان کے ہاں بھی بلاغت ہے۔ ان کے بھی خطبے ہیں۔ ان کی بھی ضرب الامثال ہیں جو کسی طرح عربوں کی ضرب الامثال سے فروتر نہیں ہیں وہ متنبہ کرتے تھے کہ عربوں کی عادات و رسوم ہی عادات و رسوم کا اعلیٰ معیار نہیں ہیں۔ جہاں ان کی عمدہ اور محمود عادتیں ہیں وہاں ساتھ ہی کچھ رذیل اور مذموم عادتیں بھی ہیں۔ اس تنقید و جرح نے بعض وجوہ سے ایک بہت ہی عمدہ نتیجہ پیدا کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ تمام دوسری اقوام کی یہ ساری باتیں بھی سامنے آجائیں تاکہ مکمل طور سے مقابلہ کیا جا سکے۔ عربی کلمات کے سامنے فارسی کلمات رکھے گئے۔ عربی بلاغت اور بصائر و حکم کے مقابلہ میں اجنبی حکم اور اجنبی بلاغت رکھی گئی۔ عربی لٹریچر اور عربی نظام کے مقابلہ میں ایرانی نظام اور اجنبی لٹریچر کو لایا گیا۔ وغیرہ ذالک۔ یہ بات بلاشبہ علم و عقل کے لئے بڑی ہی مفید ہوئی۔

البتہ! اگر شعوبیت اس حد تک ہی محدود رہتی اور وہ عربوں کے خلاف ان کے محاسن کو برائیوں میں تبدیل کرنے کا بیڑا نہ اٹھاتی، کبھی سچ اور کبھی جھوٹ ان کی تضحیک و تشہیر نہ کرتی، دین کو زندقہ کے ساتھ خراب کرنے کی کوشش نہ کرتی، علم کو جھوٹی اور من گھڑت باتوں کے ساتھ خراب نہ کرتی۔۔۔ اگر وہ صرف اسی حد تک اکتفا کرتے تو ان کا یہ فعل بہت ہی اچھا ہوتا۔ لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں افراط سے کام لیا۔ لہٰذا وہ خود بھی بڑے گھاٹے میں رہے اور علمی دنیا میں ناپسندیدہ اور معتوب بھی قرار پائے۔

فصل چہارم

غلام اور تہذیب پر ان کے اثرات

اسلام میں غلامی کا قانونی مؤقف

اس سے پہلے کہ ہم غلاموں اور ان کے اثرات سے گفتگو کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسلامی مملکت میں غلامی کے قانونی مؤقف کی مختصر سی وضاحت کر دیں۔ یعنی بالفاظِ دیگر یہ بتا دیں کہ اس پہ کیا اسلامی احکام منطبق ہوتے تھے۔

اسلامی تعلیمات کا یہ فیصلہ ہے —— یا کم از کم —— ان مبادی کا یہ فیصلہ ہے جن سے ائمہ نے اصول احکام مستنبط کیے ہیں[1] اور اسی پہ آج تک —— یعنی اس عہد تک جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اسی پہ عمل ہوتا تھا کہ غلامی کا سبب کسی کافر کا جنگ میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آ جانا ہے۔ چنانچہ مسلمان جب کفار سے جنگ کریں تو محاربین میں سے جو لوگ گرفتار ہو جائیں امام کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کو غلام بنا لے جیسا کہ اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس شہر کے تمام باشندوں کو جسے اس نے جنگ کر کے فتح کر لیا ہے غلام بنا لے۔ مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی[2]۔ کفر اور قید ہو جانا، یہی دونوں باتیں غلامی کا سبب ہوتے ہیں۔ غلامی باقی رہنے کے لئے اس کے سبب[3] کا

---

[1] اسلامی تعلیمات یا اسلامی مبادی کا نام لینا غلط ہے۔ قرآن نے غلامی کے رواج کو قطعاً بند کر دیا ہے اور اس کی ایک اسلامی معاشرہ میں کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ ملاحظہ ہوں سورۂ محمدؐ کی متعلقہ آیات۔ [2] اس سلسلہ میں ظہر الاسلام کے جزو اوّل میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ [3] مسلمان سلاطین اور امراء اور دیگر ارباب ثروت نے جو غلام اور لونڈیاں رکھیں، ان کا یہ عمل قرآن مجید کے صریحاً خلاف تھا۔

باقی رہنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی کافر گرفتار ہو کر غلام بنا لیا جائے اور اس کے بعد وہ مسلمان ہو جائے تو غلامی اس سے دُور نہیں ہوگی۔ یہ غلام مال شمار ہوتے ہیں۔ ان کا حال بعینہ وہی ہے جو دوسرے سامان کا ہوتا ہے۔ جنگ میں جو لوگ غلام بنا لیے جائیں وہ مال غنیمت کا اسی طرح ایک حصّہ شمار ہوتے ہیں جیسے آلاتِ جنگ۔ نقود اور گھوڑے وغیرہ۔ بہرحال ان کی مثال بعینہ ان قابلِ قیمت چیزوں کی ہوتی ہے جو فاتحین کے قبضہ میں آجائیں۔ ان چیزوں کا حال یہی ہوتا ہے کہ امام ان کو دارالاسلام کی طرف منتقل کر لیتا ہے۔ پھر ان کا پانچواں حصّہ امام لے لیتا ہے تاکہ اسے عام مصالح میں خرچ کر سکے یعنی فقراء اور مساکین کو دے دے اور دوسرے نیکی کے مختلف مصارف میں خرچ کر دے۔ رہ گئے باقی چار خُمس تو وہ ان لوگوں پر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔ غلاموں کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ ان کا پانچواں حصّہ مصالح عامہ کے لیے ہوتا ہے اور باقی جنگ کرنے والوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ جنگ کرنے والوں پر تقسیم کرتے ہوئے سوار اور پیادہ کے درمیان امتیاز رکھا جاتا ہے۔ یعنی بعض فقہاء کے قول میں سوار کو دو حصّے ملتے ہیں اور پیادہ کو صرف ایک حصّہ ملتا ہے۔ اس طریقہ سے جو ہم نے بیان کیا ہے غلاموں کو تقسیم کیا جاتا تھا۔

ابتداءِ اسلام میں جنگیں چونکہ مسلسل ہوتی ہی رہتی تھیں جن میں فتح عموماً مسلمانوں کی ہوتی تھی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ مفتوحہ ممالک اور مغلوب اقوام کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اس سے ہم اس بات کا تصوّر کر سکتے ہیں کہ غلاموں کی تعداد کتنی بے شمار ہوتی ہوگی۔ اور وہ کس قدر مختلف اور متنوع ہوتے ہوں گے۔ کیوں کہ جن قوموں سے مسلمان برسرِ جنگ رہتے تھے وہ خود مختلف انواع و اجناس سے تعلق رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ غلام کس طرح تقسیم کئے جاتے تھے اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح جنگ کرنے والے مسلمانوں میں پھیل گئے ہوں گے اور ان کے ایک ایک گھر میں داخل ہو گئے ہوں گے۔ پھر چوں کہ ان غلاموں کو قطعاً مال کی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان پر خرید و فروخت، اجارہ اور رہن کے تمام مالی معاملات جاری ہوتے تھے اس لئے ہم آسانی کے ساتھ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ غلام صرف جنگ کرنے والے سپاہیوں تک ہی محدود نہیں رہتے تھے بلکہ تمام لوگوں کو ان پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے بازار ہوا کرتے تھے جہاں سے جو چاہتا ان کو خرید لیتا اور جس طرح چاہتا ان سے خدمت لیتا۔[1]

---

[1] جہاں تک اس عہد کا تعلق ہے جس کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ مصنّف نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ (باقی ص۱۱۲ پر)

یہ گفتگو محض مالی جہت سے تھی۔ رہ گیا جنسی جہت سے مردوں کا تعلق باندیوں کے ساتھ۔ تو اسے ہم مختصراً اب بیان کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں دو ذریعے ہیں جو ایک عورت کو مرد کے لئے حلال کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ذریعہ تو عقد نکاح کا ہے اور دوسرے ملک یمین کا۔ جہاں تک عقد نکاح کا تعلق ہے تو ایک آزاد آدمی کے لئے چار عورتوں سے زیادہ سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ایک وقت میں اس کے نکاح کے اندر چار بیویوں سے زیادہ ہوں۔ لیکن اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان چار میں سے کچھ کو طلاق دے دے اور ان کی عدت گزر جانے کے بعد ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادی کرے۔ اکثر فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ کچھ فقہاء کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔ جن کو بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے ——— یہ حکم عام ہے۔ یہ چاروں بیویاں آزاد بھی ہو سکتی ہیں اور باندیاں بھی۔ اس موضوع میں فقہاء نے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا ہے کہ کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی باندی سے نیا عقد نکاح کرے جب کہ اس سے پہلے اس کے گھر میں ایک آزاد عورت اس کی بیوی کی حیثیت سے موجود ہو۔ البتہ اس کے برعکس کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی ایک منکوحہ باندی کے ہوتے ہوئے وہ ایک آزاد عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس میں فقہاء نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ ایک آزاد بیوی سے شادی کر لینے کے بعد باندی سے نکاح کر لینے میں اس آزاد بیوی کی توہین اور اس کے شرف اور عزت پر صدمہ سمجھا جائے گا۔

دوسرا ذریعہ جو ایک عورت کو ایک مرد کے لئے حلال کر دیتا ہے "ملک یمین" ہے یعنی کسی مرد کے لئے باندی کا مالک ہو جانا۔ حق تعالے کا ارشاد ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ چند بیویوں میں سے عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی شادی کرو یا ملک یمین پر اکتفا کرو) اور وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تاریخی حیثیت سے صحیح ہو تو جو عکس تاریخ کے اس امیہ کو قرآن اور اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے غلامی کی رسم کو قطعاً بند کر دیا تھا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتاب "غلام اور لونڈیاں"۔

عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ - (اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا مالک یمین کے کہ ان پر کوئی ملامت نہیں ہے)[1] چنانچہ جس کی ملکیت میں کوئی باندی آجاتی اس کے لئے جائز ہوتا کہ وہ اس سے استمتاع کرے۔ وہ اس کے لئے حلال ہوتی تھی خواہ اس سے شادی کرلے یا شادی نہ کرے۔ خواہ اس کے ایک بیوی پہلے سے موجود ہو یا چار بیویاں پہلے سے موجود ہوں۔ مرد پر اس سلسلہ میں کسی تعداد کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے لئے جائز تھا کہ وہ چار تک شادیاں کرلے اور جتنی چاہے باندیاں اپنی ملکیت میں رکھے اور جتنی باندیوں سے چاہے استمتاع کرتا رہے۔ خواہ وہ کتنی ہی کثیر التعداد کیوں نہ ہوں۔[2]

اس وجہ سے ایک اسلامی گھرانے میں[3] —— عموماً —— ایک یا کئی بیویاں ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ متعدد باندیاں ہوتی تھیں جن سے گھر کا مالک استمتاع کرتا رہتا تھا۔

آزاد بیویوں اور ان ممتوعہ باندیوں کے درمیان اکثر جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ اور ایسا ہونا طبیعی تھا —— حتیٰ کہ بعض اہل لغت نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ان باندیوں کو سراری اس لئے کہا جاتا تھا کہ باندیاں رکھنا عموماً بیویوں میں غیرت کے جذبات کو بھڑکانے کا موجب ہوتا تھا۔ لسان العرب کے مصنف نے بعض علمائے لغت سے نقل کیا ہے کہ مُسْتَرِیَّةٌ اس باندی کو کہتے تھے جس سے اس کا مالک استمتاع کرنا چاہتا تھا —— خلاف قیاس طریقہ پر یہ سِرّ کی طرف نسبت ہوتی تھی جس کے معنی اخفاء کے ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً اس بات کو کہ وہ اپنی باندی سے استمتاع کر رہے ہیں اپنی آزاد بیویوں سے چھپاتے تھے۔ عموماً جب ایک آدمی کی نسل آزاد عورتوں اور باندیوں دونوں سے چلتی تھی تو آزاد بیویوں کی اولاد۔ باندیوں کی اولاد پر فخر کرتی تھی۔ اور وہ اس بات پر عزت محسوس کرتی تھی کہ اس کی رگوں میں غلامی کا خون نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس اختلاف کو دیکھئے جو محمد امین اور مامون الرشید کے درمیان تھا۔ دونوں کے دونوں ہارون الرشید

---

[1] یہ حکم آیندہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ان باندیوں کے متعلق تھا جو عربوں کے معاشرہ میں سے چلی آتی تھیں یہی وجہ ہے کہ مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ میں مَلَكَتْ بصیغہ ماضی استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے غلامی کے دروازہ کو آیندہ کے لئے بند کردیا تھا جس کی تصریح سورۂ محمدؐ میں ہے۔ [2] ملاحظہ ہو بدائع صفحہ ۲۶۶ جلد ۲

[3] "مسلمانوں کے گھرانے میں" کہئے۔ اسلامی گھرانے میں نہیں۔

کے بیٹے تھے لیکن امین کی ماں آزاد بیوی تھی اور مامون کی ماں ممتوعہ باندی تھی۔ ہم اس قسم کی کئی مثالیں پہلے بھی بیان کر چکے ہیں جن کا تعلق خلفاء کے گھرانوں اور ان کی متنوع اولاد سے تھا۔ رعایا کے گھروں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس ضمن میں ان کے گھر بھی خلفاء کے گھرانوں کا نمونہ ہی تھے۔

یہ غلام جن کا حال ہم نے بیان کیا ہے، مرد ہوں یا عورتیں، انہیں اس وقت تک ان کی آزادی واپس نہیں ملتی تھی جب تک ان کا مالک انہیں آزاد نہ کر دے۔ فقہاء نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے اپنی کتابوں میں لمبے لمبے باب بیان کئے ہیں۔ جن میں انہوں نے ان الفاظ کا حکم بتایا ہے جن سے آزادی واقع ہو جاتی تھی اور جو مختلف صورتیں اس ضمن میں پیش آتی تھیں۔ یہاں ہمیں ام الولد کے متعلق کچھ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ام الولد اس باندی کو کہتے تھے جس کے شکم سے اس کے مالک کا کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تھا۔ فقہاء نے ایسی باندی کا رتبہ اس باندی سے بلند رکھا ہے جس سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ اسے بعض وہ حقوق حاصل ہو گئے تھے جو دوسری باندیوں کو حاصل نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے اہم ترین حق یہ تھا کہ اس کا مالک (جب کہ وہ اس سے بچے پیدا کر رہا ہو) اسے فروخت یا ہبہ نہیں کر سکتا تھا ——— جمہور فقہاء کا مذہب یہی ہے ——— لیکن جب تک مالک زندہ رہتا وہ اپنے مالک کے لئے حلال رہتی تھی۔ اگر مالک مر جاتا تھا تو وہ آزاد ہو جاتی تھی اور اس پر آزاد عورتوں کے تمام احکام جاری ہوتے تھے۔ جو اولاد اس کے بطن سے پیدا ہوتی تھی وہ بہر حال آزاد ہی ہوتی تھی۔

غلامی کے مسئلہ کی قانونی پوزیشن اس نظام میں جو اس زمانہ میں رائج تھا جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں، یہی کچھ تھی۔ بہر حال اتنی بات کو جان لینا ان ادبی، علمی اور اجتماعی نتائج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے جو اس سے پیدا ہوئے۔

مسلمانوں، نصرانیوں اور یہودیوں سب ہی کے ہاں یکساں طور پر غلامی کا رواج تھا۔ لیکن یہود و نصاریٰ کے ہاں ان سے استمتاع کرنے کی شرعاً اجازت نہیں تھی۔ اگرچہ قانون کے خلاف ان میں بھی کچھ لوگ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ابو جعفر منصور نے اپنے طبیب جورجیس ابن بختیشوع نصرانی کو تین حسین و جمیل رومی باندیاں تین ہزار دینار کے ساتھ تحفہ میں بھیجیں تو جورجیس نے باندیاں واپس کر دیں۔ منصور نے اس سے پوچھا کہ باندیاں کیوں واپس کر دیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ ہم نصرانی لوگ ایک بیوی سے زیادہ شادی نہیں کرتے جب تک بیوی رہے اور اس کے علاوہ کوئی عورت نہیں رکھ سکتے[1]

---

[1] اخبار الحکماء صفحہ ۱۵۹۔

لیکن دوسری طرف جاحظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "طیمانو" جاثلیق کے رئیس نے ارادہ کیا کہ عون عبادی کے اس فعل کو ناجائز قرار دے دے (عون عبادی نصرانی تھا) جب کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ عون عبادی نے استمتاع کے لیئے باندیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ تو عون نے جاثلیق کو دھمکی دی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ مسلمان ہو جائے گا[1]۔

قفطی نے بیان کیا ہے کہ نصاریٰ نے یوحنا بن ماسویہ کے اس فعل پہ ناگواری ظاہر کی کہ اس نے باندیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ چناں چہ انہوں نے اس سے کہا کہ تم نے ہمارے دین کی خلاف ورزی کی ہے حالاں کہ تم ہمارے مذہبی پیشوا ہو۔ یا تو ہمارے طریقہ پہ قائم رہو اور ایک بیوی پہ اکتفا کرو، اس طرح تم ہمارے مذہبی پیشوا رہ سکتے ہو۔ ورنہ مذہبی پیشوائیت سے الگ ہو جاؤ اور جتنی چاہے باندیاں رکھ چھوڑو۔ یوحنا نے کہا کہ ہمیں انجیل مقدس میں ایک مقام پہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم نہ تو عورتیں رکھیں اور نہ دو کپڑے رکھیں۔ وہ کون سا قانون ہے جو جاثلیق کو تو حق دے دیتا ہے کہ وہ ایک کے بجائے بیس کپڑے رکھے اور یوحنا شقی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ چار باندیاں رکھ سکے۔ اپنے جاثلیق سے جا کر کہو کہ وہ اپنے دین کے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرے تاکہ ہم بھی اس کے ساتھ دین کے قوانین کا لحاظ رکھ سکیں۔ اگر وہ دین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ہم بھی دین کی خلاف ورزی کریں گے[2]۔

بیزنطینی مملکت میں غیر نصرانی رعایا کے لیئے اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ نصرانی غلام رکھ سکیں لیکن مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کو اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ غلام رکھ سکتے ہیں خواہ وہ غلام مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

غلاموں کی تجارت

اس عہد میں پوری مملکت اسلامیہ میں غلاموں کی تجارت خوب پھیلی ہوئی تھی۔ بغداد میں ایک سڑک کا نام ہی "مشارع دار الرقیق" (غلاموں کے بازار کی سڑک) پڑ گیا تھا[3]۔ امین اور مامون کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بازار لوٹ لیا گیا تھا۔ کسی شاعر نے ایک لمبے قصیدہ میں اس کا مرثیہ کہا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

---

[1] الحیوان للجاحظ صفحہ ۹ جلد ۴ ۔ [2] اخبار الحکماء صفحہ ۲۴۸ ۔ [3] مسعودی صفحہ ۴۱۴ جلد ۲ ۔

وَمَهْمَا اَنْسَ مِنْ شَيْءٍ تَوَلّٰى   فَاِنِّیْ ذَاكِرٌ دَارَ الرَّقِيْقِ

مَیں کتنی ہی باتیں جو اس سلسلہ میں ہوئی ہیں بھول جاؤں لیکن حقیقت ہے کہ مَیں غلاموں کے بازار کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

غلاموں کی تجارت کرنے والے کو نخّاس کہا جاتا تھا ۔ یہ لفظ دراصل چوپاؤں کی تجارت کرنے والوں کے لئے تھا۔ اس عہد میں بغداد کے اندر بہت سے نخّاس مشہور تھے ۔ ان کی شہرت کا سبب یہ تھا کہ ان کے پاس نہایت حسین وجمیل باندیاں ہوتی تھیں جن کے پاس اکثر شعراء اور ادبار آتے جاتے تھے ۔چناں چہ محلّہ کرخ میں ایک نخّاس تھا جس کی کنیت " ابوعمیر" تھی ۔ اس کے پاس کئی گانے والی باندیاں تھیں جو بہت پُرمذاق تھیں ۔ اس کی باندیوں میں ایک باندی " عبادہ" تھی جس کے عشق میں عبداللہ محمد بن ایوب گرفتار تھا ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے سے

لَوْ تَشَكّٰى اَبُوْعُمَيْرٍ قَلِيْلًا   لَاَتَيْنَاهُ مِنْ طَرِيْقِ الْعِبَادَةِ

فَقَضَيْنَا مِنَ الْعِيَادَةِ حَقًّا   وَنَظَرْنَا فِیْ مُقْلَتَیْ "عَبَادَة"

اگر ابوعمیر ذرا سا بیمار ہوجائے تو ہم مزاج پُرسی کرنے کے لئے اس کے ہاں ضرور جائیں۔ اس طرح مزاج پُرسی کا حق بھی ادا ہوجائے اور عبادہ کی سرگیں آنکھیں بھی دیکھنے کو مل جائیں۔[1]

ان میں سے ایک ابوالخطاب نخّاس تھا جس کے پاس ایک مغنیہ باندی تھی۔ "ذَاتُ الْخَالِ" کے لقب سے وہ مشہور تھی ۔ ابراہیم موصلی کو اس سے عشق تھا[2] ۔ ان میں ایک اور نخّاس " حرب بن عمرو ثقفی " تھا۔ اس کے پاس بھی ایک گانے والی باندی تھی ، بغداد کے شعراء، میر منشی، اور اہل ادب برابر اس کے پاس آتے جاتے اور اس کا گانا سُنتے تھے ۔ اس کے گھر پر بیش قرار رقمیں خرچ کی جاتی تھیں ۔ اسے انعامات اور تحائف دیئے جاتے تھے ۔ اسی باندی کے بارہ میں اشجع شاعر کہتا ہے سے

اَشْكُوْ الَّذِیْ لَاقَيْتُ مِنْ حُبِّهَا   وَبُغْضِ مَوْلَاهَا اِلَى الرَّبِّ

مِنْ بُغْضِ مَوْلَاهَا وَمِنْ حُبِّهَا   سَقِمْتُ بَيْنَ الْبُغْضِ وَالْحُبِّ

فَاخْتَلَجَا فِی الصَّدْرِ حَتّٰى اسْتَوٰى   اَمْرُهُمَا فَاقْتَسَمَا قَلْبِیْ

تَعَجَّلَ اللّٰهُ شِفَائِیْ بِهَا   وَعَجَّلَ السُّقْمَ اِلٰى حَرْبِ

---

[1] اغانی صفحہ ۴۴ جلد ۲۰ ۔

[2] اغانی صفحہ ۵۰ جلد ۱۷ ۔

میں اپنے پروردگار سے اس کیفیت کی شکایت کرتا ہوں جو مجھے باندی کی محبت اور اس کے مالک کے رقیبانہ بغض کی وجہ سے درپیش ہے۔ اس کے مالک کی عداوت اور خود اس کی محبت کی وجہ سے میں بغض اور محبت کے دوگونہ عذاب سے بیمار ہو رہا ہوں۔ دونوں کیفیتیں میرے سینے میں ہیجان بپا کرتی رہتی ہیں اور میرا دل ان دونوں کیفیتوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ خدایا! مجھے تو اس باندی کے ذریعہ سے جلد از جلد شفا دے اور حرب بن عمرو (مالک) کو جلد از جلد بیمار ڈال دے[1]

"ابو دلامہ" شاعر کا ایک نخاس پر گذر ہوا جو غلام اور باندیاں فروخت کر رہا تھا۔ ابو دلامہ نے اس کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر حسین باندی دیکھی۔ وہ وہاں سے بڑا ہی کبیدہ خاطر لوٹا اور مہدی کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا قصیدہ سنایا۔ جس میں اس نے نخاسی کے پیشہ کو شعر گوئی پر ترجیح دی۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

إِنْ كُنْتَ تَبْغِي الْعَيْشَ حُلْوًا صَافِيًا ۔۔۔ فَالشِّعْرَ اَعْزِبْهُ وَكُنْ نَخَّاسًا

اگر تو شیریں اور صاف زندگی گزارنا چاہتا ہے تو شعر گوئی ترک کر دے اور نخاس بن جا۔

آزاد منش ادیب نخاسوں پر ان کے پیشہ کی وجہ سے رشک کرتے تھے لیکن اکثر عقلاء اس پیشہ کو ناپسند اور نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ان سے ان پیشوں کے متعلق سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ غلام فروخت کرتے ہیں۔ امیر معاویہؓ نے فرمایا کہ یہ تجارت تو بہت ہی بری ہے ایک جان کی ذمہ داری اور اتنا ذرا سا نفع جس سے ڈاڑھ بھی گرم نہ ہو[2]

ان غلاموں کی تجارت کرنے پر افسرانِ حکومت میں سے ایک آفیسر مقرر ہوتا تھا جو ان کے اعمال کی نگرانی کرتا اور ان کے تجارتی کاروبار پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس آفیسر کو "قیّم الرقیق" (غلاموں کا منتظم) کہتے تھے۔

یہ غلام مختلف انواع کے ہوا کرتے تھے ان میں سے کچھ تو سیاہ رو ہوتے تھے۔ اس قسم کا اہم ترین بازار مصر، جزیرہ عرب کا جنوبی حصہ اور شمالی افریقہ تھا۔ قافلے جنوب کی طرف سے ان غلاموں کو لے کر جاتے اور سونا لے کر آتے تھے۔ سنہ ۳۱۰ھ میں ایک غلام کی قیمت عموماً دو سو درہم کے لگ بھگ ہوا کرتی تھی۔ کافور خشیدی حبشی جو آگے چل کر مصر کا بادشاہ ہوا اپنے ابتدائی زمانہ میں ۳۱۲ھ ہجری میں اٹھارہ دینار (ایک سو اسی درہم) میں فروخت ہوا تھا کیوں کہ وہ خصی تھا[3]۔ اس کے بارہ میں متنبی نے ناراض ہو کر کہا تھا۔

---

[1] اغانی صفحہ ۱۴۸ جلد ۹ ۔ [2] عیون الاخبار صفحہ ۲۵۰ جلد ۱ ۔ [3] اغانی صفحہ ۲۷ جلد ۲۰ +

مَنْ عَلِمَ الْاَسْوَدَ الْمَخْصِیَّ مَکْرَمَۃً ٭ اَقَوْمُہُ الْبِیْضُ اَمْ اٰبَاءُہُ الصِّیْدُ

اَمْ اُذْنُہٗ فِیْ یَدِ النَّخَّاسِ دَامِیَۃٌ ٭ اَمْ قَدْرُہٗ وَ ھُوَ بِالْفَلْسَیْنِ مَرْدُوْدُ

وَذَاکَ اَنَّ الْفُحُوْلَ الْبِیْضَ عَاجِزَۃٌ ٭ عَنِ الْجَمِیْلِ فَکَیْفَ الْخِصْیَۃُ السُّوْدُ

سیاہ رو خصی سے کسی نیکیات کا کون پتہ لگا سکتا ہے۔ کیا اس کی قوم سفید رو ہے یا اس کے آباد اجداد شریف ہیں۔ کیا اس کے کان دیکھیں جو نخاس کے ہاتھ میں خون آلودہ ہو رہے ہیں یا اس کی قدر اور مرتبہ دیکھیں جو یہ ہے کہ دو ٹکے میں فروخت کر دیا جائے تو خریدنے والا اسے واپس کر دے۔ سفید رو جو اگر بھی آج کل تو اچھے کاموں سے عاجز آگئے ہیں تو سیاہ رو خصی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

ان غلاموں میں سے گورے چٹے بھی ہوتے تھے۔ ان میں زیادہ مشہور ترک اور صقلبی تھے۔ لوگ صقلبی غلاموں کو ترکوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ یہ بات ہمیں خوارزمی کے اس ایک فقرہ سے معلوم ہوتی ہے جو کتاب "یتیمۃ الدہر" میں انہوں نے لکھا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے: "صقلبی غلام نہ ملنے کی صورت میں ترکی غلام سے خدمت لی جاتی ہے۔"[1] گورے غلاموں کی تجارت کی اہم ترین منڈی شہر سمرقند تھا۔ شہر سمرقند اس قسم کے بہترین غلام مہیا کرنے میں بہت مشہور تھا۔ مملکت اسلامیہ میں اور یورپ میں غلاموں کی تجارت بہت بڑھ گئی تھی اور یورپ کے اطراف و جوانب میں ان کی تجارت کرنے والے یہودی ہوا کرتے تھے۔[2]

غلاموں کی مختلف انواع اور ہر نوع کے امتیازات

غلاموں کی انواع میں سے ہر نوع کے خصوصی امتیازات ہوتے تھے جن میں وہ مشہور تھے۔ ہندوستانی باندیاں نازو ادا، نزاکت، صبر و سکون اور بچوں کی عمدہ پرورش میں مشہور تھیں لیکن وہ بہت جلد لاغر ہو کر سوکھ جاتی تھیں۔ ہندوستانی غلام گھر کے انتظام، دستکاریوں کی مہارت وغیرہ میں مشہور ہوتے تھے۔ لیکن ان میں یہ عیب ہوتا تھا کہ عین جوانی میں وہ یکبارگی مرجاتے تھے۔ ہندوستانی غلام اور باندیاں زیادہ تر "قندھار" سے لائی جاتی تھیں۔ سندھ کی باندیاں لاغر پہلو اور لمبے بالوں میں مشہور ہوا کرتی تھیں وہ باندیاں جن کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوتی تھی (یعنی وہ باندیاں جن کی نشو و نما اور تربیت مدینہ منورہ میں ہوتی تھی) نازو انداز، ہنس مکھ ہونے، خوش رہنے اور عشق و محبت کی باتیں کرنے میں زیادہ

[1] یتیمہ صفحہ ۱۱۶ جلد ۴۔ صقالبہ کا لفظ ان اجناس پر بولا جاتا تھا جو بلغاریہ سے لے کر حدود قسطنطنیہ تک سکونت رکھتے تھے۔ [2] MEZ

شہرت رکھتی تھیں۔ ان میں بہترین مغنیہ بننے کی عمدہ استعداد ہوتی تھی۔ وہ باندیاں جن کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی ہوتی نازک کلائیوں اور کھلے جوڑوں اور خمار آلود آنکھوں کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتی تھیں۔ بربری (یعنی مغرب کی) باندیوں کا عمدہ بچے پیدا کرنے میں جواب نہیں تھا۔ ان کی عادات اور اخلاق نرم ہوتے تھے۔ اس لئے ان میں اس کی صلاحیت زیادہ ہوتی تھی کہ جس قسم کے کام کا جی چاہے انہیں عادی بنایا جا سکتا تھا۔
باندیوں کا بلند ترین معیار ـــــ جیسا کہ ابوعثمان دلال نے بیان کیا ہے ـــــ یہ تھا کہ "اس کی اصل تو بربر سے ہو مگر اپنی عمر کے نویں سال میں اپنے ملک سے جدا ہو گئی ہو۔ اس کے بعد تین سال تک مدینہ منورہ میں اور اتنے ہی سال مکہ مکرمہ میں رہی ہو۔ اور سولھواں سال لگنے پر عراق میں آ گئی ہو تاکہ یہاں کی تہذیب کے رنگ میں رنگی جائے۔ اس کے بعد جب پچیس سال کی عمر میں اسے فروخت کیا جائے تو اس میں تمام خوبیاں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اصل کی عمدگی، مدنی عورتوں کی ناز و انداز، مکی عورتوں کی نزاکت اور عراقی عورتوں کی تہذیب و مدنیت"۔

سوڈانی غلام تمام بازاروں میں اٹے پڑے رہتے تھے۔ یہ بے صبری اور بے توجہی اور غیر ذمہ داری میں مشہور تھے۔ ساتھ ہی ڈھول بجانے اور ناچنے کی طرف رغبت رکھنے میں بھی ان کی کافی شہرت تھی۔ لعاب کی کثرت کی وجہ سے ان کے دانت خدا کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ سفید اور خوب صورت ہوتے ہیں۔ عموماً ان کی بغل میں بو ہوتی ہے اور چھونے میں جلد کھردری ہوتی ہے۔ ان وجہوں سے انہیں زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

حبشی باندیاں کمزور اور ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں ان میں سینہ کے امراض کی زیادہ استعداد ہوتی ہے سوڈانی باندیوں کے برعکس نہ اچھا گا سکتی ہیں نہ ناچ سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود اخلاقی اعتبار سے نہایت قوی اور قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ وہ اس کی اہل ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

ترکی باندیاں گوری چٹی، نہایت حسین و جمیل ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں مگر ان میں ایک قسم کی جاذبیت ہوتی ہے۔ عموماً فربہ اور چھوٹے قد کی ہوتی ہیں۔ ان کے بچے بکثرت ہوتے ہیں۔ شریف اور پاکیزہ ہوتی ہیں۔ استمتاع کے لیے بہترین مگر ساتھ ہی قطعاً بھروسہ اور اعتماد کے قابل نہیں ہوتیں۔

رومی باندیاں گوری چٹی سرخی مائل ہوتی ہیں۔ ان کے بال نہایت عمدہ ہوتے ہیں آنکھیں نیلگوں ہوتی ہیں۔ مطیع و فرمانبردار ہوتی ہیں۔ جس قسم کے حالات میں ہوں ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی

ہیں۔ مخلص اور قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ رومی غلام بھی گھر کا انتظام بہت اچھا کرتے ہیں اور ہر امر میں ضبط و نظم کو پسند کرتے ہیں۔ خرچ کرنے میں میانہ روی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ فنون جمیلہ میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔

گوری جنس میں سب سے بدتر ارمنی ہوتے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں مگر ان کے پاؤں نہایت بدشکل ہوتے ہیں۔ عفت اور پاک دامنی تو جانتے ہی نہیں۔ ان میں چوری عام ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت اور بات کرنے کے انداز میں ایک طرح کا کھردرا پن ہوتا ہے۔ اگر تم کسی ارمنی کو ذرا دیر کے لئے بیکار چھوڑ دو تو وہ کسی ایذا رسانی کی تیاری میں لگ جائے گا۔ وہ محض ڈر کی وجہ سے کام کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر وقت اس کے لئے لاٹھی اٹھائے رکھو اور ڈانٹتے ڈپٹتے رہو تاکہ تمہاری منشاء کے مطابق کام کرتا رہے۔[۱]

بہرحال غلام اور خاص طور سے باندیاں مختلف انواع سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہندی۔ سندھی۔ بجی۔ مدنی۔ سوڈانی۔ حبشی، ترکی، رومی اور ارمنی ـــ جاحظ نے نخاسوں کے پاس غلاموں کے ان انواع کو کبوتروں کے رنگوں سے تشبیہ دی ہے۔ صقلبی باندیوں کو انہوں نے سفید رنگ کے کبوتریوں سے اور زنجی باندیوں کو سیاہ رنگ کی کبوتریوں سے تشبیہ دی ہے[۲] الخ

اس بات نے خلفاء اور امراء کے محلات کو مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے غلاموں اور باندیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ ان کی طبیعتیں، عادتیں اور زبانیں مختلف تھیں۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ مامون جب فضل پہ ناراض ہوا تو اسے مامون کے چار غلاموں نے قتل کیا تھا جن کے نام غالب مسعودی حبشی، قسطنطین رومی، فرج دیلمی اور موفق صقلبی تھے۔[۳] ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خلیفہ متوکل کے پاس چار ہزار متنوعہ باندیاں تھیں جو طبیعت کے لحاظ سے مختلف جنسوں سے تعلق رکھتی تھیں۔[۴]

ایک مرتبہ روز سعانین (نصاریٰ کی عید کا دن) میں احمد بن صدقہ مامون کی خدمت میں حاضر ہوا تو مامون کے حضور میں اس وقت بیس رومی باندیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ ان کے گلوں میں ہنسلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی دیباج کے لباس سے آراستہ پیراستہ تھیں۔ ان کے گلوں میں سونے کی صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ اور ہاتھوں میں تنکے اور زیتون لئے ہوئے تھیں۔ مامون نے اس سے کہا۔ احمد! تیرا ناس ہو۔ میں نے ان کے بارہ میں چند اشعار موزوں کئے ہیں۔ ذرا انہیں مجھے گا کر تو سنا دو۔ اس کے بعد مامون نے یہ اشعار سنائے ؎

---

[۱] یہ ٹکڑا ہم نے ۲۵۵ھ کی کتاب سے ترجمہ کیا ہے جو درحقیقت اس کا خلاصہ بھی ہے۔ ۴۴۴ھ نے یہ باتیں ایک رسالہ سے نقل کی ہیں جو ابن بطلان نے غلام خریدنے کے بارہ میں تصنیف کیا تھا۔ یہ رسالہ برلن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہمیں مصر میں اس کی عربی اصل نہیں مل سکی۔ [۲] الحیوان صفحہ ... جلد ۳۔ [۳] ابن جریر صفحہ ۲۵۰ جلد ۱۰۔ [۴] مسعودی صفحہ ۳۰۸ جلد ۲۔

ظِبَاءٌ كَالدَّنَانِيرِ ۔۔۔ مِلَاحٌ فِي الْمَقَاصِيرِ
جَلَاهُنَّ السَّعَانِينُ ۔۔۔ عَلَيْنَا فِي الزَّنَانِيرِ
وَقَدْ زَرْفَنَّ أَصْدَاغًا ۔۔۔ كَأَذْنَابِ الزَّرَازِيرِ
وَأَقْبَلْنَ بِأَوْسَاطٍ ۔۔۔ كَأَوْسَاطِ الزَّنَابِيرِ

ہرنیاں ہیں، دیناروں کی طرح سُرخ اور ملیح، اپنے بالا خانوں میں۔ سعانین کی عید نے انہیں بدصیاں پہنا کر ہمارے سامنے اور بھی ڈمکا دیا ہے۔ کانوں میں ایسے آویزے لٹکا رکھے ہیں جیسے زرزیر کی دُمیں۔ زنبور کی پتلی اور نازک کمر کی طرح نازک اور پتلی کمروں کے ساتھ وہ آرہی ہیں۔

احمد نے یہ اشعار مامون کو گا کر سنائے وہ شراب پیتا رہا اور باندیاں اس کے سامنے رقص کرتی رہیں[1]

مروان بن ابی حفصہ نے ہارون رشید کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تو ہارون رشید نے اسے مال و دولت اور دس رومی غلام انعام میں مرحمت فرمائے[2] محمد بن شفوف ہاشمی کے پاس تین گانے والے غلام تھے۔ ان میں سے دو صقلبی تھے۔ خاقان اور حسین۔ خاقان بہترین گویا تھا۔ اور حسین درمیانہ درجہ کا گویا تھا مگر وہ اس کے ساتھ بہترین سازندہ بھی تھا۔ تیسرا غلام جس کا نام حجاج تھا نہایت حسین اور رومی طرز پر گانے والا تھا[3]

بشار کے پاس ایک سیاہ رنگ کی باندی تھی جس کے بارہ میں وہ کہتا ہے ؎

وَغَادَةٍ سَوْدَاءَ بَرَّاقَةٍ ۔۔۔ كَالْمَاءِ فِي طِيبٍ وَفِي لِينِ
كَأَنَّهَا صِيغَتْ لِمَنْ نَالَهَا ۔۔۔ مِنْ عَنْبَرٍ كَالْمِسْكِ مَعْجُونِ

بعض نازک اندام، سیاہ پانی کی طرح چمکدار، عمدہ اور نرم لڑکیاں ایسی ہیں گویا کہ وہ اپنے مالک کے لئے مشک کی طرح گوندھے ہوئے عنبر سے ڈھال کر بنائی گئی ہیں۔

ابوالشیص شاعر کے پاس ایک سیاہ رنگ کی باندی تھی جس سے اُسے عشق تھا۔ اس کے بارہ میں وہ کہتا ہے

يَا ابْنَةَ عَمِّ الْمِسْكِ الْذَّكِيِّ وَمَنْ ۔۔۔ لَوْلَاكِ لَمْ يُتَّخَذْ وَلَمْ يَطِبِ
نَاسَبَكِ الْمِسْكُ فِي السَّوَادِ وَفِي الرِّ ۔۔۔ يحِ فَأَكْرِمْ بِذَاكِ مِنْ نَسَبِ

خوشبودار مشک کے چچا کی لڑکی اور وہ کہ اگر تو نہ ہوتی تو نہ مشک بنائی جاتی اور نہ وہ خوشبو دیتی سیاہی اور خوشبو میں مشک کو تیرے ساتھ نسبت ہے اور کتنی اچھی ہے یہ نسبت[4]

---

[1] اغانی ص۱۳۸ جلد ۱۹۔ [2] طبری ص۱۱۴ جلد ۱۰
[3] اغانی ص۵۵ جلد ۱۵ [4] اغانی ص۱۱۱ جلد ۱۵

ابراہیم ابن مہدی کے پاس ایک رومی باندی تھی جو گھر کی صفائی کرتی تھی اور عربی اچھی طرح نہیں بول سکتی تھی[1]۔ مہدی کے پاس ایک نصرانی لونڈی تھی جو ہر وقت اپنے سینہ پہ سونے کی ایک صلیب لٹکائے رہتی تھی[2]۔ بہرحال اس کی مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں ــــ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ اکثر کوئی گھر بھی کسی نہ کسی باندی یا غلام سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ مختلف جنسوں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے تصریحات بالا سے یہ بھی دیکھ لیا کہ خلفاء اور امراء نے اپنے ان غلاموں اور باندیوں کو دین و مذہب کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ بعض مرتبہ لونڈی نصرانی ہوتی تھی اور وہ صلیب اور زنار پہنتی تھی۔ وہ اپنا قومی لباس پہنتی اور اپنی زبان میں گفتگو کرتی تھی کیونکہ اسے عربی بولنی نہیں آتی تھی۔ ان باتوں کے اپنے نتائج تھے جن پر ہم آگے چل کر متنبہ کریں گے۔

باندیوں کی تعلیم و تربیت

عباسیوں نے باندیوں کو تعلیم دینے پر ــ ان کی مختلف انواع کے مطابق ــــ خصوصی توجہ سے کام لیا۔ وہ زیادہ تر انہیں گانے بجانے کی تعلیم دیتے تھے۔ گانا بجانا ان کے عہد میں بہت زیادہ پھیل گیا تھا بلکہ انسان کی بنیادی ضروریات میں سے شمار ہونے لگا تھا۔ گانے والے اور گانے والیاں پبلک مقامات، سڑکوں، خلفاء کے محلات، مال داروں اور فقیروں کے مکانات غرضیکہ ہر جگہ نظر آتی تھیں۔ لوگوں کا ذوق گانے بجانے میں حیرت ناک طریقہ پر بڑھتا جا رہا تھا۔ کتابیں اس کی حکایتوں اور تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ لوگوں کو گانے بجانے کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ کوئی گویا کسی پُل پہ گانا شروع کر دیتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور یہ ڈر ہونے لگتا کہ کہیں پُل ہی نہ ٹوٹ کر گر جائے[3]۔ اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ عمدہ گانے کے اثر سے مسحور ہو کر لوگ ستونوں کے ساتھ ٹکریں مارتے تھے[4]۔ خود خلفاء اور ان کی اولاد بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی کہ نئے نئے سُر نکالیں اور ان میں گائیں۔ چنانچہ صاحب اغانی کا بیان ہے کہ واثق اور منتصر دونوں خلیفہ نہایت خوش آواز تھے اور دونوں گاتے تھے اور بہت عمدہ گاتے تھے[5]۔ انھوں نے اس موضوع سے متعلق ایک طویل اور مستقل باب باندھا ہے جس میں بتایا ہے

---

[1] اغانی صفحہ ۱۷ جلد ۹، [2] طبری صفحہ ۳۰ جلد ۱۰، [3] اغانی صفحہ ۱۲۷ جلد ۱۸، [4] اغانی صفحہ ۱۵۶ جلد ۱۵، [5] اغانی صفحہ ۱۶۳ جلد ۸

کہ خلفاء کی اولاد نے گانے کے فن میں کیا کیا کاری گریاں دکھائی تھیں[1]۔ عُلَیّہ کو جو خلیفہ مہدی کی صاحب زادی ہیں نہتر راگوں پر قدرت حاصل تھی۔ احمد بن داؤد قاضی کا بیان ہے کہ میں گانے کو بہت ناپسند کرتا اور گانے والوں پر طعن و تشنیع کیا کرتا تھا۔ ایک دن معتصم، شماسیہ کی طرف نکل کر گئے ان کے ساتھ تعیش و تنعم کے پورے سازو سامان تھے۔ انہوں نے شراب نوشی شروع کی اور میری تلاش میں آدمی بھیجا۔ میں پہنچا۔ میں ذرا قریب پہنچا تو گانے کی آواز سنی۔ اس گانے نے مجھے وارفتہ کر دیا اور ہر چیز سے بے خبر بنا دیا حتیٰ کہ کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں اپنے غلام کی طرف متوجہ ہوا۔ کہ اس سے اس کا کوڑا مانگ لوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ بقسم! میرا کوڑا بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آخر تمہارا کوڑا کیوں ہاتھ سے گر گیا؟ وہ کہنے لگا کہ میں ایک ایسی آواز سن رہا ہوں جس نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس عالم بے خبری میں کوڑا میرے ہاتھ سے کہیں گر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پر بھی بعینہ وہی اثر ہوا ہے جو مجھ پر ہوا تھا۔ قاضی احمد بن داؤد فرماتے ہیں کہ میں گانے کے ساتھ سازوں کے استعمال کو بہت ہی بُرا سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگوں کو وارفتہ کر دیتے اور ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیتے۔ میں اس سلسلہ میں معتصم سے مناظرے کیا کرتا تھا جب میں اس کے حضور میں اس دن حاضر ہوا تو میں نے اس دن کا واقعہ اسے سنایا جسے سن کر وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ میرے چچا مجھے گا گا کر یہ شعر سنا رہے تھے جس سے تم اتنے مسحور ہو گئے۔

إِنَّ هٰذَا الطَّوِيْلَ مِنْ آلِ حَفْصٍ نَشَرَ الْمَجْدَ بَعْدَ مَا كَانَ مَاتَا

خاندان حفص کے اس لمبے آدمی نے بزرگی اور عظمت کو پھیلا دیا ہے اس کے بعد کہ وہ مردہ ہو گئی تھی

اگر تم نے اپنے مناظروں سے توبہ کر لی ہو جو تم گانے کی مذمت میں ہم سے کرتے رہتے ہو تو میں ان سے درخواست کروں کہ وہ اس شعر کو دوبارہ گائیں۔ چنانچہ میں نے توبہ کی اور انہوں نے وہ شعر دوبارہ گایا۔ میں اس سے کہیں زیادہ مسحور ہو گیا جتنا میں دوسروں کے متعلق سنا کرتا اور اس پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اس دن سے میں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا[2]۔

گانے کے ساتھ اس شغف نے ان لوگوں کو راغب کیا کہ وہ باندیوں کو گانے کی تعلیم دلائیں،

---

[1] اغانی صفحہ ۳۵ جلد ۱۰، ونیز جلد پنجم [2] اغانی صفحہ ۵۵ جلد ۹

تاکہ جہاں ان کا حسن و جمال جنت نگاہ ہو ساتھ ہی ان کا گانا بھی ان کے لئے فردوس گوش بن سکے۔ گانا سیکھنے کے ساتھ ساتھ انہیں عربی ادب بھی سیکھنا پڑتا تھا کیونکہ لوگ ان دنوں زیادہ تر عربی کے فصیح و بلیغ اشعار ہی گانے میں پسند کرتے تھے مثلاً عمر بن ابی ربیعہ، بشار بن برد، مسلم بن الولید اور ابو العتاہیہ وغیرہ کے اشعار۔ گانے والی ان کے اشعار کو اس وقت تک کامیابی کے ساتھ نہیں گا سکتی تھی جب تک اس قسم کے بہت سے اشعار اُسے یاد نہ ہوں اور حروف کے مخارج کو اچھی طرح اُسے کافی لٹریچر پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا۔

بلکہ ہم نے تو گانے والیوں کے متعلق ایسی بہت سی روایات دیکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گاتی تھیں تو اشعار اور راگ خود ان کی اختراع ہوا کرتے تھے۔

ابو دلامہ شاعر کہتا ہے۔

هٰذِی رِسَالَةُ شَیْخٍ مِنْ بَنِی اَسَدٍ ۔۔۔ یُهْدِی السَّلَامَ اِلَی الْعَبَّاسِ فِی الصُّحُفِ

تَخُطُّهَا مِنْ جَوَارِ الْمِصْرِ کَاتِبَةٌ ۔۔۔ قَدْ طَالَمَا ضَرَبَتْ فِی اللَّامِ وَالْاَلِفِ

وَطَالَمَا اخْتَلَفَتْ صَیْفًا وَشَاتِیَةً ۔۔۔ اِلٰی مُعَلِّمِهَا بِاللَّوْحِ وَالْکَتِفِ

حَتّٰی اِذَا نَهَدَ الثَّدْیَانِ وَامْتَلَأَ ۔۔۔ مِنْهَا وَخِیفَتْ عَلَی الْاِسْرَافِ وَالْقَرَفِ

صِینَتْ ثَلَاثَ سِنِینَ مَا تَرٰی اَحَدًا ۔۔۔ کَمَا یَصُونُ تِجَارُ دُرَّةَ الصَّدَفِ

یہ بنو اسد کے ایک بوڑھے آدمی کا خط ہے جس میں وہ عباس کو اپنا سلام بھیجتا ہے یہ خط ان چند صحیفوں کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے جو مصر کی باندیوں میں سے ایک لکھنے والی باندی نے لکھے ہیں جس نے لام اور الف (حروف نویسی) کی بڑی ہی مشق بہم پہنچائی ہے۔ سردی اور گرمی میں وہ عرصۂ دراز تک تختی اور وقتی لے کر اپنے استاد کے پاس کتابت کا فن سیکھنے کے لئے جاتی رہی حتّٰی کہ اس کے پستان اُبھر آئے اور بھر گئے اور اس کے متعلق یہ اندیشہ کیا جانے لگا کہ کہیں وہ کسی لغزش میں آ کر کسی بُرائی میں گرفتار نہ ہو جائے تو تین سال سے اسے پردہ میں بٹھا کر اس کی اس طرح حفاظت کی جاتی ہے کہ وہ کسی آدمی کو بھی نہیں دیکھ سکتی جیسا کہ تجارت پیشہ لوگ سیپی کے اندر موتی کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔

حُریب مغنیہ، باندیوں کو اشعار رواں کرایا کرتی تھی تاکہ وہ انھیں عمدگی کے ساتھ گا سکیں[۱]۔

امام میرد کا بیان ہے کہ مجھ سے امام جاحظ نے ابراہیم ابن السندی سے نقل کیا کہ میرے پاس "حمدونہ" کی باندی "ہاشمیہ" اپنی مالکہ کی ضرورتوں سے آجایا کرتی تھی۔ جب وہ آتی تھی تو مجھے اپنے حواس بجا کرکے سارے خطرات ذہن سے نکال کر ہمہ تن ذہن کو اس کی طرف متوجہ کر دینا پڑتا تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے جسے میں سمجھ نہ سکوں کیونکہ لٹریچر پہ اس کی بہت ہی گہری نظر تھی اور اس بات پر اسے بڑی ہی قدرت حاصل تھی کہ زبان وہ کچھ ادا کرے جو اس کے دل میں ہو ــــ اس قسم کی باتیں ریطہ بنت ابی العباس کی دونوں باندیوں خالصہ اور عتبہ کے متعلق بھی نقل کی جاتی ہیں[۲]۔

مسعودی کا بیان ہے کہ جب متوکل خلیفہ ہوا تو ابن طاہر نے اسے تحائف و ہدایا بھیجے۔ ان میں سو غلام اور باندیاں تھیں۔ ان ہدایا میں ایک باندی تھی جس کا نام "محبوبہ" تھا۔ یہ باندی طائف کے ایک آدمی کے پاس تھی جسے اس نے کافی عربی لٹریچر اور ثقافت کی بڑی گہری تعلیم دی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے اسے مختلف علوم و فنون کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا۔ اسے ان تمام علوم کی بڑی اچھی بصیرت حاصل تھی جن کی بصیرت بڑے بڑے علماء ہی کو ہو سکتی ہے۔ متوکل اس باندی کی بڑی عزت کرتا تھا۔

لہٰذا باندیاں زیادہ تر ادب اور لٹریچر اور دیگر علوم و فنون اور خصوصیت کے ساتھ گانے کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اور ان تعلیمات کی وجہ سے ان کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکیں گے کہ ایک باندی فروخت کرنے کے لئے پیش کی گئی تو اس کی قیمت تین سو دینار لگائی گئی۔ اس باندی کو ابراہیم بن مہدی نے گانے کی تعلیم دی اور اس کے بعد جب اسے فروخت کے لئے پیش کیا گیا تو اس کی قیمت تین ہزار دینار لگائی گئی[۳]۔ عریب، مشہور مغنیہ پانچ ہزار دینار میں فروخت ہوئی تھی[۴]۔

دحمان نے ایک باندی دو سو دینار میں خریدی اور اسے تعلیم و تربیت کے بعد دس ہزار دینار میں

---

۱ نشوار المحاضرہ صفحہ ۱۳۲ جلد ۱۔ ۲ الکامل للمبرد صفحہ ۲۷۹ جلد ۲ ۳ مروج الذہب صفحہ ۳۹ جلد ۲ ۴ اغانی صفحہ ۱۰۹ جلد ۱۴ –

فروخت کیا[1]۔ ہارون رشید نے موصل سے ایک باندی چھتیس ہزار دینار میں خریدی تھی۔ کیونکہ ہارون رشید سمجھتا تھا کہ وہ باندی اس کے لائق اور اس کی طبیعت کے مناسب ہے[2]۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ابراہیم موصلی کو جو ہارون رشید کے مغنی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ۔ باندیوں کو تعلیم و تربیت دینے اور انہیں مہذب بنانے کا بہت زیادہ سلیقہ اور شوق تھا۔ انہوں نے سب پہلے اس امر کی طرف توجہ کی۔ ان کے بیٹے کا بیان ہے کہ "لوگ خوب صورت باندیوں کو گانا نہیں سکھاتے تھے، بلکہ زرد رو اور سیاہ فام باندیوں کو گانے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حسین و جمیل باندیوں کو جس نے گانے کی تعلیم دی وہ میرے والد تھے۔ انہوں نے باندیوں کی تعلیم و تربیت پر ہر ممکن سعی فرمائی اور ان کی قدر کو بڑھانے میں بڑا کام کیا"۔ اس سلسلہ میں ابو عینیہ شاعر کے یہ اشعار قابل توجہ ہیں۔ ابو عینیہ کو ایک باندی سے عشق ہو گیا تھا، اس باندی کا نام "امان" تھا۔ اس کے مالک نے اس کی بڑی گراں بہا قیمت مانگی تھی۔

قُلْتُ لَمَّا رَأَيْتُ مَوْلَى أَمَانٍ ۔۔۔ قَدْ طَغَى سَوْمُهُ بِهَا طُغْيَانَا

لَا جَزَى اللّٰهُ الْمَوْصِلِيَّ أَبَا إِسْحٰقَ ۔۔۔ عَنَّا خَيْرًا وَلَا إِحْسَانَا

جَاءَنَا مُرْسَلًا بِوَحْيٍ مِنَ الشَّيْطٰنِ ۔۔۔ أَغْلَى بِهِمْ عَلَيْنَا الْقِيَانَا

مِنْ غِنَاءٍ كَأَنَّهُ سَكَرَاتُ الْ ۔۔۔ حُبِّ يُصْبِي الْقُلُوبَ وَالْآذَانَا

جب میں نے "امان" کے مالک کو دیکھا کہ وہ اس کی قیمت لگانے میں حدود سے متجاوز ہو گیا ہے تو میں نے کہا۔ خدا ابو اسحٰق موصلی کو ہم لوگوں کی طرف سے جزائے خیر نہ دے اور اس پر احسان نہ کرے۔ وہ شیطان کی طرف سے وحی لے کر، رسول بن کر آیا اور اس نے باندیوں کا نرخ انہیں گانا سکھا کر گراں کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گانا محبت کی سکرات ہے جس سے دل اور کان دونوں یکساں طور پر گرفتار محبت ہو جاتے ہیں[3]۔

ابراہیم موصلی اور یزید حوراء نے باندیوں کو خریدنے اور انہیں گانا سکھانے کے لئے ایک کمپنی بنائی تھی۔ اور نفع میں

[1] اغانی صفحہ ۳۴، جلد ۵ [2] اغانی صفحہ ۲، جلد ۵ [3] اغانی صفحہ ۹ جلد ۵

وہ دونوں شریک تھے[1]۔

ثقافت اور فنون پر پابندیوں کے اثرات

ان پابندیوں نے ایک نئی قسم کی تہذیب و ثقافت پھیلا دی تھی جو عباسیوں جیسی مدنیت میں ناگزیر تھی یہ امر تو ہر مدنیت ہی میں ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ نئی قسم کی تہذیب و ثقافت فنون لطیفہ کا ترقی یافتہ فنی ذوق تھا اس عہد میں حرکتِ علمیہ کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری حرکت بھی چل رہی تھی جو کسی طرح پہلی حرکت سے فروتر یا کم نہیں تھی۔ یہ فنی حرکت تھی۔ اس میں گانا بجانا، نقاشی، صورت گری اور رقص و سرود شامل تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کا جمالیاتی ذوق بڑی شدت کے ساتھ بیدار ہو چکا تھا۔ ان کے شعراء ــــ خصوصیت کے ساتھ مسلم بن الولید اور ابونواس وغیرہ ــــ نے حسن و جمال کی تعریف، اس میں وارفتگی اور بغیر کسی تکان کے اس میں مشغولیت کے مضامین میں بڑے ہی تفنن سے کام لیا۔ ابونواس کہتا ہے۔

لِلْحُسْنِ فِيْ وَجَنَاتِهٖ بِدَعٌ　　مَا اِنْ يَمَلُّ الدَّرْسَ قَارِيْهَا

حسن کے لئے اس کے رخساروں میں ایک عجیب بات ہے۔ ان کا پڑھنے والا اور مطالعہ کرنے والا کبھی اُکتاتا نہیں۔

جاحظ کا بیان ہے کہ جو کوئی مُرغے اور مُرغی کو پانی پیتا ہوا دیکھ لے وہ کتنا ہی پیاسا کیوں نہ ہو۔ مُرغے اور مُرغی کے پانی پینے کی بد ذوقی کو دیکھ کر اس کی پیاس جاتی رہتی ہے۔ لیکن جو کوئی کبوتر کو پانی پیتا ہوا دیکھ لے وہ کتنا ہی سیراب ہو کر کیوں نہ آرہا ہو، کبوتر کے پانی پینے کے حسن کو دیکھ کر اس کا جی بھی چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی پانی میں مُنہ ڈال دے[2]۔ اس سے ــــ بلاشبہ ــــ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دنوں لوگوں کا جمالیاتی شعور کس قدر شدید ہو گیا تھا۔ عتابی ہر مجلس کا جمال اسے شمار کرتا تھا کہ اس کی چھت بھی سُرخ رنگ کی ہو اور فرش بھی سُرخ رنگ ہو۔ بشار کہتا ہے۔

هِجَانٌ عَلَيْهَا حُمْرَةٌ فِيْ بَيَاضِهَا　　تَرُوْقُ بِهَا الْعَيْنَيْنِ وَالْحُسْنُ اَحْمَرُ

وہ دو غلی نسل کی ہے۔ اس میں سفیدی کے ساتھ سرخی ملی ہوئی ہے جس سے آنکھیں تر و تازہ ہو جاتی ہیں اور حسن تو نام ہی سُرخی کا ہے۔

---

[1] اغانی صفحہ ۳، جلد ۳ [2] الحیوان صفحہ ۳۴۳ جلد ۵

جیساکہ ان لوگوں میں جمال صورت کا شعور بیدار ہو گیا تھا اسی طرح جمالِ معنیٰ کا شعور بھی بیدار ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسن روح اور حسن گفتگو کے متعلق بھی انہوں نے اس عہد میں بہت کچھ کہا۔ بشار یہ کہتا ہے کہ

وَ كَانَّ رَجْعَ حَدِيْثِهَا   قِطَعُ الرِّيَاضِ كُسِيْنَ زَهْرًا

وَ كَانَّ تَحْتَ لِسَانِهَا   هَارُوْتَ يَنْفُثُ فِيْهِ سِحْرًا

وہ جب باتیں کرتی اور باتوں کا جواب دیتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی کیاریاں ہیں جس میں پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان کے نیچے ہاروت بیٹھا ہوا ہے جو اس کی ہر بات میں جادو پھونک دیتا ہے۔

اور کہتا ہے۔

وَ بِكْرٍ كَنُوَّارِ الرِّيَاضِ حَدِيْثُهَا   تُرُوْقُ بِوَجْهٍ وَاضِحٍ وَ قَوَامِ

بعض کنواری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی باتیں باغ کے پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ اپنے روشن چہرے اور سیدھے قد سے دلوں پر چھا جاتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جمالیاتی شعور کی بیداری اور اس کے ماتحت فنونِ لطیفہ کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ باندیاں ہی تھیں۔ لوگ اس عہد میں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں ان باندیوں کے محض جسمانی حسن کے پہلو پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے فنی جمال کے پہلو پہ بھی توجہ دیتے تھے تاکہ دونوں طرح کی خوبصورتیاں ان کے پاس جمع ہو جائیں۔ گانے اور ناچنے کی طرف ان کو میلان تھا نئے نئے طرح کے لباسوں کا انہیں شوق تھا۔ وغیر ذالک۔ انہوں نے باندیوں کو یہ فنون سکھانے شروع کئے۔ اور بہت جلد یہ فنی شعور مردوں سے باندیوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ بلند پایہ مغنیوں نے اپنی باندیوں کو اپنے ناگ، ٹھمر اور اپنے گانے کا انداز سکھانا شروع کیا۔ چنانچہ ابراہیم موصلی اپنی باندیوں کو اپنے فن کی تعلیم دیتے تھے حتیٰ کہ وہ ان کے فن میں کمال حاصل کر لیتی تھیں۔ عبد اللہ ابن طاہر مکمل علمی انداز میں گانا سکھاتے تھے۔ وہ نئے نئے راگ بناتے اور باندیوں کو سکھاتے تھے۔

مغنی ان دنوں دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک تو پرانی جماعت تھی اور دوسری نئی جماعت۔ اسی طرح باندیوں کے بھی دو گروہ ہو گئے تھے کیونکہ جن سے انہوں نے تعلیم پائی تھی خود ان کے دو گروہ تھے۔ کتاب الاغانی گانے والی باندیوں کے حالاتِ زندگی سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً عُریب، مقیم، ہذلی، ذات الخال، فریدہ وغیرہ۔ صاحب اغانی نے لمبی لمبی فصلوں میں ان باندیوں کے نوادرات اور ان میں سے ہر ایک کے خصوصی امتیازات اور برتری کی انواع بیان کی ہیں۔

اب ہم ان فنون کی کچھ انواع بیان کریں گے جو ان باندیوں نے پھیلائی تھیں۔

ان میں سے سب سے پہلی چیز گانا تھا۔ عمدہ گانوں سے ان باندیوں نے پورے عراق کو بھر کر رکھ دیا تھا۔ لہو و لعب اور عشق و محبت تو اس کے اثرات تھے ہی۔ یہ باندیاں دو طرح کی تھیں۔ ایک تو خاص لوگوں کی باندیاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ خلیفہ کی اپنی باندیاں تھیں جو اسے گانا سناتی تھیں اور امراء اور مالدار لوگوں کی باندیاں بھی اسی طرح کی باندیاں ہوتی تھیں۔ پھر یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو باندیوں کے تحفے دیتے تھے تاکہ ان کے ذوق تجدد کی تسکین ہو سکے کیونکہ ایک ہی طرح کی آواز سنتے سنتے وہ اکتا جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میں کچھ تبدیلی ہو سکے۔

ایک دوسری قسم عام گانے والیوں کی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی نخاس جو ان کا مالک ہوتا کسی مقام پہ انہیں گانے کے لیے پیش کرتا جہاں ان کا گانا سننے کے لئے نوجوان جمع ہو جاتے اور ان پر خرچ کرتے۔ اس کا ایک نمونہ وہ حکایت ہے جو صاحب اغانی نے " ابن رامین" کے متعلق نقل کی ہے۔ ابن رامین کا کوفہ میں اپنا مکان تھا۔ اس کے پاس کئی گانے والی باندیاں تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت " سلامت زرقاء" کی تھی۔ ابن رامین کوفہ میں سب سے بڑا گانے والی باندیوں کا کاروبار کرنے والا تھا۔ اس کے مکان میں نوجوان گانا سننے اور شراب پینے کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ شعراء اس کے اور اس کی گانے والی باندیوں کے بارے میں اشعار کہتے تھے۔ اس کے مکان پر جن لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی ان میں روح بن حاتم مہلبی، محمد ابن اشعث، معن ابن زائدہ اور ابن المقفع جیسے جلیل القدر لوگ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ گانا سنتے اور دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ غزل کے اشعار سناتے تھے۔ جب ابن رامین اپنی ساری باندیوں کو لے کر حج کے ارادہ سے روانہ ہوا، تو شعراء نے اس کی مجلس کی جدائی اور ان لوگوں کی کثرت کے بیان میں جو اس کے گھر پہ آیا کرتے تھے اشعار

کہے۔ ان میں سے کسی ایک کے یہ اشعار بھی ہیں :

أَيَعْلَمُ حَالِ يَا ابْنَ رَامِيْنِ، حَالُ الْمُحِبِّيْنَ الْمَسَاكِيْنِ
تَرَكْتَهُمْ مَوْتَىٰ وَلَمْ يَتْلَفُوا قَدْ جُرِّعُوا مِنْكَ الْأَمَرَّيْنِ
وَسِرْتَ فِيْ رَكْبٍ عَلَىٰ طِيَّةٍ رَكْبِ تِهَامٍ وَيَمَانِيْنِ
يَا رَاعِيَ الذَّوْدِ لَقَدْ رُعْتَهُمْ وَيْلَكَ مِنْ رَوْعِ الْمُحِبِّيْنِ
فَرَّقْتَ جَمْعًا لَا يُرَىٰ مِثْلُهُمْ بَيْنَ دُرُوْبِ الرُّوْمِ وَالصِّيْنِ

اے ابن رامین تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ محبت کرنے والے مسکینوں کا کیا حال ہے ؟ تو انہیں مُردہ کرکے چھوڑ گیا مگر وہ ختم بھی تو نہ ہو گئے۔ اُنہیں تیری طرف سے دو کڑوی چیزیں گھونٹ گھونٹ کرکے پینی پڑ رہی ہیں۔ تو ایک قافلہ کے ساتھ سواری پر بیٹھ کر چل دیا وہ قافلہ تہامہ اور یمن والوں کا تھا۔ اے اونٹوں کو ہنکانے والے تو نے انہیں خوف زدہ کر دیا۔ تیرا ناس ہو محبت کرنے والوں کو خوف زدہ کر دیا۔ تو نے ایک ایسی جماعت کو پراگندہ کر دیا۔ جن جیسی جماعت روم اور چین کے محلوں میں بھی نہیں مل سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باندیوں نے معاشرہ کے اندر رندی و آزاد منشی علانیہ اظہار عشق و محبت کو پھیلا کر بڑے ہی بڑے اثرات مرتب کئے۔ میں نے رسالہ" ایقان" ـــ جو جاحظ کی طرف منسوب ہے ـــ یا کتاب "موشی" میں گانے والیوں کی مذمت میں "وشاء" کا بیان پڑھا ہے وہ پتہ لگا سکتا ہے کہ ان باندیوں کا معاشرہ پر کتنا گہرا اثر تھا جس کا سایہ اس عہد کے رند مشرب اور آزاد خیال شعراء کے کلام پر بہت کافی پڑا تھا۔ اور رند مشرب اور آزاد خیال شعراء ہی کی اس زمانہ میں کثرت تھی[1]۔ جاحظ نے ان نوجوان عورتوں کے خراب ہو جانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا ہے، ایک گانے والی عورت فتنہ سے کس طرح بچ سکتی یا کس طرح عفیف اور پاک دامن رہ سکتی ہے ؟ خواہشاتِ نفسانی ہی اس کا ذریعۂ معاش ہوتی ہیں اور اسے ایسی زبانیں اور ایسے اخلاق سیکھنے پڑتے ہیں جن سے وہ دوسروں کو خوش رکھ سکے۔ وہ پیدائش سے لے کر اپنے مرنے کے وقت تک ان

---

[1] الموشی صفحہ ۹۵ ومابعد۔

حالات میں زندگی گزارتی ہے جو لہو و لعب سے تعلق رکھتے ہیں اور خدا کو یاد کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں میں انہیں زندگی گزارنی پڑتی ہے جو رند مشرب اور اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن سے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات سننے میں نہیں آتی۔ نہ ان سے ثقافت، دین داری، مروت وغیرہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے جو گانے میں ماہر ہوتی ہیں وہ چار چار ہزار تال اور سُر بلکہ ان سے بھی زیادہ نقل کرتی ہیں۔ ہر تال اور سُر دو شعر یا چار شعروں میں گو ادا ہوتا ہے۔ یہ اشعار ان اشعار سے الگ ہوتے ہیں۔ جو ویسے ہی ان کو یاد کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ان اشعار کو جمع کیا جائے تو اس قسم کے کم از کم دس ہزار اشعار نکلیں گے جن میں سے کسی ایک میں بھی خدا کا نام نہیں ہوتا۔ خدا سے غافل کرنے والے مضامین ہی ہوتے ہیں ان میں سے کسی شعر میں خدا کے عذاب سے ڈرانے یا ثواب کی رغبت کے مضامین نہیں ہوں گے سارے اشعار میں عشق، محبت، اشتیاق وغیرہ کا ذکر ہوگا۔ پھر ایک گانے والی عورت کو اپنے فن کی خاطر ہمیشہ اس قسم کی چیزیں پڑھنی پڑتی ہیں اور ہمہ تن ان پہ متوجہ رہنا پڑتا ہے اور رند مشرب لوگوں سے اسے یہ چیزیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ انہیں وہ چھوڑ بھی نہیں سکتی کیونکہ اگر وہ ان چیزوں کو چھوڑتی ہے تو اس کی مقبولیت میں کمی آتی ہے اور وہ ایک مقام پہ کھڑی رہ جاتی ہے۔ جو آدمی ایک مقام پہ کھڑا ہو کر رہ جائے ظاہر ہے کہ وہ نقصان ہی کی طرف جا رہا ہے[1] اس کے علاوہ باندیوں نے خوش ذوقی کی بھی بہت سی چیزیں پھیلائیں جن میں لوگوں نے ان کی پیروی کی اور ان کے نقوش قدم پہ چلے۔ مثلاً پھولوں سے محبت اور ان کا عشق۔ اغانی کا بیان ہے کہ علی ابن ہشام کی باندی کو بنفشہ کے پھول بہت ہی پسند تھے۔ اس کے پاس طرح طرح کے پھول اور خوشبوئیں رہا کرتی تھیں۔ چونکہ اسے یہ چیزیں بہت ہی پسند تھیں۔ اس لئے بہت کم اس کی آستین ان چیزوں سے خالی رہتی تھی۔ اسے جب بھی دیکھو ایسی نظر آتی تھی جیسے اسے ابھی ابھی باغ کی کسی شاخ سے توڑ کر لایا گیا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کو اب پھولوں سے نئے نئے مضامین سوجھنے لگے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

اَهْدَتْ اِلَيْهِ بُنَفْسَجًا يُسَلِّيهِ   تُنْبِيهِ اَنَّ بُنَفْسِهَا تَفْدِيهِ

فَارْتَاحَ بَعْدَ صَبَابَةٍ وَكَآبَةٍ   دُرَجَا بِحُسْنِ الظَّنِّ اَنْ تُدْنِيهِ

اس نے اسے تسلی کی خاطر بنفشہ کا پھول تحفہ میں بھیج دیا جس سے اس طرف اشارہ تھا کہ وہ اس

---

[1] رسالۃ القیان ص ۷۲

پہ اپنی جان قربان کرتی ہے۔ وہ عشق و محبت اور اس کی مشقت و تکلیف کے بعد راحت محسوس کرنے لگا۔ اور اسے نیک گمان کی وجہ سے یہ امید بندھ گئی کہ وہ اسے اپنا قرب بخش دے گی۔

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے کہ

سُرَّ بِالْآسِ الَّذِیْ اَھْدَتْ لَہٗ ثُمَّ لَمَّا اَھْدَتِ الْوَرْدَ جَزِعْ

ذَاکَ اَنَّ الْاٰسَ بَاقٍ دَائِمٌ وَلِاَنَّ الْوَرْدَ حِیْنًا یَنْقَطِعْ

اس نے اسے آس کے پھول تحفہ میں بھیجے تو وہ خوش ہو گیا لیکن اس کے بعد جب اس نے گلاب کا پھول تحفہ میں بھیج دیا تو وہ فریاد کرنے لگا۔ وجہ یہ کہ آس تو ہمیشہ باقی رہتا ہے لیکن گلاب کے پھول کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

ایک دوسری قسم کی عجیب چیز لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ عمدہ قسم کے اشعار اور ظرافت آمیز جملے زر دوزی کے کام سے قمیصوں، چادروں، آستینوں وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے۔ ماوردی کا بیان ہے کہ میں نے ایک باندی کو دیکھا ہم اس وقت محمد بن عمرو بن سعدہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے .... وہ باندی ایک قمیص پہنے ہوئے تھی جس کے دامن پہ یہ شعر لکھا ہوا تھا

اَفِیْئُ مَنْکِ بِوُدٍّ لَا یُغَیِّرُہٗ نَأْیُ الْمَحَلِّ، وَلَا صَرْفٌ مِنَ الزَّمَنِ

میں محبت کے ساتھ تیرے پاس سے جا رہی ہوں۔ وہ محبت جسے مقام کی دُوری اور زمانہ کے تغیرات تبدیل نہیں کر سکتے۔

چادر پہ زر دوزی کے ساتھ یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

اَقَلُّ النَّاسِ فِی الدُّنْیَا سُرُوْرًا مُحِبٌّ قَدْ نَأٰی عَنْہُ الْحَبِیْبُ

دنیا میں سب سے کم خوشی اسے نصیب ہوتی ہے جس کا محبوب اس سے دور چلا گیا ہو۔

ماوردی ہی کا بیان ہے کہ میں نے کسی ہاشمی کی باندی کو دیکھا۔ اس باندی کا نام "عریب" تھا۔ وہ ایک زر دوزی کے کام کی قمیص پہنے ہوئے تھی اور اس کے دامن پہ یہ دو شعر لکھے ہوئے تھے۔

وَاِنِّیْ لَاَھْوَاہُ مُسِیْئًا وَمُحْسِنًا وَاَقْضِیْ عَلٰی قَلْبِیْ لَہٗ بِالَّذِیْ یَقْضِیْ

فَحَتّٰی مَتٰی رُوْحُ الرِّضَا لَا یَنَالُنِیْ وَحَتّٰی مَتٰی اَیَّامُ سُخْطِکَ لَا تَمْضِیْ

میں اس سے برابر عشق کرتی رہوں گی خواہ وہ بُرا سلوک کرے یا اچھا سلوک کرے اور میں اپنے دل کے خلاف وہی فیصلے کرتی رہوں گی جو وہ فیصلے کرے گا۔ کب تک مجھے رضامندی کی نوع حاصل نہیں ہوگی اور کب تک تیری ناراضگی کے دن نہیں گذریں گے۔

پیشانیوں پر، موباف باندھنے کی جگہوں پر، مینڈھیوں پر، زناروں پر، رومالوں پر، گدّوں اور بچھونوں پر، تختوں پر، سر کے لباسوں پر، جوتوں پر، موزوں پر اور حتیٰ کہ مہندی کے ساتھ پیروں اور ہتھیلیوں پر اسی قسم کی چیزیں لکھی ہوئی ہوتی تھیں[1]۔

لوگوں میں خوش مذاقی کا یہ شعور بیدار کرنے اور ان کی حدود کا التزام کرنے میں باندیاں بہت کامیاب رہیں۔ حتیٰ کہ خوش مذاق لوگوں کا لباس، نظر، کھانے، پینے غرضیکہ ہر چیز میں ایک خاص انداز قرار پا گیا۔ "وشّاء" نے اس خاص انداز کو لے کر خوش مذاق لوگوں کے لئے اسے قانونی صورت دے کر اپنی کتاب اَلْمُوَشّیٰ میں مدون کر دیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تمام باتوں کا سہرا صرف باندیوں کے سر ہی تھا۔ یقیناً ان کے مالکوں کا بھی اس میں حصہ تھا جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ابراہیم موصلی اور ان جیسے دیگر مغنیوں نے ہی تو ان باندیوں کو گانا سکھایا تھا۔ اور انہیں ان کے راگ اور سُر یاد کر رکھے تھے اور اونچے طبقہ کے لوگوں نے ہی باندیوں کے دلوں میں خوش مذاقی کی یہ تمام چیزیں ڈالی تھیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرہ کے مختلف طبقات میں ان باتوں کو مقبول بنانے اور فنونِ جمیلہ کو ان میں پھیلانے کے اندر صرف باندیوں ہی کا حصہ تھا۔ کیونکہ انہیں ہی ان باتوں میں زیادہ انہماک تھا اور لوگ انہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ لوگوں کو طبعاً ان باتوں کی طرف میلان ہوتا تھا جنہیں یہ باندیاں پسند کرتی تھیں۔

ان باندیوں کا ایک اور بھی احسان تھا۔ یہ باندیاں — جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں — مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں ہندی بھی تھیں، ترکی بھی اور رومی بھی وغیر ذلک۔ ہر قسم کی باندیاں لائی جاتی تھیں۔ ان کی اپنی عادتیں پختگی پا چکی ہوتی تھیں۔ یا تقریباً پختہ ہو چکی تھیں۔ رومی باندیاں اپنے ساتھ گانے اور دیگر انواع میں اپنی قوم کی عادات کو لے کر آتی تھیں۔ یہی حال باقی قوموں کی باندیوں کا بھی

---

[1] اس قسم کی بہت سی چیزیں آپ کو کتاب الموشیٰ میں ملیں گی۔

تھا۔ اس کے بعد یہ مملکت اسلامی میں آئی تھیں اور اپنی عادتوں کو یہاں آکر پھیلاتی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد دوسری قوموں کی باندیوں کے عادات پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور بالآخر قانونِ انتخاب کے مطابق جو بات سب سے زیادہ بہتر ہوتی وہ چل نکلتی اور اس کا رواج پڑ جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کا گانا بجانا بھی منتخب ہوا کرتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جس سے اس شدید نزاع کی توجیہہ ہو جاتی ہے جو اغانی نے نقل کیا ہے کہ مغنیوں کی ایک جماعت قدیم گانوں کے ساتھ وابستگی رکھتی تھی اور دوسری جماعت جدید قسم کے گانوں سے مانوس تھی۔ ظاہر ہے کہ قدیم قسم کے گانے تو وہی تھے جو دولتِ امویہ کے عہد سے معبد اور اس جیسے دوسرے مغنیوں سے مانوس چلے آ رہے تھے۔ اور جدید قسم کے گانے وہ تھے جو فارسی اور رومی نغمات سے ترکیب دے کر بعد میں پیدا کئے گئے تھے۔ بعینہٖ یہی حال دیگر فنون کا بھی تھا۔

باقی فنونِ جمیلہ کی طرح ایک اور فن بھی تھا جس میں باندیوں کے اثرات بڑے نمایاں تھے، یہ دوسرا فن عربی لٹریچر تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں لٹریچر پر عورت کا دو جہت سے بڑا احسان ہوتا ہے (پہلی جہت) تو یہ ہے کہ عورت ہی مردوں کے دلوں میں ان شدید جذبات کو بھڑکاتی ہے جو ان کے سینوں میں طوفان بپا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان کی زبانوں سے نفیس شعر اور پُر معنی لٹریچر کو ادا کراتی ہے۔ (دوسری جہت) فنی اور ادبی شہ پاروں کو جنم دینے میں مردوں کے ساتھ عورت کی شرکت ہے خصوصیت کے ساتھ ان موقعوں پر جو عورت کے شعور کو زیادہ متاثر کر سکیں۔ اور عورتوں کو اس پر زیادہ قدرت ہوتی ہے۔

آزاد عورتوں اور باندیوں میں مقابلہ

عباسی دورِ حکومت میں بھی یہی حالت تھی۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ دونوں جہتوں کے اعتبار سے باندیوں کا پلڑا آزاد عورتوں کے مقابلہ میں کہیں بھاری تھا۔ یعنی ادبی شہ پارے پیدا کرنے کے اعتبار سے بھی اور شعراء کو معانی و مضامین سجھانے کے اعتبار سے بھی۔ اس کی وجہ غالباً اس زمانہ کا نظامِ اجتماعی تھا۔ لوگ ـــــ جیسا کہ ہم جاحظ سے پہلے نقل کر چکے ہیں ـــــ آزاد عورتوں پر بہ نسبت باندیوں کے زیادہ غیرت محسوس کرتے تھے ـــــ آزاد عورتوں کو پردہ میں بٹھاتے تھے اور پردہ میں بڑی شدت برتتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تو وہ پیغام دینے کے لئے کسی عورت ہی کو بھیجتا تھا جو لڑکی کو دیکھ کر آتی اور مرد سے آکر اس کے عیوب اور محاسن بیان کرتی تھی۔ خود مرد اگر چاہتا تو لڑکی کو نہیں

دیکھ سکتا تھا وہ شادی ہو جانے کے بعد ہی اسے دیکھ سکتا تھا۔ لیکن باندیوں کی یہ صورت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے لوگ اتنی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ باندیاں ایک بڑی حد تک بے پردہ ہوتی تھیں کیونکہ وہ تو ہر وقت خریدی اور فروخت کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ بھی کہ باندیاں تو آدمی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتیں اور مالک کی ضروریات کے لئے ہر وقت باہر نکلنے پر مجبور تھیں۔ جب کوئی عام آدمی گانے والی باندیاں رکھنے والوں کے مکانات پر جاکر گانا سننا چاہتا یا گانے والی باندیوں کے ساتھ چہل اور ہنسی مذاق کرنا چاہتا تو یہی باندیاں اس کے اس میلان خاطر کی تسکین کرتی تھیں۔ یہ باندیاں ہی ـــــ بے پردہ ہونے کی وجہ سے وہ عورتیں تھیں جن پر لوگوں کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ کیونکہ آزاد عورتوں کو تو ان کے قریبی عزیزوں کے سوا کوئی غیر آدمی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لہذا یہ چیز بالکل طبعی تھی کہ ادیب اور شعراء اپنے ادب اور شعر کی غذا باندیوں سے ـــ بہ نسبت آزاد عورتوں کے ـــ کہیں زیادہ حاصل کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ لوگ آزاد عورتوں کو تعلیم دینے کے مقابلہ میں ـــ جیسا کہ ظاہر ہے ـــ باندیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے تھے۔ اس کی وجہ خاص تجارتی نقطۂ نظر تھا۔ کیونکہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ بازار میں باندی کے جسم سے زیادہ اس کے علم اور ادب کی قیمت لگائی جاتی تھی۔ اگر ایک جاہل باندی کی قیمت دو سو دینار ہوتی تھی۔ تو مغنیہ اور ادیبہ ہونے کے بعد اس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ الغرض بہر حال ہر زمانہ میں مال و دولت ہی حرکات اجتماعیہ کا مرکز و محور رہا ہے۔ آزاد عورتوں کی تعلیم و تربیت پر ایک چھوٹے سے طبقہ کے سوا عموماً کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ یہ طبقہ اشراف اور امراء کا تھا اور یہ چند گنتی کے لوگ ہوتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ دیکھتے تھے کہ باندیاں تو لوگوں کا سامان تفریح ہیں۔ لہذا جو لوگ اس سامان تفریح کو مہیّا کرنے والے تھے وہ اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق وہ لحظہ بہ لحظہ اسے ترقی دیں کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ باندی اگر مغنیہ، ادیبہ اور موسیقار ہوتی تھی تو لوگوں کے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی تھی اور لوگوں کا اس کی طرف میلان بہت زیادہ ہوتا تھا۔ لہذا لوگوں کی خواہشات کی تسکین کا سامان مہیا کرنے میں وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

ہاں! بہت سی آزاد عورتیں بھی ہمیں ایسی ملتی ہیں جو بعض علوم میں مشغول رہیں۔ لیکن ان کی اس مشغولیت کا زیادہ تر باعث دینی پہلو ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ہمیں کئی محدث عورتیں اور متصوف

عورتیں مل جاتی ہیں لیکن یہاں یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا موضوع تو یہاں فنونِ جمیلہ میں عورتوں کا مشغول ہونا ہے۔ اور باندیاں — بلاشبہ — اس ضمن میں بہت زیادہ ہیں اور ان کے اثرات بھی زیادہ نمایاں ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر انشائی جہت سے دیکھا جائے تو ہمیں بے شمار ایسی باندیاں مل جائیں گی جو بلند پایہ ادیبہ ہوں گی اور مختلف علوم و فنون کی ماہر ہوں گی ایسی ماہر کہ آزاد عورتیں ان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ "عُریب" کے بارہ میں اغانی کا بیان ہے کہ وہ نہایت خوش گلو مغنیہ بلند پایہ شاعرہ اور خوش خط تھی۔ اس کا اندازِ گفتگو نہایت ہی حسین، حسن و جمال اور خوش مذاقی میں نہایت اعلیٰ مرتبہ پہ فائنہ، خوبصورت، بہترین سازندہ، نغموں اور راگوں کو بہترین طور پر سمجھنے والی اور ادا کرنے والی اور شعر و ادب کی بہترین طور پہ بیان کرنے والی تھی۔[۱]

نیز "مقیم" کے بارہ میں اغانی کا بیان ہے کہ — زرد رُو عورت تھی۔ بصرہ میں اس کی پیدائش کسی باندی کے بطن سے ہوئی تھی۔ بصرہ ہی میں نشو و نما پائی اور وہیں لٹریچر اور گانے کی تعلیم حاصل کی۔ اسحاق موصلی سے اس فن کو سیکھا اور اس سے پہلے اسحاق موصلی کے والد سے بھی استفادہ کیا.... اس کا چہرہ نہایت ہی حسین تھا۔ موسیقی اور ادب پہ بڑا عبور تھا۔ شعر کہتی تھی جو اگرچہ بہت عمدہ تو نہیں ہوتے تھے لیکن اس جیسی لڑکی کے لئے بہرحال قابلِ فخر تھے۔[۲] نیز "وَنانیر" کے بارہ میں اغانی ہی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن خالد برمکی کی باندی تھی، نہایت ہی حسین و جمیل چہرہ — نہایت خوش مذاق اور کامل ترین عورت تھی۔ لٹریچر پہ اسے کافی عبور تھا۔ اسے بے شمار گانے اور بے شمار اشعار یاد تھے۔

دوسری طرف — یہ باندیاں شعراء کو شعر کے نت نئے مضامین سجھاتی تھیں اس کا سبب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بشار، ایک باندی پہ عاشق تھا جس کا نام "فاطمہ" تھا۔ اس نے اسے گاتے ہوئے سنا اور اس پہ عاشق ہو گیا۔ اور اس کے بارہ میں بہت سے اشعار کہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے وہ ایک سیاہ فام باندی کے بارہ میں بھی اشعار کہتا رہا ہے۔ دعبل خزاعی۔ مسلم بن الولید۔ صریع الغوانی کی زندگیاں ان واقعات سے بھری پڑی ہیں جو انہیں باندیوں کے ساتھ پیش آئے۔ ان سب نے ان کے بارہ میں اشعار بھی کہے۔ ابونواس

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۷۵ جلد ۱۰ [۲] اغانی صفحہ ۳۱ جلد ۷۔

شاعر ایک باندی پر عاشق تھا جس کا نام "جنان" تھا۔ یہ عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کے خاندان کی باندی تھی۔ یہ بھی نہایت حسین باندی تھی۔ اسے بھی لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھا۔ واقعات عرب اور اشعار وغیرہ کی روایت کرنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ابونواس کو اس کے سوا کسی عورت سے سچا عشق نہیں ہوا۔ ابونواس نے اس کے بارہ میں اپنے بہترین اشعار کہے ہیں۔ عباس ابن احنف کو بھی "فوز" نامی باندی سے عشق تھا۔ یہ محمد بن منصور کی باندی تھی۔ عباس نے اس کے بارہ میں اپنے بہترین اشعار کہے ہیں۔

یہ ہم نے چند مثالیں پیش کی ہیں۔ ورنہ لٹریچر کی کتابیں اس قسم کے اشعار اور واقعات سے بھری پڑی ہیں جو نوجوان طبقہ کے لوگوں شعراء اور ادباء کو ان باندیوں کے ساتھ اس زمانہ میں پیش آتے رہے۔

ادیبوں اور شاعروں کو اس حالتِ اجتماعیہ پر بڑا ہی رشک آتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اس قدر عمدہ اشعار اور ادبی شہ پارے عالم وجود میں آسکے تو دوسری طرف علمائے دین اور علمائے اخلاق کو رونا آتا تھا کہ کس قدر ادبی عریانی اور رندی و اوباشی کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔ اول الذکر حضرات لوگوں کو برانگیختہ کرتے تھے کہ اس حیات نو سے استفادہ کریں اور اس کے ثمرات سے متمتع ہوں تو آخرالذکر حضرات لوگوں کے فسق و فجور کے مرثیے پڑھتے تھے پھر ان سب چیزوں سے بھاگ کر زاہدانہ زندگی اور لذائذ دنیوی سے فرار کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ ان امور کو ہم آئندہ فصل میں بیان کر رہے ہیں۔

فصل پنجم

لہو ولعب کی زندگی اور حقیقت پسندانہ زندگی

کیا لوگ اس عہد میں تعیش و تنعم اور لہو و لعب کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یا پاک دامنی اور حقیقت پسندی کی زندگی گذارتے تھے؟ ابتدائی خلفائے عباسیہ دینی امور کا لحاظ رکھتے اور ان کی پابندی کرتے اور صرف انہی چیزوں تک محدود رہتے تھے جنہیں خدا نے ان کے لئے حلال قرار دیا تھا؟ —— جیسا کہ بعض مؤرخین نے ان کی تصویر کھینچی ہے —— یا بہت سی قیود کو توڑ کر لہو و لعب میں اسراف کی حد تک پہنچ گئے تھے؟ —— جیسا کہ دوسرے لوگوں نے ان کی تصویر کھینچی ہے —— معاشرہ کی حالت ان کے زمانہ میں وسعت، فراخی اور فارغ البالی کی تھی یا تنگی اور فقر و فاقہ کی؟ ان تمام باتوں کے اثرات علم و فن اور ادب پر کیا مترتب ہوئے؟

اس فصل میں ہم ان باتوں کا جواب دینا چاہتے ہیں۔

امویوں اور عباسیوں کے درمیان مقابلہ

جب ہم عمومی انداز سے حیاتِ امویہ اور حیاتِ عباسیہ کے درمیان موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اموی طرزِ حیات زیادہ سے زیادہ سادہ اور تکلفات سے زیادہ دُور تھا۔ جو بدوی، سادہ، عربی ذوق کی نشان دہی کرتا تھا۔ عربی عنصر چونکہ اموی عہد میں غالب تھا اس لئے اس نے اپنے عہد کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی رنگ میں رنگ رکھا تھا۔ وہ ترفہ اور تنعم کی چیزیں اختیار کرنا چاہتے بھی تھے تو دوسری قوموں کے ترفہ و تنعم کی چیزوں میں سے انتخاب کرکے وہ اختیار کرتے تھے۔ انہیں بالکلیہ اور جوں کا توں اختیار نہیں کر لیتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے عربی ذوق اور میلان کے مطابق اس میں ایک طرح کا اعتدال پیدا کر لیا

کرتے تھے اور اسے ایک ایسی چیز بنا دیتے تھے کہ نہ تو وہ عربی ہوتی تھی اور نہ خالص ایرانی اور نہ ہی خالص رومی۔ انہوں نے ایرانی دعوتوں کو دیکھا۔ اور خلفاء اور امراء نے ان دعوتوں کے مطابق اپنی دعوتوں کو بھی ایک طرح سے خوش نما بنانے کی کوششیں کیں۔ لیکن جب ایک عربی بادیہ نشین امیر معاویہ یا عبدالملک کے دربار میں جاتا تو وہ یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی نئی فضا میں آگیا ہے جو اس کی مانوس فضا اور ماحول سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہو۔

ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ " اپنے کسی لڑکے کی ختنہ میں حجاج بن یوسف نے دعوت ولیمہ کا انتظام کرنا چاہا۔ اس نے کسی ایرانی سردار کو بلایا اور ایرانیوں کی دعوتوں کے متعلق اس سے پوچھا۔ حجاج نے اس سے کہا کہ مجھے کسی سب سے بڑی دعوت کا حال سناؤ۔ ایرانی سردار نے عرض کیا کہ اے امیر! مجھے کسریٰ کے ایک مرزبان کی دعوت میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا جس نے ایرانیوں کے لئے اس دعوت کا انتظام کیا تھا۔ اس مرزبان نے چاندی کے خوانوں[1] پر سونے کے بڑے بڑے برتنوں میں کھانا پیش کرنے کا انتظام کیا تھا۔ ہر خوان پر چار آدمیوں کا کھانا تھا۔ اور اسے چار باندیاں اٹھائے ہوئے تھیں۔ ہر خوان پر چار چار آدمی بیٹھ گئے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ان چاروں آدمیوں کے پیچھے پیچھے وہ خوان، اس کے برتن اور اس کی باندیاں بھیج دی گئیں بعد انہی کو عطا کر دی گئیں۔ حجاج نے یہ سن کر کہا۔ غلام! تم اونٹوں کو ذبح کرو اور لوگوں کو کھانا کھلاؤ[2]۔ گویا حجاج نے اس دعوت کے تکلفات کو ناپسند کیا اور بے جا اسراف تصور کیا۔ یہ چیز اس کے عربی ذوق کے خلاف تھی۔ اس نے اسے جھوٹی نمائش اور ایک ایسا اظہار شان شمار کیا جو اس کے لئے مناسب نہیں تھا۔ لہذا اس نے اسے اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کی عادت پر ہی اکتفا کیا۔ ان کا یہی حال دفاتر اور دیگر تہذیبی لوازم و اقسام میں بھی تھا۔ مختصر یہ کہ اموی عہدِ حکومت میں عربی ذوق پوری طرح نمایاں تھا۔ اور دمشق، مکہ، مدینہ اور دیگر شہروں کا تعلق — یعنی اجتماعی جہت سے، سیاسی جہت سے نہیں — ایک مضبوط اور مستحکم تعلق تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے اور ایک دوسرے کے ذوق سے اچھی طرح لطف

---

[1] خوان اس چوکی کو کہتے تھے جس پر کھانا چن کر کھایا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج کل میزیں ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں اس مقصد کے لئے بڑی بڑی چوکیاں ہی ہوا کرتی تھیں۔ [2] ابن خلدون صفحہ ۱۴۵ ج ۱۔

اندوز ہوتے تھے۔ اسلام کو بھی ان کے زمانہ میں اپنی سادگی اور پابندیوں کے ساتھ عباسی عہد کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھا گیا تھا۔

عباسیوں کا یہ حال نہیں تھا۔ اگر اموی خلفاء و امراء دوسری تہذیبوں کی کچھ عادتوں اور باتوں کو اپنے کو اپنے ہاں اپنے رنگ میں رنگ کر منتقل کرتے تھے تو عباسی خلفاء اور امراء ان کے برعکس بالکلیہ طور پر خود ان نئی عادتوں اور نئی پابندیوں کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ذرا "نوروز" کو لے لیجیے۔ "نوروز" پرانے زمانہ سے پارسیوں کی عید چلی آتی تھی۔ ہم نے اموی عہدِ حکومت میں کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے یہ پتہ لگ سکے کہ انہوں نے اسے کوئی اہمیت دی ہو۔ لیکن عباسیوں نے اسے ایک قومی عید بنا لیا تھا۔ وہ اس میں اسی طرح جمع ہوتے تھے جیسے عید الفطر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو تحفے دیتے۔ شعراء قصیدے پڑھتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ خلفاء خاص اہتمام سے دربار منعقد کرتے اور لوگ انہیں مبارک بادیں پیش کرتے تھے۔ یہی حال لباس وغیرہ کا تھا۔ چنانچہ ٹوپی، عباء اور طرح طرح کے ایرانی ملبوس پھیل چکے تھے۔ قاضی لوگ بڑی بڑی ٹوپیاں پہنتے اور خلفاء ٹوپیوں کے اوپر عمامے باندھتے تھے۔ عماموں میں بھی طرح طرح کے تفنن اختیار کئے جاتے تھے چنانچہ مختلف طبقات کے مختلف عمامے ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ ایرانیوں میں دستور تھا۔ خلفاء کا عمامہ اور طرح کا ہوتا تھا۔ فقہاء کا دوسری طرح کا، خچر ہانکنے والوں کا تیسری طرح کا، اعرابیوں کا عمامہ چوتھی طرز کا۔ غرضکہ ہر جماعت کا لباس الگ ہوا کرتا تھا۔ قاضیوں کا لباس الگ ہوتا تھا۔ قاضیوں کے دفتر سے متعلق افراد کا لباس الگ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کا لباس الگ ہوتا تھا۔ اور سلطان کے درباریوں کا اپنے اپنے رتبہ کے لحاظ سے الگ الگ لباس ہوتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگ مبطنہ پہنتے تھے۔ کچھ دُرّاعہ پہنتے تھے اور کچھ "بازبکند" پہنتے تھے۔ شعراء زرکار، کٹاؤ دار اور سیاہ چادریں اوڑھتے تھے ـــ ایک شاعر اس زمانہ میں پرانا لباس پہنا کرتا تھا تو کچھ شعراء نے اس کی ہجو میں اشعار کہے تھے[1]

اموی خلفاء جب کسی کو عطیہ دیتے تھے تو عربوں کے مسلک اور ان کی بدویانہ طرزِ زندگی کے مطابق ان کے عطایا زیادہ تر اونٹوں کی شکل میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن بنو عباس کی حکومت میں ان کے

---

[1] لباس اور انواع کی بحث البیان والتبیین صفحہ ۹۵ جلد ۳ اور اس کے بعد کے صفحات پر دیکھیے۔

انعامات درہم و دینار کی تھیلیاں، کپڑوں کے تخت اور زین اور ساز سمیت گھوڑے وغیرہ ہوا کرتے تھے[1]۔
خلاصہ یہ کہ عباسی عہدِ حکومت میں لوگ ــــ بنو امیہ کے دَورِ حکومت کے برعکس ــــ دوسری قوموں کی عادات و رسوم کی طرف منتقل ہو چکے تھے اور اس میں بہت زیادہ افراط سے کام لینے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے مسلمانوں اور جزیرۂ عرب کے مسلمانوں کے درمیان اجتماعی رشتے اور شکل و صورت کی ہم آہنگی تقریباً ختم ہو چکی تھی یا ختم ہونے لگی تھی۔ اغانی نے ناہض بن ثومہ کے متعلق ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے ــــ
ناہض بن ثومہ ایک بدوی اکھڑ شاعر ہے ــــ اسے حلب میں ایک شادی کی محفل میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا اسے دیکھ کر اس کی عقل چکرانے لگی اور فکر پراگندہ ہو گئی کیونکہ بادیہ نشینی کی زندگی میں اس نے یہ چیزیں خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے دلہن کی آرائش سے انتہائی حیرت ہوئی۔ طرح طرح کے لباسوں اور طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں اور موسیقی کے ایرانی آلات وغیرہ سے وہ دنگ ہو کر رہ گیا۔ جوں جوں اس کا تحیر بڑھتا جا رہا تھا لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے[2]۔ اگر کہیں بد قسمتی سے وہ بغداد میں کسی شادی کی محفل میں شریک ہو گیا ہوتا تو شاید وہ سچ مچ پاگل ہی ہو گیا ہوتا۔

لہو و لعب کا تدریجی ارتقاء

اس زمانہ میں کچھ لوگ لذائذ و نعم میں حدود سے متجاوز ہو گئے اور قصداً افراط سے کام لینے لگے۔ اور لطف اندوزیوں کے نئے انداز اور طریقے ایجاد کرنے لگے تھے۔ جب لطف اندوزی کے کسی ایک انداز سے اُکتا جاتے تو ایک نیا انداز اختراع کر لیتے۔ جب ذرا اس طوفان میں سکون کے آثار نظر آنے لگتے تو اس کے داعی انہیں اُبھارنے لگتے کہ تنعم و تعیش میں ڈوب جانا چاہیے۔
اگر ہم دولت عباسیہ کی تاریخ کا اس ضمن میں تتبع کریں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ یہ حکومت تدریجی قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ اس انتہا تک پہنچی تھی۔ اور ہر خلیفہ ــــ عموماً ــــ اپنے پہلے خلیفہ سے ترف و تنعم کی سیڑھی پر ایک دو درجے بلند ہوتا جاتا تھا۔ اگر ہم اس ترقی کے بیان کے لیے رسمی خط کھینچنا شروع کر دیں تو ہم شاید اس بلندی کی مقدار کو متعین کر سکیں جو یکساں طور پر مسلسل ہر خلیفہ تنعم کی طرف چڑھنے میں

---

[1] ابن خلدون صفحہ ۲۰۵ جلد ۱ [2] یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اغانی صفحہ ۳۶ جلد ۱۲ میں ملاحظہ فرمائیے

برابر طے کرتا جا رہا تھا۔ اور عوام الناس تو ہر زمانہ میں — اور خصوصیت کے ساتھ ان زمانوں میں — اپنے امیر کے تابع ہوتے ہیں۔

دولتِ عباسیہ کی ابتدا ہوئی تو بنوامیہ اور ان کے ممنونین کرم میں سے بے شمار دشمن ان کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ جب خلافت کے لئے سفاح کو اور اس کے بعد منصور کو منتخب کیا گیا تو خود عباسی گھرانے کے بہت سے لوگ ناراض ہو گئے۔ ادھر شیعانِ علیؓ بھی بگڑ گئے۔ لہٰذا قیامِ حکومت کے لئے ایسے خلفاءُ کی ضرورت تھی جو لہو و لعب سے دُور رہتے ہوئے حقائق و واقعات کا مقابلہ کر سکیں اور اپنا پورا وقت حکومت کی تاسیس پر صرف کر سکیں۔ ساتھ ہی اپنے ہم خیال اور ہم نوا پیدا کرنے، دشمنوں کا قلع قمع کرنے اور باغیوں کا خون بہانے پر پوری توجہ دے سکیں۔ حتیٰ کہ یہ دَور ختم ہو گیا۔ معاملات پُرسکون ہو گئے۔ باغیوں کا سرکچل دیا گیا اور دوسرے لوگ مطیع و فرمان بردار بن گئے۔ اور سلطنت میں امن و امان قائم ہو گیا تو اب آنے والے خلفاء کے لئے امن و امان اور سکون و اطمینان کی وجہ سے فراغت کا اتنا وقت مل سکتا تھا جو ترفہ و تنعم اور لہو و لعب میں گزارا جا سکے۔ لیکن وہ سارا وقت ان امور کے لئے نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ ان کو اندرونی معاملات کی تنظیم پر بھی توجہ دینی پڑتی تھی جبکہ اس سے پہلے خلفاء کا سارا دردِ سر خارجی امور کی تنظیم بنا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جب آگے چل کر داخلی اور خارجی معاملات یکساں طور پر استوار ہو گئے اور معاملات اپنے محور پر گردش کرنے اور ان بنیادوں پر یکسانیت کے ساتھ چلنے لگے جنہیں ابتدائی خلفاء نے مضبوطی کے ساتھ استوار کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی خلفاء نے دیکھا کہ مال و دولت کے وہ ذخیرے فراوانی کے ساتھ ان سرچشموں سے مسلسل بہتے چلے آ رہے تھے جو ابتدائی خلفاء نے بیرونی خطرات کی حفاظت اور اندرونی تنظیم کر کے قائم کر دیئے تھے۔ تو اب انہوں نے عیش و عشرت کی داد دینی شروع کی اور خوب خوب داد دی اور اب ان کے پاس اس کے لئے وقت میں بھی کافی گنجائش تھی۔

سفاح

عباسی خلفاء مکمل طور پر ان ادوار کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ ان کی تاریخ ہمارے اس قول کی شاہد ہے۔ چنانچہ ابوالعباس سفاح — ان کا پہلا خلیفہ — حقیقت شناسی اور علم کو لہو و لعب کی انواع پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ مجھے اس آدمی پر تعجب آتا ہے جو علمی ترقیات کو چھوڑ کر جہالت میں بڑھتا جاتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے۔ ابوبکر ہذلی نے ایک مرتبہ پوچھ لیا کہ اے

امیرالمومنین! آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟ سفاح نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ تم جیسے اور تمہارے اصحاب جیسے لوگوں کے ساتھ تو بیٹھتا نہیں۔ اپنی بیوی یا باندی کے پاس اندر چلا جاتا ہے اور بیہودہ باتیں سننے اور خرافات بکنے میں اپنا وقت گذار دیتا ہے۔ جب سفاح نے ام سلمہ سے شادی کر لی تو اس نے قسم کھا لی تھی کہ نہ اس کے بعد کوئی دوسری شادی کرے گا اور نہ ہی استمتاع کے لئے کوئی باندی رکھے گا۔ کچھ مقربان دربار نے اس کی خلافت کے زمانہ میں وسوسہ اندازی کرنی چاہی اور باندیوں اور ان کے انواع و اقسام کا تذکرہ کرکے لذت اور شہوت کے جذبات کو بھڑکانا چاہا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے[1] سفاح کی زندگی محض خوں ریزی کی زندگی رہی[2] اور دشمنوں کی سرکوبی اس کا مشغلہ رہا۔

منصور سفاح کا جانشین منصور ہوا جو دولتِ عباسیہ کی نمایاں شخصیت اور اس کی بنیادوں کو استوار کرنے والی ہستی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے خود اپنے گھرانے اور غیروں میں سے اپنے اور حکومت کے دشمنوں کا صفایا کیا۔ لہذا ظاہر ہے کہ اسے لہو و لعب کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ طبری نے یحییٰ بن سلیم سے نقل کیا ہے کہ "منصور کے گھر میں کبھی لہو و لعب یا لہو و لعب سے مشابہ اور بے کار کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔ سوائے ایک دن کے کہ ہم نے منصور کے بیٹے عبدالعزیز کو دیکھا (اس کا انتقال نوعمری ہی میں ہو گیا تھا) کہ وہ باہر نکلا، کمان گلے میں ڈالے ہوئے عمامہ باندھے ہوئے، چادرہ اوڑھے ہوئے، بالکل ایک اعرابی لڑکے کی ہیئت بنائے ہوئے۔ گھوڑے پر دو خرجینوں کے درمیان نشست پر بیٹھا ہوا۔ ان دونوں خرجینوں میں صقل، جوتے، مسواکیں اور وہ چیزیں تھیں جو اعرابی لوگ کسی کو تحفہ میں دے سکتے ہیں۔ لوگوں کو اس ہیئت کذائی پر بڑا تعجب ہوا اور اسے بالکل ایک نئی سی بات خیال کیا۔ وہ لڑکا پل پر سے گذر کر رصافہ میں مہدی کے پاس گیا اور آتے تحفہ میں وہ تمام چیزیں پیش کیں۔ خرجینوں میں جو کچھ تھا مہدی نے اسے تبدیل کرکے دونوں خرجینوں کو درہموں سے پُر کر دیا۔ لڑکا واپس لوٹ آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بادشاہوں کا ایک کھیل تھا[3]۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگوں نے لڑکے کے اس عمل کو باوجود اس کی سادگی اور لطافت کے ایک

[1] ملاحظہ ہو مسعودی صفحہ ۱۸۰ جلد ۳ و مابعد [2] مسعودی صفحہ ۲۰۰ جلد ۲ [3] طبری صفحہ ۲۹۴ جلد ۹

بات محسوس کیا ـــ ایک مرتبہ منصور نے اپنے مکان میں شور سنا۔ اس نے شور کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ ایک خدمت گار باندیوں کے درمیان بیٹھا ہوا طنبورہ بجا رہا ہے۔ اور باندیاں ہنس رہی ہیں۔ منصور اُٹھ کر اس جگہ گیا جہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ غلام اور باندیوں نے جونہی منصور کو دیکھا سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ منصور نے حکم دیا کہ طنبورہ کو اس خدمت گار کے سر پہ مار مار کر توڑ دیا جائے اور اس کے بعد اس خدمت گار کو فروخت کرا دیا[1]۔ منصور نہایت محتاط آدمی تھا۔ لہو و لعب سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے یہ شعور تھا کہ لوگ اعمال میں اس کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا وہ اس کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتا تھا۔ جب طریف بن تمیم عنبری کے اس نے یہ شعر سُنے :۔

إِنَّ قَنَاتِي لَنَبْعٌ لَا يُؤَيِّسُهَا غَمْزُ الثِّقَافِ وَلَا دُهْنٌ وَلَا نَارُ

مَتَى أُجِرْ خَائِفًا تَأْمَنْ مَسَارِحُهُ وَإِنْ أُخِفْ آمِنًا تَقْلَقْ بِهِ الدَّارُ

إِنَّ الْأُمُورَ إِذَا أُورِدْتُهَا صَدَرَتْ إِنَّ الْأُمُورَ لَهَا وِرْدٌ وَإِصْدَارُ

میرا نیزہ درخت نبع کی لکڑی کا بنا ہوا ہے جسے مضبوط آدمیوں کا دبانا اور تیل لگانا اور آگ دکھانا غرضکہ کوئی بات ٹیڑھا نہیں کر سکتی میں جب کسی خوف زدہ کو پناہ دیتا ہوں تو تمام راستے اس کے لئے مامون ہو جاتے ہیں اور جب میں کسی مامون آدمی کو خوف زدہ کر دیتا ہوں تو اس کا گھر بھی اس کے لئے باعث اضطراب بن جاتا ہے۔ معاملات کو جب میں کسی گھاٹ پہ اتارتا ہوں تو وہ خود ہی لوٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ معاملات کا تو کام ہی آنا اور واپس لوٹ جانا ہے۔

منصور نے کہا کہ طریف کے ان دونوں شعروں کا میں زیادہ حقدار ہوں اس نے اپنی تعریف نہیں کی بلکہ میری ہی تعریف کی ہے۔ منصور میں آخر دم تک بدویانہ خو بو اور سادگی کی طرف میلان رہا۔

اسے اطلاع ملی کہ عبد اللہ ابن مصعب ابن زبیر صبح تک ایک باندی کے پاس رہے جو انہیں ان کے اشعار گا گا کر سناتی رہی۔ ان اشعار میں عشقیہ مضامین اور رندانہ مطالب بیان کئے گئے تھے۔ اس پہ منصور نے کہا کہ مجھے تو یہ بات پسند آتی ہے کہ کوئی حدی خواں آج کی رات مجھے طریف عنبری کے اشعار

---

[1] طبری صفحہ ۲۹۴ جلد ۹

حُدی کے طرز پر سُنائے۔ میرے نزدیک یہ باتیں زیادہ مانوس اور اہل عقل کی پسندیدگی کے زیادہ قابل ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک حدی خواں کو بلایا تاکہ وہ اُسے حُدی سُنائے۔ منصور نے اسے خود ایسے اشعار بتلائے جن کا تعلق مکارم اخلاق پہ فخر کرنے سے تھا۔ چنانچہ حدی خواں نے وہ اشعار حدی کے طرز پہ اسے گا کر سنائے۔ منصور نے کہا کہ بخدا یہ چیزیں انسانی مروّت کو زیادہ بیدار کرنے والی اور لٹریری آدمیوں کے زیادہ لائق ہیں۔ پھر ربیع کو بلا کر حکم دیا کہ اس حدی خواں کو ایک درہم دے دو۔ حدی خواں نے عرض کیا۔ اے امیرالمومنین! میں نے ہشام بن عبدالملک کو حدی سنائی تھی تو اس نے مجھے بیس ہزار درہم دیئے تھے۔ اور آپ ایک درہم ہی دے رہے ہیں؟ منصور نے کہا۔ انا للہ! تو نے اس بات کا ذکر کر دیا جس کا ذکر ہم پسند نہیں کرتے تھے۔ تو نے اس آدمی کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے اکثر و بیشتر خدا کا مال بغیر اس کے کہ وہ اس کے لئے حلال ہو قبضا لیا اور اسے ناجائز موقعہ پہ صرف کیا ہے۔ اے ربیع! مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اس کو پکڑ لو اور اس سے وہ بیس ہزار درہم واپس لے لو جو اسے ہشام بن عبدالملک نے دیئے تھے۔ بیچارہ حدی خواں برابر روتا رہا اور فریاد کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے منصور نے اسے چھوڑا[1]

اس طرح منصور شراب کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور نہ اس کے دسترخوان پہ شراب پی جاتی تھی۔ بختیشوع طبیب جب آیا تو منصور نے اس کے لئے صبح کا کھانا منگایا۔ جب اس کے سامنے دسترخوان بچھایا گیا تو اس نے شراب مانگی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ امیرالمومنین کے دسترخوان پر شراب تو نہیں پی جاتی۔ بختیشوع نے کہا کہ میں تو ایسا کوئی کھانا نہیں کھاتا جس کے ساتھ شراب نہ ہو۔ اس کی اطلاع منصور کو دی گئی تو منصور نے کہا اسے چھوڑ دو[2]

وہ کسی حُدی خواں، شاعر اور مدح گوئی کرنے والے کو عطایا دینے میں بھی اسراف سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ اپنی اولاد کو اگر وہ اسراف کرتے تھے تنبیہ کرتا رہتا تھا۔ گراں قیمت لباس نہیں پہنتا تھا۔ دسترخواں پر بھی زیادہ صرفہ نہیں کرتا تھا۔ غرضکہ زندگی کے تمام شعبوں میں میانہ روی اس کا شعار تھا حتیٰ کہ ان چیزوں میں بھی جو خدا نے اس کے لئے حلال کی تھیں وہ میانہ روی کو نہیں چھوڑتا تھا بلکہ

---

[1] یہ پورا واقعہ اغانی صفحہ ۱۱۲ جلد ۱۳ پہ مذکور ہے۔ [2] طبری صفحہ ۲۰۹ جلد ۹

بعض اوقات تو وہ میانہ روی میں اتنا ہی غلو کرنے لگتا تھا جتنا اس کے جانشین اسراف میں غلو کرنے لگے تھے ــــ لوگوں کا بیان ہے کہ منصور کی ماں ــــ جو ایک مغربی عورت تھی ــــ کے شکم میں جب منصور کا حمل تھا تو اس کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شیر کو اٹھائے ہوئے ہے جسے شیر سجدہ کر رہے ہیں۔ بلاشبہ اگر اس میں شیر جیسی ہمت نہ ہوتی اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پرہیز نہ کرتا اور لہو و لعب سے الگ رہ کر تدبیر مملکت کی طرف پوری توجہ نہ دیتا تو وہ کبھی اتنی بڑی مملکت کی تاسیس کے فرض سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا کہ بعد والوں کو مضبوط اور مستحکم بنی بنائی مملکت مل گئی جنہیں صرف اس کی ضرورت ہی رہ گئی تھی کہ جو کچھ انہیں وراثت میں مل گیا تھا اس کی حفاظت کریں۔

منصور نے ملک کو ایک وحدت کی شکل میں اپنے جانشین کے حوالہ کیا جس سے اندلس کے سوا کوئی علاقہ باہر نہیں تھا۔ مملکت میں ہر طرف امن و امان کا دَور دورہ تھا جس میں کہیں کوئی بڑے فتنے نہیں تھے۔ خزانے مال و دولت سے بھرپور تھے۔ سکانِ مملکت میں سے عربوں کے اثرات کم ہونے شروع ہو چکے تھے۔ ان کا اثر و نفوذ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مُوالی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ہر شعبۂ زندگی سے انہیں باہر کر دیں اور جزیرہ نمائے عرب میں انہیں دھکیل دیں۔ جیسا کہ وہ بدویانہ زندگی کے دَور میں جاہلیت کے زمانہ میں تھے۔ وہ برابر یہ کوشش کرتے رہے تھے کہ عربی عادات و رسوم کی جگہ ایرانی عادات و رسوم لے لیں اور عربی زندگی کی سادگی کی جگہ متمدن زندگی کی پیچیدگیاں چھا جائیں۔ بہرحال وہ دوسرا دَور آیا جس میں خلیفہ اور لوگوں کو اس کا وقت ملا کہ وہ فراغت اور عیش و عشرت کی سوچ سکیں۔ یہ دور ترفہ و تنعم کے لئے بہت زرخیز سرچشمہ ثابت ہوا۔

مہدی

منصور کی موت کے بعد لوگ کسی حد تک راحت محسوس کرنے لگے تھے۔ منصور کے زمانہ میں لوگ ان مشقتوں سے تھک چکے تھے جو ایک مملکت کی تاسیس کے لئے ضروری ہوتی ہیں جس کے لئے بڑی بڑی دشواریوں پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اس میانہ روی اور کوشش پیہم سے لوگ اُکتا گئے تھے۔ جو منصور کا خصوصی جوہر تھا۔ وہ ایسی زندگی کے متلاشی تھے جس میں مالی وسعت اور آرام و آسائش کی گنجائش نکل سکتے یہ بات انہیں خلیفہ "مہدی" میں ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ مہدی کا دس سالہ دَور حکومت وہ درمیانی پُل تھا جس کے ایک طرف منصور کے عہد کی محنت و مشقت، تنگی اور خشکی اور عمل و جد و جہد کی زندگی تھی اور دوسری طرف ہارون رشید اور اس کے جانشینوں کے دَور کی ترفہ اور تنعم کی زندگی تھی۔

مہدی سخی اور فراخ دست خلیفہ تھا۔ لوگوں کو منصور کی بخیلی سے ذرا سانس لینا میسر آیا۔ منصور اپنے بعد چودہ ملین دینار اور چھ سو ملین درہم چھوڑ گیا تھا۔[1] مہدی نے یہ تمام دولت لوگوں میں تقسیم کر دی۔ علاوہ ازیں جو دولت خود اس کے زمانہ میں حاصل ہوئی وہ اسے بھی تقسیم کرتا رہا۔ دولت کی فراوانی ـــ ہر قوم اور ہر عہد میں ـــ ترفہ اور تنعم اور لہو و لعب کا سبب رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سخاوت کا معیاری اندازہ اس سے بلند تر کرنے لگے تھے۔ وہ مہدی کے زمانہ میں بخیلوں کے کچھ لطائف قصے کہانیاں بیان کرتے تھے، شاید اسی کا اثر تھا کہ امام جاحظ نے ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھ دی۔ جس کا نام ہی کتاب "البخلاء" ہے۔

مہدی میں فنون جمیلہ سے محبت اور سخاوت کی طرف شدید میلان دونوں باتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں لوگ ان دونوں باتوں میں اس کی پیروی کرتے تھے۔ اور اہل فن پر گراں قدر اموال خرچ کرتے تھے جس سے فن کو ترقی ہوتی تھی۔ اور وہ معاشرہ کے مختلف طبقوں میں پھیلنے لگا تھا۔ مہدی نے گوئیوں کے گانے سننے کے لئے مجلسیں آراستہ کرکے بیٹھنا شروع کر دیا تھا جبکہ اس کا باپ منصور ان گانوں پر حُدی خوانی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اغانی کا بیان ہے کہ مہدی سب گویوں کا گانا سنتا تھا۔ وہ اس کی مجلس میں حاضر ہوتے اور پردہ کے پیچھے سے گانا سناتے تھے۔ گویئے مہدی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔[2] البتہ خلیج ابن ابی العوراء کو ایک مرتبہ مہدی نے اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کی مجلس میں حاضر ہو کر دو شعر سنائے۔ خلیج کو خود مہدی کے اہل اور مُوالی کے درمیان حاضر ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔ چنانچہ خلیج وہ پہلا شخص تھا جس نے مجلس میں مہدی کا چہرہ دیکھا ہو۔[3] کتاب "اخلاق الملوک" کے مصنف کا بیان ہے کہ منصور کی پیروی میں ابتدائی ایک سال تک مہدی اپنے ندیموں سے پردہ میں رہا پھر اس کے بعد اس نے یہ پابندی ختم کر دی تھی تو ابو عون نے مشورہ دیا کہ ندیموں سے پردہ ہی میں رہنا چاہئے۔ مگر مہدی نے ناگواری کے ساتھ اس مشورہ کو رد کر دیا اور کہا: ہٹو! تم بالکل ہی جاہل ہو۔ سرور کو مشاہدہ کرنے اور اس سے قریب رہنے ہی میں لذت ہے جو مجھے خوش کر سکے۔ دُور دُور۔ اس میں کیا بھلائی اور لذت ہو سکتی ہے؟[3] اپنے باپ کے برعکس وہ لوگوں کو گانے پر بے دریغ مال بھی دیتا تھا۔ منصور اپنے ندیموں وغیرہ میں سے کسی کو کبھی ایک درہم بھی نہیں دیتا تھا۔ اور نہ اس نے کسی ایسے آدمی کو جو لہو و لعب، ہنسی دل لگی یا ہزل گوئی کا کام کرتا ہو کبھی ایک چپہ بھر زمین بھی جاگیر میں دی۔ لیکن مہدی بہت زیادہ عطایا بخشنے والا تھا۔ وہ مسلسل دیتا رہتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا ہے

---

[1] مسعودی صفحہ ۱۹۶ جلد ۲ [2] اغانی صفحہ ۹۹ جلد ۳ [3] اخلاق الملوک صفحہ ۳۴

کہ کوئی اس کے سامنے حاضر ہوا اور اس نے اسے بے نیاز نہ کر دیا ہو[1]۔ مہدی نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے قصر شاہی میں اپنے دونوں بچوں، ابراہیم ابن المہدی اور عُلَیّہ بنت المہدی کے لئے گانے بجانے، اور خوش مذاقی کے سلسلہ میں دنیا کی ساری زینتیں اور اپنے وقت کی تمام لذتیں مہیا کر رکھی تھیں۔

مہدی کو باندیوں سے بھی انس تھا۔ عورتوں کے متعلق باتیں کرنے کو بغیر کسی تکلف اور جھجک کے وہ پسند کرتا تھا۔ جاحظ کا بیان ہے کہ "مہدی گانے والی باندیوں کو پسند کرتا اور گانا سنتا تھا۔ اسے ایک باندی بہت ہی پسند تھی جس کا نام "جوہر" تھا۔ اسے اس نے مروان شامی سے خریدا تھا۔ مہدی نے اس باندی کے سلسلہ میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں[2]"۔

صاحب اغانی اور طبری دونوں اس بات پہ متفق ہیں کہ مہدی شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس نے ابو جعفر منصور کے بعد اس سلسلہ میں ایک قدم ضرور آگے بڑھایا تھا ہم منصور کے متعلق دیکھ چکے ہیں کہ نہ وہ شراب پیتا تھا اور نہ کسی کو اس کی اجازت دیتا تھا کہ وہ دسترخوان پہ شراب پی سکے۔ لیکن مہدی کے متعلق طبری کا بیان ہے کہ وہ خود شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسے بری چیز سمجھتا تھا بلکہ اُسے اس کی کبھی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ اس کے اصحاب اس کے پاس بیٹھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے شراب پیتے تھے۔ مہدی کا وزیر یعقوب بن داؤد اس سلسلہ میں اسے نصیحت کرتا تھا اور باصرار اسے مجبور کرتا تھا کہ گانا سننا اور شراب پلانا بند کر دے۔ اکثر تو اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر مہدی نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو وہ اپنے منصب سے الگ ہو جائے گا لیکن مہدی اس کے جواب میں یہ دلیل دیا کرتا تھا کہ آخر عبداللہ ابن جعفر بھی تو گانا سنا کرتے تھے[3]۔

مہدی اپنے کھانے اور پہننے میں بھی فضول خرچ تھا حج کے لئے جاتا تھا تو برف بغداد تک سے پہنچائی جاتی تھی۔ مہدی پہلا خلیفہ تھا جس نے ایسا کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مہدی —— جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے —— اپنے لہو ولعب اور ترفہ وتنعم میں اعتدال سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ لیکن اسے لوگوں کے لئے بھی اس سلسلہ میں باگ اتنی ڈھیلی نہیں چھوڑنی چاہئے تھی کہ وہ اسے اچھی چیز سمجھنے لگیں۔ رند مشرب لوگ افراط کی حد تک پہنچ گئے تھے اور چھچھورے ہو چلے تھے۔ منصور کے عہد حکومت میں لوگوں کو اس رندی کی جرأت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ خود منصور نے ان کے سامنے اپنا نمونہ بحقیقت

---

[1] اخلاق الملوک صفحہ ۲۵۰ [2] البیان التبیین صفحہ ۲۰۸ جلد ۳ [3] اغانی صفحہ ۵ جلد ۵ و طبری صفحہ ۱۰ جلد ۱۰

پسندانہ اور محتاط رکھا ہوا تھا۔ جب لوگوں نے مہدی کو دیکھا کہ وہ لہو و لعب کی طرف دو چار قدم بڑھا رہا ہے تو لوگوں کو جرأت ہوئی اور انہوں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ مہدی کے عہد میں بشار کی عریاں گوئی اور فحش نگاری نے بڑے لوگوں کو بڑے ہی فتنہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور پورے ملک کو اس فحاشی اور عریانی کا شکار بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ اشراف اس کے اشعار سے تنگ آکر مہدی کے پاس حاضر ہوئے۔ ان اشراف میں خود مہدی کے ماموں یزید بن منصور جیسے حضرات بھی شامل تھے۔ انہوں نے مہدی سے درخواست کی کہ وہ اس فحاش کی زبان کو لگام دے ورنہ انہیں اندیشہ ہے کہ ان کی عورتیں اور لڑکیاں خراب ہو جائیں گی۔ بالآخر مہدی نے مداخلت کی اور بشار کو غزل گوئی کی ممانعت کر دی۔ بشار کہتا ہے :-

قَدْ عِشْتُ بَيْنَ الرَّيْحَانِ وَالرَّاحِ وَالْـ ... مِزْهَرِ فِي ظِلِّ مَجْلِسٍ حَسَنٍ
ثُمَّ مَلَأْتُ الْبِلَادَ مَا بَيْنَ فَغْـ ... فُورَ إِلَى الْقَيْرَوَانِ فَالْيَمَنِ
شِعْرًا تُصَلِّي لَهُ الْعَوَاتِقُ وَالثَّيِّبُ ... صَلَاةَ الْغُوَاةِ لِلْوَثَنِ
ثُمَّ نَهَانِي الْمَهْدِيُّ فَانْصَرَفَتْ ... نَفْسِي صَنِيعَ الْمُوَفَّقِ اللَّقِنِ
فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا شَرِيكَ لَهُ ... لَيْسَ بِبَاقٍ شَيْءٌ عَلَى الزَّمَنِ

میں نے ایک عمدہ مجلس کے زیر سایہ پھولوں، شراب اور باجوں گاجوں کے درمیان زندگی گزاری ہے۔ میں نے فغفور سے لے کر قیروان اور یمن تک سارے شہروں کو ایسے اشعار سے بھر دیا ہے جن کے لئے کنواری لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں اس طرح نمازیں پڑھتی ہیں جس طرح گمراہ لوگ بتوں کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں۔ مگر پھر مجھے مہدی نے منع کر دیا تو میرا دل اسی طرح پلٹ گیا جس طرح ایک مطیع و فرماں بردار آدمی پلٹ جاتا ہے۔ اس خدا کا شکر ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور جس کے سوا زمانہ میں کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں۔

لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خباثت سے باز نہیں آیا۔ وہ کھلم کھلا تو نہیں، چھپ چھپ کر ان مضامین کو بیان کرتا اور مہدی کی ممانعت کے پردہ میں اپنی حفاظت ڈھونڈھتا تھا۔ وہ کہتا ہے

يَا مَنْظَرًا حَسَنًا رَأَيْتُهُ ... مِنْ وَجْهِ جَارِيَةٍ فَدَيْتُهُ
بَعَثَتْ إِلَيَّ تَسُومُنِي ... ثَوْبَ الشَّبَابِ وَقَدْ طَوَيْتُهُ
وَاللّٰهِ رَبِّ مُحَمَّدٍ ... مَا إِنْ غَدَرْتُ وَلَا نَوَيْتُهُ

أَمْسَكْتُ عَنْهُ وَرُبَّمَا	عَرَضَ الْبَلَاءُ وَمَا ابْتَغَيْتُهُ
إِنَّ الْخَلِيفَةَ قَدْ أَبَىٰ	وَإِذَا أَبَىٰ شَيْئًا أَبَيْتُهُ
وَنَهَانِيَ الْمَلِكُ الْهُمَا	مُ عَنِ النِّسَاءِ فَمَا عَصَيْتُهُ
بَلْ قَدْ وَفَيْتُ وَلَمْ أُضِعْ	عَهْدًا وَلَا وَأْيًا وَأَيْتُهُ
وَأَنَا الْمُطِلُّ عَلَى الْعِدَىٰ	وَإِذَا غَلَا الْحَمْدُ اشْتَرَيْتُهُ
وَأَمِيلُ فِي أُنْسِ النَّدِيـ	ـمِ مِنَ الْحَيَاءِ وَمَا اشْتَهَيْتُهُ
وَيَشُوقُنِي بَيْتُ الْحَبِيـ	ـبِ إِذَا غَدَوْتُ وَأَيْنَ بَيْتُهُ
حَالَ الْخَلِيفَةُ دُونَهُ	فَصَبَرْتُ عَنْهُ وَمَا قَلَيْتُهُ

اُف! وہ حسین منظر جو میں نے ایک باندی کے چہرہ میں دیکھا۔ میری جان اُس پر قربان۔ اس نے میرے پاس اپنی جوانی کے لباس کا سودا کرنے کے لئے آدمی بھیجا۔ میں نے اس کے اس لباس کو لپیٹ دیا۔ محمدؐ کے پروردگار اللہ کی قسم میں نے نہ عہد شکنی کی اور نہ اس کا ارادہ کیا۔ میں اس سے رُکا رہا لیکن بسا اوقات ایسی آزمائش آپڑتی ہے جس کا میں طلبگار بھی نہیں ہوتا۔ خلیفہ نے مجھے منع کر دیا ہے اور جب وہ منع کر دیتا ہے تو میں اس سے رُک جایا کرتا ہوں۔ مجھے عظیم بادشاہ نے عورتوں سے روک دیا ہے اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے حکم کو بجا لاتا ہوں اور جو وعدہ کر چکا ہوں اسے ضائع نہیں کرتا۔ میں دشمنوں پر ہر وقت متوجہ رہتا ہوں اور جب حمد گراں ہو جاتی ہے تو اسے خرید لیا کرتا ہوں۔ شرم کی وجہ سے میں ہم نشین کی انسیت میں پورا پورا میلان رکھتا ہوں مگر اس کی اشتہاء نہیں رکھتا۔ محبوب کا گھر مجھے اپنی طرف جب میں صبح کو جاتا ہوں شوق کے ساتھ کھینچتا ہے۔ اور کہاں ہے اس کا گھر جو خلیفہ کا حکم اس کے گھر کے درمیان حائل ہو گیا ہے میں اس سے صبر تو کرتا ہوں مگر اسے ناپسند نہیں کرتا۔

اور وہ کہتا ہے :-

دَفَنْتُ الْهَوَىٰ حَيًّا فَلَسْتُ بِزَائِرٍ	سُلَيْمَىٰ وَلَا صَفْرَاءَ مَا قَرْقَرَ الْقُمْرِيْ
تَرَكْتُ الْمَهْرِيَّ الْأَدْنَاهُ وِصَالَهَا	وَرَاعَيْتُ عَهْدًا بَيْنَنَا لَيْسَ بِالْخَتْرِ
وَلَوْلَا أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ مُحَمَّدٌ	لَقَبَّلْتُ فَاهَا أَوْ لَكَانَ بِهَا فِطْرِي

لَعَمْرِی لَقَدْ اَذْ قَرَّتُ نَفْسِی خُطِبْهَۃً فَمَا اَنَا بِالمُزْدَادِ وَقْرًا عَلَی وَقْرِ

میں نے زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنی محبت کو دفن کر دیا ہے۔ چنانچہ جب تک قمریاں بولتی رہیں گی
میں سلمیٰ اور عطراء سے ملنے کے لئے نہیں جاؤں گا۔ مہدی کی وجہ سے میں نے ان کے وصال کو
چھوڑ دیا ہے اور اس عہد کا لحاظ کرتا ہوں جو ہمارے درمیان ہوا ہے اور جو قریب نہیں ہے۔ اگر
امیر المومنین محمد (مہدی) نہ ہوتے تو میں ضرور اس کا منہ چوم لیتا بلکہ یقیناً اپنا روزہ ہی اس کے ساتھ
کام جوئیوں سے افطار کرتا لیکن میری زندگی کی قسم میں نے تو اپنے نفس کو گناہوں سے لاد رکھا ہے۔
اب میں بوجھ پہ مزید بوجھ بڑھانے والا نہیں ہوں۔

اس کے بعد مہدی کو ابراہیم موصلی کی خوش آوازی کی شہرت معلوم ہوتی ہے تو وہ اسے اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔ مہدی ہی پہلا شخص ہے جس نے ابراہیم موصلی کی شان کو بلند کیا اس کے بعد مہدی کو معلوم ہوا کہ موصلی شراب پیتا اور رندانہ باتیں کہتا ہے۔ مہدی چاہتا تھا کہ موصلی برابر اس کے ساتھ رہے اور اپنی رندانہ باتیں چھوڑ دے۔ لیکن موصلی کے بس کی یہ بات نہیں تھی۔ مہدی اسے مارتا ہے اور قید کر دیتا ہے۔ ابراہیم موصلی کا بیان ہے کہ مجھے مہدی نے ایک دن بلایا اور لوگوں کے گھروں پہ جا کر شراب پینے اور ان کے ساتھ رندی کرنے پر بڑی ملامت کی تو میں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! میں نے یہ فن اس لئے سیکھا ہے کہ اس سے لذت حاصل کروں اور اپنے دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کی داد دوں۔ اگر میرے لئے ان تمام باتوں کا چھوڑنا ممکن ہوتا جن میں گرفتار ہوں تو محض خدا کی خاطر میں ان کو کبھی کا چھوڑ چکا ہوتا۔ مہدی کو میرے اس جواب پہ بہت سخت غصہ آیا اور وہ کہنے لگا۔ بہت اچھا مگر خبردار تم موسیٰ اور ہارون کے پاس آئندہ سے کبھی نہیں جاؤ گے! خدا کی قسم اگر تو ان کے پاس گیا تو سمجھ رکھنا کہ میں کیا کچھ کروں گا۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے یہ بات منظور ہے مگر چند ہی دن کے بعد اس کو اطلاع مل گئی کہ میں ان دونوں کے پاس گیا اور ان کے ساتھ میں نے شراب پی۔ یہ دونوں شراب کے متوالے تھے۔ مہدی نے مجھے اس جرم میں تین سو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا۔[۱]

درحقیقت مہدی نے لوگوں کے لئے لہو و لعب کا دروازہ کھول دیا۔ پھر اس کی کوشش کی کہ وہ حد کے اندر

[۱] اغانی صفحہ ۵ جلد ۵۔

رہیں۔ حد سے آگے نہ بڑھیں۔ مگر لوگ حدود کو پھاند کر آگے بڑھ چکے تھے۔ اس کے بعد مہدی نے بڑی کوشش کی کہ سزائیں دے کر لوگوں کو اس حد کے اندر رہنے پر مجبور کرے جو اس نے ان کے لئے مقرر کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

ہارون رشید

ہارون رشید کے زمانہ میں لوگوں نے عیش و عشرت کے اندر اسراف میں ایک قدم اور آگے بڑھایا جس کے چند اسباب تھے۔ ان میں کچھ تو وہ باتیں تھیں جن کا تعلق اُمت کے طبعی نشو و نما سے تھا۔ حکومت کے حالات منظم ہو جانے کی وجہ سے مملکت کی ثروت میں اضافہ ہو گیا تھا اور اسے یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکے۔ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ ہارون رشید کے عہدِ حکومت میں مملکت کی آمدنی سات ہزار پندرہ قنطار سالانہ تھی[1]۔ اور قنطار ان کے حساب میں دس ہزار دینار کہلاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجموعہ آمدنی ستر ملین ایک لاکھ پچاس ہزار دینار سالانہ تھی۔ یہ میزانیہ بہت ہی بڑا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ مملکت کی دولت اس کے عہد میں کس قدر بڑھ گئی تھی اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے پر اسے کس قدر قدرت حاصل ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب اس کے عہد میں ایرانیوں کے تسلط کا بڑھ جانا تھا۔ جن میں سب سے آگے آگے برآمکہ تھے ایرانی قوم شروع ہی سے لہو و لعب، خوشی اور سرور، شراب کی پسندیدگی میں افراط کی طرف مائل رہی ہے، دین زردشتی میں شراب حلال تھی جو اسے دینی شعائر میں جگہ دیتی تھی۔ پروفیسر "براؤن" کے قول کے مطابق شراب آج تک زردشتی پارسیوں کی روزانہ کی زندگی میں نمایاں چلی آتی ہے ــــ ایرانی، پُرانے زمانہ سے شراب پینے اور گانا سُننے میں افراط سے کام لیتے آئے تھے۔ اچھے اور بُرے کھیلوں کے بہت سے فنون میں وہ افراط کے عادی تھے۔ دولت عباسیہ میں جب ان کا تسلط بڑھا خصوصیت کے ساتھ ہارون رشید اور مامون کے عہد میں تو انہوں نے اپنے اثر و نفوذ کے ساتھ اکاسرہ کا طرز زندگی اور ان کی تہذیب اور لہو و لعب کی چیزیں بھی پھیلا دیں ــــ اپنی حقیقت شناسی کے ماتحت انہوں نے نظم سیاسی پیدا کیا تو ساتھ ہی اپنی لہو آمیزی کے ماتحت شراب، گانے کی محفلیں، غزل کی مجلسیں وغیرہ بھی پھیلائیں۔

---

[1] مقدمہ صفحہ ۱۵۱

تیسری وجہ خود ہارون رشید کی طبیعت اور اس کی تربیت سے تعلق رکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہارون رشید ایک تیز طبع نوجوان تھا۔ لیکن اس قسم کا نہیں کہ خود کو بالکل ہی شہوات نفسانیہ کے حوالہ کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا دل قوی اور طبعاً اور تربیت کے ماتحت بھی وہ ایک فوجی آدمی تھا۔ اکثر مشرق و مغرب میں اس نے فوجوں کی کمان کی تھی ـــــ طبیعت کی اس تیزی، دل کی قوت اور شباب کی سرسبزی و شادابی نے مل کر اس کی شخصیت کو مختلف کیفیات کا مظہر بنا دیا تھا۔ اسے نصیحت کی جاتی تھی تو وہ نصیحت سے متاثر ہوتا حتیٰ کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ گانا سنتا تو اس سے پوری طرح پُر لطف اندوز ہوتا تھا۔ ابراہیم موصلی سے گانا سنتا۔ برصوم سے بانسری سنتا اور زلزل سے طبلہ سنتا۔ بعض مرتبہ جوشِ طرب میں ایسی باتیں بھی اس کے منہ سے نکل جاتیں جن سے دینی تقویٰ سے بے احتیاطی کی بو آتی۔ وہ کہہ دیتا "اے آدم! اگر تم دیکھتے کہ آج تمہاری اولاد میں سے میرے سامنے کون کون لوگ حاضر دربار ہیں تو تم کتنا خوش ہوتے۔" بعد میں اپنی ان باتوں پر نادم بھی ہوتا اور استغفراللہ پڑھتا ـــــ اس میں ایک طرف دینی رجحان بھی بڑھا ہوا تھا، مگر دوسری طرف فنون لطیفہ کا رجحان بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ نمازیں پڑھتا اور بہت نمازیں پڑھتا۔ گانے سنتا اور خوب سنتا۔ اشعار سنتا اور ان سے لطف لیتا۔ اس کے میلانات و رجحانات مختلف اطراف کی طرف چلتے تھے اور وہ ہر جہت میں آخری حد تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ ابوالعتاہیہ کے یہ اشعار سنتا

خَانَكَ الطَّرْفُ الطَّمُوحُ ۔۔۔ أَيُّهَا الْقَلْبُ الْجَمُوحُ
لِدَوَاعِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ ۔۔۔ دُنُوٌّ وَنُزُوحُ
هَلْ لِمَطْلُوبٍ بِذَنْبٍ ۔۔۔ تَوْبَةٌ مِنْهُ نَصُوحُ؟
كَيْفَ إِصْلَاحُ قُلُوبٍ ۔۔۔ إِنَّمَا هُنَّ قُرُوحُ
أَحْسَنَ اللهُ بِنَا أَنَّ ۔۔۔ الْخَطَايَا لَا تَفُوحُ
سَيَصِيرُ الْمَرْءُ يَوْمًا ۔۔۔ جَسَدًا مَا فِيهِ رُوحُ
بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ حَيٍّ ۔۔۔ عَلَمُ الْمَوْتِ يَلُوحُ
كُلُّنَا فِي غَفْلَةٍ وَالْـ ۔۔۔ ـمَوْتُ يَغْدُو وَيَرُوحُ
لِبَنِي الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْـ ۔۔۔ ـيَا غَبُوقٌ وَصَبُوحُ
رُحْنَ فِي الْوَشْيِ وَأَصْبَحْـ ۔۔۔ ـنَ عَلَيْهِنَّ الْمُسُوحُ

كُلُّ نَطَّاحٍ مِنَ الدَّهْرِ — لَهٗ يَوْمٌ نَطُوْحٌ
نُحْ عَلٰى نَفْسِكَ يَا مِسْـ — كِيْنُ اِنْ كُنْتَ تَنُوْحُ
لَتَمُوْتَنَّ وَاِنْ عُمِّـ — رْتَ مَا عُمِّرَ نُوْحٌ

اے بے صبرے دل! اٹھتی ہوئی آنکھیں تجھ سے خیانت کر رہی ہیں خیر اور شر کے داعئے قریب بھی ہوتے ہیں اور دور بھی چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسے آدمی کے لئے جس کی گناہوں میں تلاش ہو رہی ہو سچی توبہ ہو سکتی ہے؟ دلوں کی اصلاح کس طرح کی جائے۔ وہ تو زخم ہی زخم ہیں۔ خدا ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمائے ورنہ گناہوں سے تو کوئی خوشبو نہیں آیا کرتی۔ آدمی ایک دن ایسا جسم بن جائے گا جس میں جان نہیں ہوگی۔ ہر زندہ آدمی کی آنکھوں کے درمیان موت کا جھنڈا نظر آتا ہے۔ ہم سب غفلت میں گرفتار ہیں۔ اور موت صبح و شام آتی جاتی رہتی ہے۔ دنیا والوں کا دنیا سے حصہ اتنا ہی ہے کہ وہ صبح کو اور شام کو کچھ پی لیں۔ لوگ شام کو زرکار کپڑوں میں جاتے ہیں اور صبح کو ٹاٹ پہن کر آتے ہیں۔ زمانہ کی ہر سینگ مارنے والی چیز کے لئے سینگ مارنے کا ایک دن آتا ہے۔ اے مسکین اپنے آپ پر نوحہ پڑھ اگر تجھے نوحہ پڑھنا ہے۔ تجھے ضرور موت آکر رہے گی اور اگر تیری لمبی عمر بھی ہوگی تو نوح علیہ السلام بھی تو ہمیشہ زندہ نہیں رہے تھے۔

ہارون رشید نے یہ اشعار سنے تو رونے لگا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں[1]۔ برامکہ سے خوش ہوتا ہے تو انہیں حد سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے اور انہیں انتہائی مقرب بنا لیتا ہے۔ پھر وہ ان پر ناراض ہوتا ہے اور حاسدین اس کے رجحان کو اور بھی بھڑکاتے ہیں تو انہیں ایسی سخت سزا دیتا ہے کہ پناہ بخدا۔ اسے گانا پسند آتا ہے تو ابراہیم موصلی کو اس طرح مقرب بنا لیتا ہے جیسے علماء اور قضاۃ کو مقرب بناتا تھا۔ جب کوئی مغنی یا شاعر اس کے جذبہ پسندیدگی کو ابھار دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو پھر وہ کبھی نہیں پوچھتا تھا کہ اس نے کتنا مال خرچ کر دیا ہے۔ ہارون رشید کے بیان میں مجھے صاحب اغانی کا یہ جملہ بہت ہی پسند ہے جو اس کی شدت رجحان کی بہترین مصوری کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "نصیحت کے وقت ہارون رشید بے تحاشا آنسو بہاتا تھا۔ اور غیض و غضب کے وقت انتہائی درجہ کا بے رحم بن جاتا تھا[2]" لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر

---

[1] اغانی صفحہ ۱۷۸ جلد ۳ [2] اغانی صفحہ ۱۷۸ جلد ۳

آپ اسے انتہائی درجہ کا دین دار دیکھتے ہیں۔ وہ نمازیں پڑھتا ہے تو دن میں سو سو رکعتیں پڑھ ڈالتا ہے۔ اگر آپ کسی وقت اسے ناراض دیکھتے ہیں تو وہ بے تحاشا ایسی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر خون بہانے لگتا ہے جو بہر حال خون بہانے کے لائق نہیں ہوتیں۔ جوش طرب میں آتا ہے تو مستی اور طربناکی اس پہ اور اس کے حواس پہ پوری طرح قابض ہو جاتی ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو ایک آدمی میں بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں اور اس کا تصور کچھ دشوار نہیں ہے۔

آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے تو اسے پڑھ کر بسا اوقات ہارون رشید کی جو تصویر آپ کے ذہن میں بنے گی وہ اس قسم کی ہوگی کہ وہ چوبیس گھنٹے لہو و لعب اور غنا و طرب میں گرفتار رہتا تھا۔ اسے گانا سننے کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا۔ ندیموں کے ساتھ گھلا ملا رہنا اور شعراء کو انعامات دینا ہی اس کا مشغلہ تھا۔ اس میں صاحب اغانی کا کوئی قصور نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب تاریخ پہ نہیں لکھی کہ وہ مختلف خلفاء کے اعمال کو بیان کر کے ان کی تمام حسنات و سیئات گنائیں اور پھر ان خلفاء کا درجہ متعین کریں۔ انہوں نے اپنی کتاب "گانوں" کے موضوع پہ لکھی ہے۔ لہذا یہ طبعی چیز ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اسی قسم کی باتیں بیان کرنے پہ اکتفاء کریں جن کا تعلق گانے کے فن سے ہو جیسا کہ نحاۃ اور اہل لغت کے طبقات کی کتابیں علماء پہ محض لغوی اور معنوی زاویۂ نظر ہی سے گفتگو کرتی ہیں۔ اگر قصور ہے تو ان پڑھنے والوں کا ہے جو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ گانا ہی ایک ایسے شخص کی مکمل مصوری کر دیتا ہے جس کی شخصیت مختلف رجحانات کا مجموعہ ہو۔

آپ ابن خلدون کو پڑھیئے تو وہ محض حقیقت پسندانہ دینی جہت ہی سے اس کی مصوری کرنے پہ اکتفاء کر جاتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ ہارون رشید شراب نہیں پیتا تھا۔ کیونکہ وہ علماء اور اولیاء اللہ کی صحبت میں رہتا، نمازوں اور دوسری عبادتوں کی بڑی پابندی کرتا۔ صبح کی نماز ہمیشہ اپنے وقت پہ پڑھتا۔ ایک سال جہاد کرتا اور دوسرے سال حج کیا کرتا تھا۔ وہ ان باتوں سے استدلال کرتے ہیں کہ علم اور سادگی میں اس کا اپنا خاص مقام تھا کیونکہ سلف سے اس کا زمانہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے درمیان اور اس کے دادا ابو جعفر منصور کے درمیان کوئی بڑا زمانہ نہیں گذر گیا تھا۔ ہارون رشید فقہائے عراق کے مذہب کے مطابق صرف نبیذ پی لیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے فتوے کافی مشہور ہیں۔ جہاں تک خالص شراب کا تعلق ہے تو ہارون رشید پہ اس کی تہمت لگانے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ لہذا ہمیں ان کمزور اور ضعیف تاریخی روایات کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے جن میں اس سے اس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ وہ ہرگز ایسا آدمی نہیں تھا کہ ایک حرام چیز کا جو پوری ملت کے نزدیک

اکبر الکبائر میں سے کسی ارتکاب کر سکتا۔ پوری کی پوری قوم ان دنوں لباس اور زینت میں ترفہ اور تنعم اور دوسری چیزوں کے ساتھ اسراف برتنے سے بہت دور تھی کیونکہ ان میں اب تک بدویانہ زندگی کی خشونت اور دین کی سادگی پائی جاتی تھی جس سے وہ جدا نہیں ہوئے تھے[1]

ہمیں ابن خلدون کے ساتھ اس امر میں اتفاق ہے کہ ہارون رشید نے شراب نہیں پی۔ اس کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ نبیذ پیا کرتا تھا۔ لیکن ہم اس نتیجہ سے اتفاق نہیں کرتے جو وہ آخر میں نکالتے ہیں کہ ترفہ و تنعم میں اسراف برتنے سے وہ بہت دور تھا اور یہ کہ اس کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ اور یہ کہ وہ ایک حرام چیز کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ نتائج نکالنا محض ہارون رشید کو مقدس بنانے میں افراط سے کام لینے کے مرادف ہے۔ جس پر خود ہارون رشید کی سیرت بھی دلالت نہیں کرتی۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ ابن خلدون نے اس سلسلہ میں جو دلائل دیئے ہیں وہ محض واعظانہ اور خطیبانہ دلائل ہیں۔ منصور سے اس کا قریب العہد ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی زندگی بھی منصور ہی کی طرح ہو۔ خود ابن خلدون نے بارہا اس کی تصریح کی ہے کہ ہارون رشید کے زمانہ میں ترفہ اور تنعم منصور کے زمانہ کے مقابلہ میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اگر قریب العہد ہونا ہی استدلال کرنے کے لئے کافی ہوا کرے تو ہمیں "امین" میں ——— جو ہارون رشید سے قریب العہد ہے یہ بات کیوں نظر نہیں آتی کہ وہ ہارون رشید کی سیرت کے مطابق زندگی گزارتا۔

تعجب ہے کہ خود ابن خلدون نے لمبی لمبی فصلوں میں ہارون رشید، امین اور مامون کے عہد میں تہذیب و تمدن اور ترفہ و تنعم کی تفصیلات اور کھانے پینے اور پہننے میں ان کی جدت آرائیاں بیان کی ہیں اور خود ابن خلدون ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے مسعودی اور طبری سے ان حکایات کو بیان کرنے میں اتفاق کیا ہے جو مثلاً بوران بنت حسن کے ساتھ مامون کی شادی میں پیش آئیں کہ مامون نے اسے شب زفاف میں مہر کے طور پر یاقوت کے ایک ہزار ٹکڑے دیئے تھے اور عنبر کی شمعیں روشن کی تھیں اور ہر شمع میں ایک سو من (یعنی دو سو رطل عنبر تھا) اور اس کے لئے ایک فرش بچھایا گیا تھا جو بوریے کی طرح سونے کے تاروں سے بنا گیا تھا اور اس میں جگہ جگہ موتی اور یاقوت ٹکے ہوئے تھے[2] الخ الخ

کیا یہ ترفہ و تنعم میں اسراف نہیں تھا؟ اور مامون کا زمانہ ہارون رشید سے اتنا ہی قریب نہیں تھا جتنا رشید

---

[1] یہ بحث تاریخ ابن خلدون کی جلد اول صفحہ ۱۴ پر ملاحظہ فرمایئے۔ [2] تاریخ ابن خلدون صفحہ ۱۴۵ جلد ا

کا زمانہ منصور سے تھا جس کی وجہ سے ابن خلدون کے نزدیک لوگوں کو سادہ زندگی برتنی چاہئے تھی ؟

حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون نے ہارون رشید کے عہد کو سادگی کا زمانہ کہہ کر اور یہ بتا کر کہ وہ اور اس کی قوم ترفہ وتنعم میں اسراف کرنے سے بہت دور تھی غلطی کی ہے ۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن خلدون نے ہارون رشید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے یہاں ایک پہلو کی یہ صحیح تصویر پیش کی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتا تھا اور بڑا تقوی شعار تھا وہیں ساتھ ہی یہ نتیجہ نکالنے میں غلطی کی ہے کہ اس کے سارے پہلو ایسے ہی تھے۔ اس کی زندگی کا ایک پہلو وہ بھی تھا جسے صاحب اغانی نے بیان کیا ہے ۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہم صاحب اغانی کی طرح ابن خلدون کی طرف سے کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو ایک مؤرخ ہیں اور ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایک شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے دکھائیں ۔ اگر ابن خلدون نے رشید کے ایک پہلو کو تشنہ چھوڑ دیا ہے تو وہ اس میں معذور قرار نہیں دیے جا سکتے ۔

غالباً ابن خلدون نے یہ سمجھا ہے کہ جو شخص رات کو سو سو رکعتیں نماز پڑھ سکتا ہے، جو فضیلؒ بن عیاض جیسے ولی اللہ کے ساتھ ہم نشینی کا شرف حاصل کرتا ہے اس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لہو و لعب کی مجلسیں آراستہ کر کے ان میں گانا بجانا سنے اور ان مجلسوں میں ترفہ وتنعم کے مظاہر کا مکمل طریقہ سے مظاہرہ کرے اگر ابن خلدون نے یہ سمجھا ہے تو بہت ہی غلط سمجھا ہے ۔ انسانی طبیعت اس سے انکار نہیں کرتی ۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ہارون رشید حقیقت پسندانہ زندگی بسر کرتا تو اس میں گہرائی تک پہنچ جاتا۔ لہو ولعب میں مشغول ہوتا تو اس میں بھی انتہا تک پہنچ جاتا تھا ۔ کیونکہ اس کی تیزی طبیعت کے جو مختلف میلانات و رجحانات تھے وہ ان کے آگے سپر انداز ہو جاتا تھا۔

البو البختری وہب بن وہب قاضی کا بیان ہے کہ میں ایک روز ہارون رشید کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس نے برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی منگایا ۔ ذخیرہ میں برف موجود نہیں تھی۔ ہارون رشید کو اس کی معذرت کے ساتھ ایسا پانی پیش کیا گیا جس میں برف نہیں تھا ۔ ہارون رشیدؒ نے وہ پیالہ غلام کے منہ پہ کھینچ کر مارا، اور غصہ سے بے قابو ہو گیا ۔ میں نے عرض کیا کہ اے امیرالمومنین ! اگر جان کی امان ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ ہارون نے کہا کہ کہو کیا کہتے ہو ۔ میں نے عرض کیا " اے امیرالمومنین ! آپ دیکھ چکے ہیں کہ کل دوسروں کے ساتھ کیا ہو چکا ہے ــــ بنو امیہ کی حکومت کے زوال کی طرف اشارہ تھا ــــ دنیا کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتی اور نہ ہی اس پہ بھروسہ کرنا چاہئے ۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ترفہ اور تنعم کا اتنا عادی نہ

بنائیں ۔ آپ کو نرم اور سخت ہر قسم کی چیزیں کھانی چاہئیں ، ملائم اور کھردرا ہر طرح کا لباس پہننا چاہئے ۔ سرد اور گرم ہر نوع کی چیزیں پینی چاہئیں ۔ ہارون نے مجھے اپنے ہاتھ سے تھپتھپایا اور کہا ۔ خدا کی قسم میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں جہاں تم سمجھ رہے ہو ۔ میں نرم و نازک چیزیں اُس وقت تک پہنتا ہوں جب تک ترفہ و تنعم کی یہ چیزیں مجھے میسر ہیں ۔ اگر مجھے زمانہ کی گردش پیش آئی تو میں اپنے اس دوسرے انداز کی طرف بغیر کسی جزع فزع کے لوٹ آؤں گا[1]

امین امین آیا تو اس نے لہو و لعب میں ایک قدم اور آگے بڑھایا بلکہ چند قدم اور آگے بڑھائے —— محقق مؤرخین کتنا ہی کہیں کہ امین کے متعلق زیادہ تر واقعات اس کی شہرت کو داغدار بنانے اور اس کی شان کو کم کرنے اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا تھا اس کو درست ثابت کرنے کے لئے مامون کے زمانہ میں غلط طور پر گھڑے گئے ہیں ۔ مگر لہو و لعب اور شراب و غلمان میں افراط کی طرف اس کا میلان ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کا انکار کر دینا سہل ہو ۔

طبری کا بیان ہے کہ جب محمد امین بادشاہ ہوا تو اس نے ہیجڑے تلاش کر کر کے انہیں خریدا اور ان کی بڑی بڑی قیمتیں دیں ۔ اور انہیں رات دن خلوت میں اپنے ساتھ رکھا ۔ اس کے کھانے پینے کے انتظامات اور امر و نہی سے متعلق معاملات سب انہی ہیجڑوں کے ہاتھ میں تھے ۔ آزاد عورتوں اور باندیوں سے اسے کوئی علاقہ نہیں تھا حتیٰ کہ لوگ امین کو ان ہیجڑوں کے ساتھ متہم کرنے لگے تھے ۔ اس سلسلہ میں کوئی شاعر کہتا ہے ؎

لَهُمْ مِنْ عُمْرِهِ شَطْرٌ وَشَطْرٌ　　يُعَاقِرُ فِيهِ شُرْبَ الْخَنْدَرِيسِ

وَمَا لِلْغَانِيَاتِ لَدَيْهِ حَظٌّ　　سِوَى التَّقْطِيبِ بِالْوَجْهِ الْعَبُوسِ

إِذَا كَانَ الرَّئِيسُ كَذَا سَقِيمًا　　فَكَيْفَ صَلَاحُنَا بَعْدَ الرَّئِيسِ؟

فَلَوْ عَلِمَ الْمُقِيمُ بِدَارِ طُوسٍ　　لَعَزَّ عَلَى الْمُقِيمِ بِدَارِ طُوسٍ

اس کی عمر کا نصف حصہ تو ان ہیجڑوں کے لئے ہے اور باقی آدھا حصہ شراب پینے کے لئے ۔ خوبصورت عورتوں کے لئے اس کے نزدیک کوئی حصہ نہیں سوائے منہ بنانے اور چہرہ پر شکنیں ڈال لینے کے ۔ جب رئیس ایسا بیمار ہو تو رئیس کے بعد ہم لوگوں کی تندرستی کی کس طرح امید کی جا سکتی ہے اگر دار طوس

---

[1] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید صفحہ ۱۲۲ جلد ۱

(وہ مقام جہاں رشید مدفون تھا) میں رہنے والے کو یہ معلوم ہو جائے تو اسے دار طوس میں رہنا مشکل ہو جائے۔[1]

طبری کا بیان ہے کہ امین نے بادشاہ ہو جانے کے بعد تمام شہروں سے تلاش کرا کر کے لہو و لعب کے فن کاروں کو جمع کیا۔ ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھتا اور انہیں بیش قرار تنخواہیں دیتا اور طرح طرح کے عجیب و غریب چوپائے اور وحشی خطرناک جانور، درندے اور پرندے وغیرہ خریدنے میں بیش قرار رقمیں خرچ کر ڈالیں۔ اپنے بھائیوں، گھر والوں، وزراء اور امراء سے دور دور رہتا۔ ان کی توہین کرتا۔ خزانوں میں جو کچھ زر و جواہر تھا سب اپنے ہیجڑوں، ہم نشینوں اور خوش گپیاں کرنے والوں میں تقسیم کر ڈالا۔ اپنی سیر و تفریح کے لئے کئی مکانات بنوائے۔ ان میں خلوت کی جگہیں، کھیل کود کی جگہیں الگ الگ بنوائیں ..... دجلہ میں پانچ بڑے بڑے ستون بنوائے۔ ایک شیر کی صورت کا دوسرا ہاتھی کی صورت کا تیسرا عقاب کی صورت کا چوتھا سانپ کی صورت کا اور پانچواں گھوڑے کی صورت کا۔ ان کے بنوانے پر بے شمار دولت خرچ کر ڈالی۔ ان کے بارہ میں ابونواس شاعر نے اپنے مدحیہ قصیدے کہے[2] —— امین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اس کا وزیر فضل بن الربیع کہتا ہے کہ وہ ظربان (عود بلاؤ) کی طرح سوتا ہے، اسے مال و دولت کے زوال کی کوئی فکر نہیں۔ کوئی رائے قائم کرنے یا کوئی تدبیر اور چال سوچنے میں اپنی فکر کو تکلیف دینا پسند ہی نہیں کرتا اسے اس کے جام و سبو نے غافل کر رکھا ہے وہ اپنے لہو و لعب میں تیزی سے دوڑا چلا جا رہا ہے اور زمانہ اس کی ہلاکت کے لئے گڑ گڑا رہا ہے۔ عبداللہ مامون نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس نے اس کے لئے چلّہ میں نشانہ پر بیٹھنے والے تیر چڑھا لئے ہیں۔ مکان کی دوری کے باوجود اس پر موت کے تیر برسا رہا ہے اور گھوڑوں کی پشت پر اس کے لئے موتیں سوار کر کے بھیج رہا ہے۔ نیزوں اور تلواروں کی دھاریں اس نے اس کے لئے موت کی تیزیاں باندھ رکھی ہیں۔[3]

امین کے بعد مامون آیا۔ مامون کی خواہشات اور اس کے مشاغل وہ نہیں تھے جو امین کے تھے۔ امین کے مشغلے ایک الھڑ نوجوان کے مشغلے تھے۔ جسے سلطنت اور مال و دولت بے دریغ مل گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی عقل میں بھی پختگی نہیں آئی تھی۔ لہٰذا وہ ہر وقت اپنی شہوت کو فرو کرنے میں بے دریغ

مامون

[1] طبری صفحہ ۲۱۵ جلد ۱۰ [2] طبری صفحہ ۲۱۵ جلد ۱۰ [3] طبری صفحہ ۱۵۷ جلد ۱۰

دولت خرچ کرتا رہتا تھا۔ مامون اس کے برعکس وہ آدمی تھا جسے تجربات نے بہت کچھ سکھا دیا تھا ـــــ جنگ کی ہولناکیوں نے جو اس نے سہیں اور مملکت کی ضرورتوں نے کہ اسے از سرِ نو نئی تخلیق کی ضرورت تھی ـــــ مامون کو حزم و احتیاط اور معاملات کی بصیرت کا سبق دے دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی لذتیں زیادہ تر عقلی تھیں جن میں اس کا زیادہ تر وقت گزرتا تھا۔ اسے کتابوں سے محبت تھی۔ اسے فلسفہ سے عشق تھا۔ وہ دینی اور فقہی مسائل میں مناظرے اور مباحثے پسند کرتا تھا۔ اس کے گرد ہر قسم کے علماء رہتے تھے جن سے وہ ہر وقت بحث مباحثہ کرتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہلکا سا لہو و لعب بھی کر لیتا تھا۔ چنانچہ نبیذ بھی پی لیا کرتا تھا[1]۔ بغداد آجانے کے بعد بیس مہینے تک اس نے قطعاً گانا نہیں سُنا۔ اس کے بعد سننے لگا تھا[2]۔ اس کی مجلس کو زینت دینے والا اور اسے گانا سنانے والا اسحٰق موصلی تھا جیسا کہ اس کا باپ ابراہیم موصلی اس کے باپ رشید کی مجلس کو زینت بخشا کرتا تھا۔ مامون نے اسحٰق کو اپنا مقرب بنایا اور اس کی شان بہت بلند کر دی۔ ایسے ہی اس نے اپنے چچا ابراہیم بن المہدی کو بھی مقرب بنایا جو اپنے گانوں میں بڑا موجد تھا۔

امین اور مامون کے درمیان فتنوں کے دنوں میں لوگوں نے بڑی مشقتیں اور مصیبتیں اُٹھائی تھیں بغداد برباد ہو گیا تھا اور ہر طرف تنگی اور بدحالی کا دَور دَورہ تھا۔ جو نہی سکون و اطمینان لوٹا لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں جو کچھ وہ کھو چکے ہیں اس کے عوض کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت لوگ لہو و لعب میں گرفتار ہوئے اور حد سے تجاوز کر گئے۔

شاہی محلات کے مختلف پہلوؤں میں سے یہ ایک پہلو تھا جس کی تفصیل ہم نے بیان کی ہے کیونکہ فن اور ادب پہ اس کا بہت بڑا اثر تھا۔ شاہی محلات کے دوسرے پہلو بھی تھے۔ ایک سیاسی پہلو بھی تھا جو ہمارے موضوع کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک علمی پہلو بھی تھا یعنی علم کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی، اس سلسلہ میں مال و دولت کا خرچ، بحث مباحثہ اور مناظرہ کے لئے مجلسیں منعقد کرنا۔ کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ ان کو نقل کرانا اور ان کے ترجموں پہ کام کرنا۔ اس سلسلہ میں جن خلفاء نے بہت زیادہ کام کیا ان میں خلیفہ منصور، ہارون رشید اور مامون رشید کا نام سرِفہرست ہے۔ اس پہلو کی وضاحت ہم حرکت علمیہ پہ گفتگو کرتے ہوئے آئندہ کریں گے۔

---

[1] طبری صفحہ ۲۵۶ جلد ۱۰ وطیفور صفحہ ۴۲ جلد ۱ [2] اغانی صفحہ ۱۰۶ جلد ۵

شراب کے متعلق گفتگو اور مذاہب کا بیان

چونکہ شراب کے بارہ میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں ہم ابن خلدون کی وہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ بعض خلفاء نبیذ پیتے تھے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ عراق کے فقہاء نبیذ پینے کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کے اس قول کے اثرات ادب اور لٹریچر پر بھی پڑے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم شراب کے متعلق چند باتیں کہتے جائیں۔

عربوں کے ہاں شراب بہت ہوتی تھی اور اس کی انواع متعدد تھیں۔ وہ اپنے پڑوس میں بسنے والی دوسری قوموں سے بھی شراب کی نئی نئی اقسام اور رنگ رنگ کی عادات و رسوم لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ شام کے لوگوں نے رومیوں سے شراب کی وہ قسم لی جس میں شہد کی آمیزش ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کا رومی نام "رساطون" (ROSATOUN) نقل کیا ہے۔ جسے حجاز عرب کے لوگ اس سے پہلے نہیں پہچانتے تھے[1] جیسا کہ بعض اموی امراء و خلفاء نے ایرانیوں سے ایک شراب لے لی تھی جس کا نام "ہفتجہ" تھا۔ جسے ایران کے لوگ سات ہفتوں میں پیتے تھے جبکہ چاند اپنی بعض خاص منزلوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ولید بن یزید نے بھی اسے اسی طرح پیا تھا[2]۔

اسی طرح مختلف اقوام میں مختلف شرابیں، اور شراب سے متعلق مختلف عادات تھیں جو آہستہ آہستہ مسلمانوں میں بھی سرایت کرتی جا رہی تھیں۔ جب عباسیوں کا دور حکومت آیا تو انہوں نے اس کی انواع میں، اس کی مجالس میں اور مجلس آرائیوں میں مزید تفنن سے کام لیا۔

اسلام نے شراب کے خلاف جنگ کی اور نشہ کو حرام قرار دے دیا۔ یہ آیت نازل ہوئی :-

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ○

حقیقت یہ ہے کہ شراب، جوا، چڑھاوے اور تیروں کے ذریعہ سے تقسیم کئے ہوئے اموال ناپاک اور نجس چیزیں ہیں لہٰذا ان سے بچتے رہو۔ توقع ہے کہ اس طرح تم قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہ سکو گے۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تم لوگوں کے درمیان میں

---

[1] لسان العرب میں "رسط" کا مادہ ملاحظہ فرمائیے [2] اغانی صفحہ ۱۳۰ جلد ۶

عداوت اور بغض کے بیج بو دے اور تمہیں خدا کے قانون کو پیش نظر رکھنے سے اور صلوٰۃ سے روک دے۔ تو کیا اے مسلمانو! تم ان چیزوں سے باز آ جاؤ گے؟

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف سوالات اس آیت کریمہ کے متعلق اٹھائے گئے: "خمر" سے کیا مراد ہے۔ کیا صرف شیرہ انگوری کو یا ہر نشہ آور چیز کو "خمر" کہتے ہیں؟ کیا ہر قسم کی شراب جس کی زیادہ مقدار نشہ لاتی ہو اس میں سے تھوڑا سا پی لینا بھی حرام ہے یا بعض اقسام ایسی بھی ہیں جن میں تھوڑا سا پی لینا حلال ہے؟ دنیائے فقہ میں نبیذ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ حرام ہے یا حلال ہے اور حلال ہے تو کس قدر حلال ہے؟ یہ اختلاف صحابہؓ کے دور ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور بعد تک چلتا رہا۔ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا ہے کہ نبیذ کے بارہ میں ان اختلافات سے انہیں آنے والے خطرہ اور اس کے ضرر کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے پورے ملک میں اپنی ایک چٹھی گشت کرا دی تھی جس میں نبیذ کو انہوں نے حرام قرار دیا تھا[1] حتیٰ کہ ائمہ فقہ کا زمانہ آ گیا اور ان کے مابین بھی یہ اختلاف جوں کا توں رہا۔ تینوں امام یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اس طرف گئے کہ اس دروازہ کو مکمل طور پہ بند کر دینا ہی ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے آیت سابقہ میں "الخمر" کی تفسیر ایسے معانی کے ساتھ کی جس میں تمام نشہ آور نبیذیں یعنی کھجور کی نبیذ، کشمش کی نبیذ، جَو، چاول اور شہد کی نبیذ وغیرہ سب داخل ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ سب کو "خمر" کہا جاتا ہے اور سب کی سب حرام ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے آیت میں "الخمر" کی تفسیر شیرۂ انگور سے کی اور کلمۂ "خمر" کے لغوی معنی نیز بعض دوسری احادیث سے سند پکڑی اور ان کے اجتہاد نے انہیں اس نتیجہ پہ پہنچایا کہ نبیذ کی بعض اقسام مثلاً کھجور اور کشمش کی نبیذ اگر اسے ذرا سا جوش دیا گیا ہو اور اس کی اتنی مقدار پی لی جائے جو نشہ آور نہ ہو تو وہ حلال ہے۔ ایسے ہی اگر دو چیزوں کو ملا کر نبیذ بنائی جائے جسے "خلیطین" کہتے تھے۔ یعنی تھوڑی سی کھجوریں لی جائیں اور اس کے برابر کشمش لی جائے اور اسے برتن میں رکھ کر اس پر تھوڑا سا پانی ڈال دیا جائے اور کچھ عرصہ تک اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے تو اس کا پینا بھی جائز ہے۔ ایسے ہی شہد اور انجیر کی نبیذ اور گیہوں اور شہد کی نبیذ بھی[2]۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس مسئلہ میں جلیل القدر

---

[1] حضرت عمرؒ کا یہ خط العقد الفرید صفحہ ۴۱۱ جلد ۳ میں موجود ہے [2] ہم نے ان مسائل میں شرح نووی علی مسلم صفحہ ۶۲ ۳ جلد ۴ اور زیلعی صفحہ ۵۴ جلد ۶ وما بعد سے رجوع کیا ہے۔

صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی پیروی کی ہے۔ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہی اہل عراق کے مدرسہ کے امام تھے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ اور ابن مسعودؓ کی فقہ میں کس قدر شدید ارتباط ہے[۱]۔ ہمارے اس خیال کی دلیل وہ روایت ہے جو صاحب عقد فرید نے عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے کہ وہ نبیذ کو حلال سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان سے یہ روایات بڑی کثرت اور شہرت کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں اور پھیلائی گئی ہیں۔ کوفہ کے عام تابعین نے ان روایات ہی کی پیروی کی ہے۔ اور انہیں اپنی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

مَنْ ذَا یُحَرِّمُ مَاءَ الْمُزْنِ خَالَطَہٗ فِیْ جَوْفِ خَابِیَۃٍ مَاءُ الْعَنَاقِیْدِ ؟

اِنِّیْ لَاَکْرَہُ تَشْدِیْدَ الرُّوَاۃِ لَنَا فِیْہِ وَ یُعْجِبُنِیْ قَوْلُ ابْنِ مَسْعُوْدِ

کون ہے جو اس بارش کے پانی کو حرام قرار دے دے جس میں کسی گڑھے کے اندر چند خوشوں کا عصارہ مل گیا ہو۔ میں رواۃ کے اس تشدد کو پسند نہیں کرتا جو وہ اس سلسلہ میں ہمارے لئے کرتے ہیں۔ مجھے تو اس ضمن میں ابن مسعودؓ کا قول بہت پسند ہے[۲]۔

بہرحال فقہاء کے درمیان نبیذ کے بارہ میں سخت جھگڑا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ گانے کے بارہ میں ان میں سخت اختلاف تھا۔ چنانچہ ابن ابی لیلیٰ نبیذ کو حرام قرار دیتے اور امام ابوحنیفہ سے بحثیں کرتے تھے اور ابوحنیفہ ان کا جواب دیتے تھے۔ کوفہ کے فقہاء میں تنہا عبداللہ ابن ادریس تھے جو نبیذ کو حرام کہتے تھے اور وہ ان لوگوں کی تردیدیں کرتے تھے اور یہ لوگ عبداللہ ابن ادریس کی تردیدیں کرتے تھے[۳]۔ چونکہ اکثر فقہائے عراق نبیذ کو حلال سمجھتے تھے لہٰذا عراق کے لوگ نبیذ کو حلال سمجھنے میں مشہور تھے۔ چنانچہ ان کا ایک شاعر کہتا ہے :-

رَاْیُہٗ فِی الْغِنَاءِ رَاْیُ حِجَازِیٍّ وَ فِی الشَّرَابِ رَاْیُ اَھْلِ الْعِرَاقِ

گانے کے بارہ میں اس کی رائے حجازی ہے اور شراب کے بارہ میں اہل عراق کی رائے کے

---

[۱] فجر الاسلام صفحہ ۲۲۰ [۲] العقد صفحہ ۳۵۱ جلد ۳ [۳] ملاحظہ ہو کتاب العقد اور ابن قتیبہ کی کتاب الاشربہ۔ یہ کتاب مجلہ المقتبس میں شائع ہو چکی ہے اور صاحب العقد نے بھی اس کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

مطابق ہے[1]۔

یہ بحث مباحثے ادیبوں اور شاعروں تک پہنچ گئے تھے۔ اور انہوں نے ان آراء کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے تھے: "اہلِ حرمین نے گانے کو حلال کر دیا ہے اور نبیذ کو حرام کر دیا ہے اور اہلِ عراق نے نبیذ کو حلال اور گانے کو حرام کر دیا ہے۔ لہٰذا ان حضرات نے اپنے اختلاف کی وجہ سے ہمارے لئے دونوں معاملوں میں رخصت مہیا کر دی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں اتفاق ہو جائے[2]۔ ابن الرومی نے کہا :۔

أَبَاحَ الْعِرَاقِيُّ النَّبِيذَ وَشُرْبَهُ ... وَقَالَ: حَرَامَانِ الْمُدَامَةُ وَالسُّكْرُ

وَقَالَ الْحِجَازِيُّ: الشَّرَابَانِ وَاحِدٌ ... فَحَلَّ لَنَا مِنْ بَيْنِ قَوْلَيْهِمَا الْخَمْرُ

سَآخُذُ مِنْ قَوْلَيْهِمَا طَرَفَيْهِمَا ... وَأَشْرَبُهَا لَا فَارَقَ الْوَازِرَ الْوِزْرُ

عراقی فقہاء نے نبیذ اور اس کے پینے کو مباح قرار دیا۔ اور انہوں نے کہا کہ حرام تو شراب اور نشہ ہے۔ حجازی فقہاء نے کہا کہ دونوں پینے کی چیزیں (نبیذ اور شراب) ایک جیسی ہیں لہٰذا ان دونوں کی باتوں سے ہمارے لئے شراب کا جواز نکل آیا۔ میں دونوں کی باتوں کا ایک ایک جزو لے لیتا ہوں۔ (عراقی فقہاء کا یہ جزو کہ نبیذ حلال ہے اور حجازی فقہاء کا یہ جزو کہ پینے کی دونوں چیزیں ایک جیسی ہیں) اور شراب پیتا ہوں۔ گنہگار سے گناہ کبھی جدا نہ ہو[3]۔

مختصر یہ کہ بہت سے لوگوں نے ان آراء کو بہانہ بنا کر انہیں اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ فقہاء کا یہ اختلاف نبیذ نوشی کا باعث نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس نوع تک ہی اکتفاء نہیں کرتے تھے جس کو انہوں نے حلال قرار دیا تھا اور نہ اس مقدار تک اکتفاء کرتے تھے

---

[1] باوجودیکہ اکثر فقہائے عراق نبیذ کو حلال سمجھتے تھے، اسے پینے سے بہرحال احتراز برتتے تھے۔ اس سلسلہ میں کسی فقیہہ کا یہ قول مشہور ہے کہ میرے لئے بار بار نبیذ کے بارہ میں یہ کہنا کہ وہ حلال ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں ایک مرتبہ اسے حرام کہہ دوں۔ اور میرے لئے آسمان سے گر پڑنا اور ریزہ ریزہ ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں اس کا ایک قطرہ بھی چکھوں۔ الغیث صفحہ ۲۱۴ جلد ۱ [2] محاضرات الادباء صفحہ ۴۱۲ جلد ۱ [3] محاضرات الادباء صفحہ ۴۱۲ جلد ۱

جو ان کے نزدیک جائز تھی۔ کیونکہ کسی فقیہہ نے بھی نبیذ کی کسی قسم کو نشہ لانے کی حد تک پینا جائز قرار نہیں دیا تھا۔ لیکن یہ تو ادیبوں کا ایک تفنن تھا اور شعراء کی ظرافت تھی جو انہیں ہاتھ آگئی تھی۔

ابو نواس اور اس کے ہم نوا شعراء نے کبھی اس طرح کے حیلوں کی آڑ نہیں لی بلکہ وہ کھلم کھلا پیتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ اس کا پینا حرام ہے۔ ان کا لیڈر ابو نواس کہتا ہے:۔

فَإِنْ قَالُوا حَرَامٌ قُلْ حَرَامٌ وَلٰكِنَّ اللَّذَاذَةَ فِي الْحَرَامِ

اگر لوگ کہتے ہیں کہ شراب حرام ہے تو تم بھی کہو کہ حرام ہے۔ لیکن یہ بھی تو واقعہ ہے کہ لذت حرام ہی میں ہوتی ہے۔

اور وہ کہتا ہے:۔

اَلَا فَاسْقِنِيْ خَمْرًا، وَقُلْ لِيْ هِيَ الْخَمْرُ وَلَا تَسْقِنِيْ سِرًّا اِذَا اَمْكَنَ الْجَهْرُ

یاد رکھو! تو مجھے شراب پلا اور کہہ کہ یہ شراب ہے۔ اور جب تک کھلم کھلا پلانا ممکن ہے مجھے چھپ کر نہ پلا۔

عباسی گھرانا اور لوگوں پر اس کے اثرات

خواص اور مال دار لوگوں نے خلفاء کے محلات کی تقلید کی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے بلکہ لہو و لعب میں یہ لوگ خلفاء سے بھی بڑھ گئے کیونکہ طبعی طور پر خلفاء کی مجالس میں رعب اور وقار قائم رکھا جاتا تھا اور ان مال داروں اور خواص کی مجالس میں اس کا اہتمام بھی نہیں تھا۔

خلفاء کی اولاد اور ان کے اعزا و اقارب کچھ کم نہیں تھے۔ مامون کے زمانہ میں ان کو شمار کیا گیا تو مرد، عورتیں بچے اور بڑے سب مل ملا کر تینتیس ہزار تک پہنچتے تھے[1] سب کے سب اپنی خوبصورتی اور نزاکت میں ممتاز تھے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اولادِ خلافت کی خوبصورتی ہارون رشید کی اولاد پر ختم ہو گئی ہے۔ اور رشید کی اولاد میں سے بھی محمد اور ابو عیسیٰ پر ختم ہو گئی ہے۔ ابو عیسیٰ جب سوار ہو کر کہیں جاتے تھے تو لوگ انہیں دیکھنے کے لئے سڑک پر دو رویہ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ خود خلفاء کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ اس کثرت سے نہیں بیٹھتے تھے[2] اس گھرانے کے زیادہ تر افراد گانے اور دیگر فنون لطیفہ کے گرویدہ تھے۔ عُلَیّہ بنت مہدی ان شاعروں میں سے تھی جو

---

[1] مسعودی صفحہ ۲۵۹ جلد ۲ [2] اغانی صفحہ ۹۶ جلد ۹

نہایت عمدہ اور نہایت ظرافت آمیز اشعار کہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے خود ہی بہتر سے بہتر دھنیں بھی ایجاد کرلیتی تھی[1]۔ اور اس کا بھائی ابراہیم ابن المہدی بھی گانوں کا بہترین عالم ساز بجانے کا بہترین ماہر اور گانے میں نہایت طباع اور نہایت خوش گلو شخص تھا[2]۔ پھر ابو عیسیٰ ابن ہارون رشید ــ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ــ اپنی خوبصورتی میں نہایت مشہور تھا۔ چہرہ اور بشرہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ حسین۔ ساتھ بیٹھنے اور بات چیت کرنے میں سب سے بہتر۔ نہایت رند مشرب بہترین نادرہ گو اور سب سے زیادہ کھیلوں کا شائق[3]۔ اس کی موت کا سبب یہ ہوا کہ اسے سُوَر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ شکار میں سواری سے گر پڑا اور دماغ پہ چوٹ آئی جس سے جاں بر نہ ہو سکا[4]۔ خواص کی اولاد ان کے قدم بقدم چلتی تھی فضل بن الربیع ــ رشید کے وزیر ــ کا پوتا یعنی عبداللہ بن عباس ابن فضل بن الربیع، ماہر مغنی تھا۔ رند مشرب اور عریاں گو شاعر تھا[5]۔ نرگس کے باغیچوں میں صبح گزارتا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس جیسے نوجوان بکثرت تھے جن کا تذکرہ کرنے سے مضمون طویل ہو جائے گا۔ مالدار خواص کی اولاد سے یہ بیماری متعدی ہو کر درمیانی طبقہ تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھی ان کے قدم بقدم چلتے اور ان کے طریقہ پہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ترفہ کے مظاہر

فن تعمیر میں بھی انہوں نے بڑی تفنن آفرینیاں کیں اور عمدگی کے ساتھ بڑے بڑے محلات بنائے۔ ابن الجہم نے اس کی تعریف میں کہا تھا:-

صُحُوْنٌ تُسَافِرُ فِیْهَا الْعُیُوْنُ ... وَتَحْسِرُ مِنْ بُعْدِ اَقْطَارِهَا

وَقُبَّةُ مُلْكٍ كَاَنَّ النُّجُوْ ... مَ تُصْغِیْ اِلَیْهَا بِاَسْرَارِهَا

وَفَوَّارَةٌ ثَاْرُهَا فِی السَّمَاءِ ... فَلَیْسَتْ تُقَصِّرُ عَنْ ثَاْرِهَا

اِذَا اُوْقِدَتْ نَارُهَا فِی الْعِرَاقِ ... اَضَاءَ الْحِجَازَ سَنَا نَارِهَا

تَرُدُّ عَلَی الْمُزْنِ مَا اَنْزَلَتْ ... عَلَی الْاَرْضِ مِنْ صَوْبِ اَمْطَارِهَا

لَهَا شُرُفَاتٌ كَاَنَّ الرَّبِیْعَ ... كَسَاهَا الرِّیَاضَ بِاَنْوَارِهَا

وسیع صحن ہیں جن میں نگاہیں سفر کرتی ہیں اور ان کے بعد مسافت کی وجہ سے نگاہیں گوشۂ چشم میں سمٹ کر لوٹ آتی ہیں۔ شاہی اونچے اونچے قبے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ستارے اُن سے سرگوشیاں کر رہے

---

[1] اغانی صفحہ ۳۰۸ جلد ۹ [2] اغانی صفحہ ۵۳ جلد ۹ [3] اغانی صفحہ ۹۶ جلد ۹ [4] اغانی صفحہ ۹۷ جلد ۹ [5] اسکے حالات اغانی صفحہ ۲۰۷ جلد ۱۷ میں دیکھیے۔

ہیں۔ فوارے ایسے کہ ان کی نظیر آسمان ہی پر مل سکتی ہے۔ مادر جو اپنی ان نظیروں سے کسی طرح کم رتبہ نہیں ہیں۔ جب ان عمارات کے میناروں میں آگ عراق میں روشن کی جائے تو ان کی آگ کی روشنی حجاز کو روشن کر ڈالے۔ وہ فوارے بادلوں کو ان کا وہ پانی واپس دے رہے ہیں جو انہوں نے زمین کے اطراف میں برسایا ہے۔ ان میں ایسے ایسے سبز پوش بالاخانے ہیں کہ گویا بہار نے انہیں اپنے باغات اور باغات کے شگوفے پہنا دیئے ہوں۔

کوئی آدمی واثق باللہ کے ایک قصر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حشم و خدم مجھے برابر دوسرے حشم و خدم کے حوالہ کرتے رہے تاآنکہ میں ایک ایسے مکان میں پہنچا جس کا صحن پختہ فرش کا تھا اس کی دیواروں پر زرکار دیباکے پردے پڑے ہوئے تھے کہ دیوار کہیں سے نظر نہیں آتی تھی پھر میں ایک عالی شان دیوان میں پہنچا جس کی زمین اور دیواروں پر اسی قسم کے پردے اور فرش پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا تو دیوان کے صدر میں واثق باللہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک تخت پر بیٹھا تھا جو جواہرات سے مرصع تھا۔ جو لباس وہ پہنے ہوئے تھا وہ بھی سونے کے تاروں سے بنا ہوا تھا اور اس کے پہلو میں اس کی باندی "فریدہ" بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی قسم کا لباس پہنے ہوئی تھی۔ اور اس کی گود میں عود تھا۔[1] الخ دستر خوانوں، دستر خوانوں کی ترتیب و نظم، اور رنگ برنگے کھانوں میں بھی کافی مبالغہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عمانی شاعر نے محمد بن سلیمان بن علی کے دستر خوانوں پر جو کچھ کھایا تھا اس کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے ؎

جَاؤُوا بِفُرْنِيٍّ لَهُمْ مَلْبُوْنٍ ... بَاتَ يُسْقَى خَالِصَ السَّمُوْنِ

مُصَوْمَعٍ أَكْوَمَ ذِي غُضُوْنٍ ... قَدْ حُشِيَتْ بِالسُّكَّرِ الْمَطْحُوْنِ

وَلَوَّنُوْا مَا شِئْتَ مِنْ تَلْوِيْنٍ ... مِنْ بَارِدِ الطَّعَامِ وَالسَّخِيْنِ

وَمِنْ شَرَاسِيْفٍ وَمِنْ طُرْدِيْنٍ ... وَمِنْ هُلَامٍ وَمَصِيْصٍ جُوْنٍ

وَمِنْ أَوَزٍّ فَائِقٍ سَمِيْنٍ ... وَمِنْ دُجَاجٍ ثُمَّ بِالتَّحْجِيْنِ

فَأَشْبَعُوْهُمْ فِي الظُّهُوْرِ وَالْبُطُوْنِ ... وَأَتْبَعُوْا ذٰلِكَ بِالْجَوْزِيْنِ

وَبِالْخَبِيْصِ الرَّطْبِ وَاللَّوْزِيْنِ ... وَفَكَّهُوْا بِالْعِنَبِ وَالتِّيْنِ

---

[1] اغانی صفحہ ۱۸۳، جلد ۳

وَالرُّطَبِ الْأَزَاذِ وَالنَّهْشِيَّةِ

وہ اپنی دودھ پلائی ہوئی فرنی لائے (فرنی ایک روٹی کی قسم ہے جس کے کنارے درمیان تک ملا دیئے جاتے ہیں اور گھی میں بھون لی جاتی ہے پھر اُسے دودھ گھی اور شکر میں دیر تک تر رکھتے ہیں) جسے رات بھر خالص گھی پلایا گیا تھا۔ اندر سے کھوکھلی تھی اوپر سے اُٹھی ہوئی اور پھولی ہوئی اس کے اندر پسی ہوئی شکر بھری ہوئی تھی اور قسم قسم کے رنگ برنگے کھانے انہوں نے پیش کئے جن میں گرم کھانے بھی تھے اور ٹھنڈے بھی۔ بھُنی ہوئی چاپ، گُردوں کا خاص کھانا طُردین بکرے کے بچہ کے گوشت کے بھُنے ہوئے کلیجے، بُھنا ہوا گوشت جسے سرکہ میں بسایا گیا تھا۔ اور سیاہی مائل ٹکڑے عمدہ تروتازہ پرندے اور مُرغ جن کو آٹے کے ساتھ توڑ کر پکایا گیا تھا۔ کمر اور شکم کی چربی، اور ان سب کے بعد جوزین (اخروٹ کی کھیر) سوجی کا حلوہ، کھجور کا حلوہ اور بادام کا حلوہ۔ پھر تفکہات میں انہوں نے انگور اور انجیر پیش کئے اور عمدہ قسم کی ازاذ اور ہیرون (دو عمدہ قسم کی) کھجوریں۔

ابو العتاہیہ کا بیان ہے کہ مجھے مخارق (ایک مغنی کا نام ہے) کے گھر میں بلایا گیا۔ میں اس سے ملنے کے لئے گیا تو وہ ایک نہایت صاف ستھرے مکان میں لے گیا جس میں صاف اور پاکیزہ فرش بچھا ہوا تھا۔ پھر اس نے دسترخوان منگایا جس پر تلی ہوئی روٹی، سرکہ، سبزیاں اور نمک تھا۔ ایک بھُنا ہوا بکری کا بچہ تھا۔ جسے ہم نے کھایا۔ اس کے بعد اس نے بھُنی ہوئی مچھلی منگائی، ہم نے خوب شکم سیر ہو کر کھائی۔ پھر اس نے حلوا منگایا۔ ہم نے وہ بھی کھایا اور ہاتھ دھو لئے۔ اس کے بعد فواکہ اور مختلف پھول پیش کئے گئے اور طرح طرح کی نبیذیں لائی گئیں۔ اور مخارق نے مجھ سے کہا ان میں جو نبیذ مجھے پسند ہو اُسے منتخب کر لیجئے۔ چنانچہ میں نے انتخاب کر کے نبیذ پی[۱]۔ یہ ابو العتاہیہ کے زاہد بننے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

لہو و لعب اور شراب کی مجلسوں کے متعلق تو آپ کا جو جی چاہے کہہ لیجئے۔ وہاں آزادی اور رندمشربی کا جو مظاہرہ ہوتا تھا اس کے بیان سے پوری کتاب الاغانی بھری پڑی ہے نیز بشار بن بُرد، ابونواس اور مسلم بن الولید جیسے شعراء کے دواوین بھی[۲]۔

کھانے کے وہ بہت زیادہ گرویدہ ہو چکے تھے اور اس سلسلہ میں بھی ان کی تفنن آفرینیاں کچھ کم نہیں تھیں۔

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۸ جلد ۳ [۲] شراب کی مجلس کے بیان میں اشجع کا بیان پڑھئے۔ اغانی صفحہ ۴۲ جلد ۱۷، اور ابن رامین کے اشعار دیکھئے ج ۱ ص ۱۳۶ و مابعد صفحہ ۱۱۲ / ۵۵ ج ۱۷

اپنی گانے کی مجلسوں میں انہوں نے خوش مذاقی کی باتیں، لطیفے، نادرہ گوئی کے عمدہ نمونے اور شراب وغیرہ داخل کر لی تھیں۔ اس سلسلہ میں ان کے دو مسلک تھے ایک جدید اور دوسرا قدیم۔ ہر فریق کو اپنے اپنے مسلک کے ساتھ تعصب تھا۔[1] چوسر اور شطرنج بھی وہ کھیلتے تھے اور اس میں انہیں کافی غلو تھا۔[2] کبوتروں کو پالنے اور انہیں تربیت دینے کا بھی خاص اہتمام تھا چنانچہ کبوتروں کی قیمت بہت گراں ہو گئی تھی۔[3] مرغ لڑانے اور کتے لڑانے کا بھی زبردست شوق تھا۔[4] ابونواس عرصہ تک کتوں کا کھیل کھیلتا رہا حتیٰ کہ اسے کتوں کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی تھیں جتنی اعرابیوں کو بھی نہیں ہوتیں۔[5] جوا عام طور سے پھیلا ہوا تھا حتیٰ کہ فقیروں کے تکیوں تک میں جوا کھیلا جاتا تھا۔[6] نقش و نگار اور مصوری کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ پیالوں پر مختلف چیزوں کی تصاویر بنانے کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ جس کا تذکرہ آپ کو بشار اور ابونواس کے اشعار میں جگہ جگہ مل سکتا ہے۔ ابوالشیل نے ایک چراغ دان کا مرثیہ لکھا تھا جس پر نہایت نادر مصوری کی گئی تھی۔ اس چراغ دان کو اس کے ایک بکرے نے توڑ دیا تھا۔[7] یوم نوروز پر طرح طرح کے ہدایا ایک دوسرے کو دیتے تھے جن پر طرح طرح کے عجیب و غریب نقش و نگار اور تصویریں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔[8] رقص سرود کو کافی ترقی ہو گئی تھی۔ اسحٰق بن ابراہیم موصلی بہت اچھا رقص کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں اور بھی بہت سے لوگ رقص میں شہرت رکھتے تھے۔[9] باغات کو بہت پسند کرتے تھے۔ سیر و تفریح کے لئے اکثر باغات میں چلے جاتے تھے۔ دسترخوانوں کو پھولوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ پھولوں کے رنگوں اور خوشبوؤں کے بارہ میں شعراء غزلیں کہتے تھے۔[10] غرضکہ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

دولت بے شمار ہو گئی تھی۔ ایرانی عنصر جو ہدنیت و تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا بڑھ گیا تھا۔ ساتھ ہی ترفہ و تنعم میں بھی وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ باندیاں بکثرت ہو گئی تھیں جو مختلف ممالک سے برابر لائی جا رہی تھیں۔ خوبصورتی عام اور بے حجاب ہو گئی تھی۔ کیونکہ عام طور پر باندیوں سے پردہ نہیں کرایا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لہو و لعب، غزل گوئی، رندی اور سے آشامی کا زور کافی بڑھ گیا تھا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ شعراء نے لوگوں کے اس

---

[1] اغانی صفحہ ۲۵ جلد ۷۔ [2] مسعودی صفحہ ۵۶ ۴ جلد ۲۔ [3] کتاب الحیوان صفحہ ۹۱ جلد ۳۔ [4] اغانی صفحہ ۵۷ جلد ۶۔ [5] کتاب الحیوان صفحہ ۱۰ جلد ۲۔ [6] کتاب الحیوان صفحہ ۱۱۵ جلد ۵۔ [7] اغانی صفحہ ۲۷ جلد ۱۳ نیز زہر الادب صفحہ ۶۳ جلد ۳ بھی ملاحظہ کیجئے۔ [8] نوروز ایرانیوں کی تقریب تھی (۱۱۔ ب) طلوع اسلام۔ [9] اغانی جلد پنجم۔ زیر حالات اسحاق۔
[10] اغانی صفحہ ۱۲۰ جلد ۱۲۔

رجحان کو محسوس کر لیا اور بشار بن برد، صریع الغوانی اور ابونواس جیسے شاعروں نے اس طوفان کو اور بڑھایا اس آگ کو اور بھڑکایا اور اس کا راستہ اور آسان بنا دیا۔

قوم شراب پی کر مست ہوتی تھی اور ضرورت محسوس کرتی تھی کہ انہیں ایسے اشعار ملیں جو ان کے اس رجحان کی سیری کا سامان مہیا کریں، ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھائیں اور برابر شراب پیتے چلے جانے پر انہیں ابھاریں۔ ان شعراء کے اشعار میں انہیں اپنی خواہش کی سیرابی کا سامان مل جاتا تھا۔ اگر وہ کسی نوجوان لڑکی یا عورت کے ساتھ تشبیب کرنا چاہتے تو ان شعراء کے اشعار میں انہیں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کا سامان ایسا مل جاتا تھا جس میں کھلم کھلا عریانی کے ساتھ بغیر کسی استعارہ اور کنایہ کے یہ سب کچھ کہا گیا ہوتا تھا۔ بشار بن برد کے تو دو دن اس قسم کی آزاد عورتوں کے لئے مخصوص تھے جن میں وہ ان کو اس قسم کے فحش اور عریاں اشعار سنایا کرتا تھا اور وہ ان اشعار کو اس سے سیکھ کر لوگوں میں ان کو پھیلاتی تھیں۔

ترفہ کا حجاز سے عراق کی طرف انتقال

لہذا کوئی تعجب نہیں اگر زندگی ان دنوں لہو و لعب کی زندگی تھی اور اگر شعراء کے اشعار اس عہد میں باستثناء چند عموماً فحش، عریاں اور فسق و فجور سے پُر ہوتے تھے۔

یہاں ایک بات بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہے۔ یہی عراق جو بنو امیہ کے عہد حکومت میں وہ علاقہ تھا جو شام اور حجاز کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند واقع ہوا تھا[1]۔ اب عباسی حکومت میں لہو و لعب کا مرکز بلکہ لہو و لعب والوں کی نگاہوں کا محور بن گیا تھا اور سارے شہر عراق کے لہو و لعب ہی سے خوشہ چینیاں کرتے تھے۔

اس کا سبب چند امور تھے۔ جن میں سے اہم ترین ـــــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے دو چیزیں تھیں۔

(اول) مال۔ عراق وہ جگہ تھی جہاں ساری دولت مند مملکت اسلامیہ کے اموال آکر جمع ہوتے تھے ـــــ اس وجہ سے کہ عراق ہی مرکز خلافت تھا ـــ اور مال ہی لہو و لعب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جہاں یہ ہوتا ہے وہاں لہو و لعب ضرور ہوتا ہے۔ غلام، شراب، گانا بجانا وغیرہ وہیں ہوتا ہے جہاں ترفہ و تنعم ہوتا ہے اور ترفہ و تنعم بغیر مال کے نہیں ہو سکتا۔ عراق مال کے اعتبار سے سب ممالک سے بڑھا ہوا اور مرتبہ کے لحاظ سے سب سے فائق تھا۔ ہر فن کے باکمال آدمی ـــ ادب بھی فن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے ـــ کا سکہ عراق ہی میں

---

[1] فجر الاسلام صفحہ ۲۱۵۔

آکسہ چلتا تھا۔ اگر کوئی باکمال آدمی عراق نہیں آتا تھا تو اس کی شہرت ہی نہیں ہوتی تھی اور اس طرح اس کا فن ضائع ہو جاتا تھا۔ کون سا مشہور مغنی تھا جو عراق میں نہیں تھا۔ کون سا بلند مرتبہ شاعر تھا جو عراق میں نہیں رہا اور کون سی باندی تھی جو خوب صورتی یا گانے میں کوئی امتیازی درجہ رکھتی ہو اور عراق نہ آئی ہو۔

(دوم) دوسرا سبب یہ تھا کہ عراق میں مخلوط نسل کے لوگ زیادہ تھے۔ قدیم زمانہ سے مختلف قومیں اور متعدد تہذیبیں یہاں حکمراں رہیں۔ عباسی عہد حکومت میں عراق خلافت کا پایۂ تخت اور مختلف اقوام کا مقصود نظر رہا۔ ساتھ ہی یہ ایرانیوں کے ارستقراطی (ARISTOCRATIC) عنصر کا مسکن تھا۔ ہند اور روم اور دیگر ممالک سے جو لوگ سفر کر کے آتے تھے وہ یہیں آکر اترتے تھے۔ ہر جنس کے بہتر سے بہتر غلام یہیں لائے جاتے تھے۔ لہو و لعب میں ان سب کی اپنی تاریخ تھی۔ تہذیب و تمدن کی گہرائی تھی۔ اور ترفہ و تنعم کی تفنن آفرینیاں تھیں۔ جب یہ لوگ عراق میں آتے اور دیکھتے کہ راستے قطعاً ہموار ہیں تو ہر قوم اپنا فن پیش کرتی اور اپنی تہذیب و مدنیت کی انواع و اقسام سامنے لاتی۔ اس وجہ سے عراق ایک عام نمائش گاہ بن گیا تھا۔ چنانچہ عراق نے ان سے ہر چیز لی اور بستہ وا فر لی جاتی ممالک اور شہروں نے تو جو کچھ سیکھا عراق ہی سے سیکھا اور عراق ہی کی خوشہ چینی کی اور اسی سے کچھ حاصل کیا

لیکن سچ یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے یہ تمام لوگوں کا حال نہیں تھا۔ کیونکہ سب کے سب نہ تو مال دار ہی تھے اور نہ سب کے سب ہزل گو ہی تھے۔ دنیا کی کسی قوم کا کسی زمانہ میں بھی یہ حال نہیں رہا۔ پھر پورا عالم اسلامی عراق ہی میں محدود نہیں تھا اور نہ عراق کے ملاہی و ملاعب سارے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی سارا عراق اس قسم کی زندگی بسر کر رہا تھا ـــــ لہٰذا اگر آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ فرمائیں اور اس کے صفحات میں لہو و لعب کی ایک نوع سے گزر کر دوسری نوع کا حال پڑھیں یا دیوان ابونواس کا مطالعہ فرمائیں اور اس میں شراب و کباب اور رندی و مے آشامی کے کوائف دیکھیں تو اس سے آپ کو یہ خیال نہیں کر لینا چاہئے کہ وہ اس پورے عہد کی تصویر ہے بلکہ واقعہ یہی ہے کہ وہ اس عہد کے متعدد نواحی اور مختلف وجوہ میں سے کسی ایک ناحیہ اور کسی ایک جہت کی تصویر ہوتی ہے۔ صاحب اغانی کا عذر یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب مغنیوں کے طبقات بیان کرنے کے لئے تصنیف کی ہے اور مغنی ہر عہد میں لہو و لعب کا مرکز اور رندی و آزادہ روی کا محور ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمارا خیال ہے کہ ہمیں یہاں پہنچ کر اس نکتہ پر بھی متنبہ کر دینا چاہئے جس کا احساس ابن خلدون

کو ہوا اور وہ نکتہ یہ تھا کہ بڑے لوگوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے لذت اندوزیوں سے متعلق جھوٹی خبریں اور بے سروپا افسانے بھی گھڑے جاتے تھے۔ چنانچہ لوگ لہو و لعب کے افسانوں میں ان بڑے لوگوں کو ابھارنے کے لئے خوب نمک مرچ لگاتے اور مبالغہ آرائیوں سے کام لیتے تھے تاکہ اس کے نتیجہ میں انہیں ان بڑے لوگوں سے مال اور جاہ وغیرہ حاصل ہو سکے۔

دولت مندی اور تنگ دستی میں لوگوں کے مختلف حالات

مملکت کے اموال کی تقسیم مساویانہ تو درکنار منصفانہ بھی نہیں تھی۔ مختلف طبقات کے درمیان جو فرق تھا وہ خفیف درجہ کا نہیں تھا۔ بلکہ ان کے درمیان بڑی گہری خلیجیں حائل تھیں۔ مملکت کے اموال کا بڑا حصہ خلفاء کے محلات، امراء، رؤساء فوج، حکام سلطنت پر خرچ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بے دردی کے ساتھ اسے مقربین شعراء، ادباء، علماء، موسیقار اور باندیوں، غلاموں، نوکروں چاکروں وغیرہ پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ اس کے بعد تجارت پیشہ لوگوں کا طبقہ تھا۔ یہ لوگ ثروت کے لحاظ سے پہلے درجہ کے لوگوں سے کم ہوتے تھے۔ رہ گیا قوم کا عام طبقہ تو ان میں فقر و فاقہ عام تھا۔

مال دار طبقہ کو بغداد بہت پسند تھا۔ کیونکہ انہیں اپنے مذاق کی تمام چیزیں یعنی عیش و عشرت کی زندگی، فارغ البالی اور مسرت و فرحت میسر آسکتی تھیں۔

أَعَايَنْتَ فِي طُولٍ مِنَ الْأَرْضِ وَالْعَرْضِ ... كَبَغْدَادَ دَارًا إِنَّهَا جَنَّةُ الْأَرْضِ

صَفَا الْعَيْشُ فِي بَغْدَادَ وَاخْضَرَّ عُودُهُ ... وَعَيْشٌ سِوَاهَا غَيْرُ صَافٍ وَلَا غَضِّ

تَطُولُ بِهَا الْأَعْمَارُ إِنَّ غِذَاءَهَا ... مَرِيءٌ وَبَعْضُ الْأَرْضِ أَمْرَأُ مِنْ بَعْضِ

تم نے زمین کے طول و عرض میں بغداد کی طرح کی کوئی جگہ دیکھی ہے؟ بغداد تو زمین کی جنت ہے۔ بغداد میں زندگی بڑی صاف اور پاکیزہ ہے وہاں کی لکڑیاں بڑی سرسبز ہیں جبکہ دوسرے شہروں کی زندگی ناصاف اور ناخوشگوار ہے۔ بغداد میں عمریں بڑی لمبی ہوتی ہیں کیونکہ وہاں کی غذا خوش گوار ہے جبکہ بعض زمینیں دوسری زمینوں سے زیادہ تلخ اور ناخوش گوار ہوتی ہیں[1]۔

رہ گئے فقراء اور ضرورت مند لوگ تو ان پر بغداد اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ تنگ تھا۔ ان کے لئے وہاں

---

[1] تاریخ بغداد صفحہ ۶۸ جلد ۱

رہنا اور زندگی گزارنا ناممکن بن گیا تھا۔۔

بَغْدَادُ دَارٌ طِيبُهَا آخِذٌ — نَسِيمُهَا مِنِّي بِأَنْفَاسِي

يَصْلُحُ لِلْمُوسِرِ لَا لِامْرِئٍ — يَبِيتُ فِي فَقْرٍ وَ إِفْلَاسِ

لَوْ حَلَّهَا قَارُونُ رَبُّ الْغِنَى — أَصْبَحَ ذَا هَمٍّ وَ وَسْوَاسِ

هِيَ الَّتِي تُوعَدُ لٰكِنَّهَا — عَاجِلَةٌ لِلطَّاعِمِ الْكَاسِي

حُورٌ وَ وِلْدَانٌ وَ مِنْ كُلِّ مَا — تَطْلُبُهُ فِيهَا سِوَى النَّاسِ

بغداد ایسی جگہ ہے جہاں کی خوشبو اور ہوائیں مجھ سے تو میرا سانس تک چھین لینا چاہتی ہیں۔ وہ تو مالدار لوگوں کے لئے موزوں جگہ ہے اس آدمی کے لئے موزوں نہیں جو فقر و افلاس میں زندگی گزارتا ہو اگر بغداد میں دولت مند قارون بھی آجائے تو وہ بھی فکر مند اور وسواسی بن جائے گا۔ یہ وہی جگہ ہے جس کا ہم سے (مرنے کے بعد) وعدہ کیا جاتا ہے اور کھانے پینے والوں کو جلد (اسی دنیا میں) دے دی گئی ہے۔ اس میں حوریں بھی ہیں غلمان بھی ہیں اور ہر وہ چیز ہے جس کی تم خواہش کرو۔ مگر انسان نہیں ہیں۔

کوئی دوسرا شاعر کہتا ہے :۔

أَذُمُّ بَغْدَادَ وَالْمُقَامَ بِهَا — مِنْ بَعْدِ مَا خِبْرَةٍ وَ تَجْرِيبِ

مَا عِنْدَ سُكَّانِهَا لِمُخْتَبِطٍ — خَيْرٌ وَلَا فَرْجَةٌ لِمَكْرُوبِ

يَحْتَاجُ بَاغِي الْمُقَامِ بَيْنَهُمُ — إِلَى ثَلَاثٍ مِنْ بَعْدِ تَثْرِيبِ

كُنُوزُ قَارُونَ أَنْ تَكُونَ لَهُ — وَ عُمْرُ نُوحٍ وَ صَبْرُ أَيُّوبِ

میں علم و تجربہ کے بعد بغداد اور وہاں قیام کرنے کی مذمت کرتا ہوں۔ کسی مصیبت زدہ فریادی کے لئے بغداد کے رہنے والوں کے پاس کوئی بھلائی نہیں اور نہ کسی ستم رسیدہ کے لئے فراخی ہے جو وہاں رہنا چاہے اسے ہزار ملامتوں کے بعد بھی تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس کے پاس قارون کے خزانے ہونے چاہئیں، عمر نوح ہونی چاہئے اور صبر ایوب ہونا چاہئے۔

تقویٰ اور اصلاح و فلاح والے لوگوں اور زاہدوں نے بھی بغداد کو ناپسند کیا ہے ۔۔۔۔ ان کی ناپسندیدگی کی وجہ فسق و فجور اور ظلم و تعدی ہے جو انہوں نے بغداد میں دیکھا ۔۔۔۔ بعض نیک لوگوں کے سامنے جب بغداد کا ذکر

کیا جاتا تو وہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

قُلْ لِمَنْ أَظْهَرَ التَّنَسُّكَ فِي النَّا — سِ وَ أَمْسَى يُعَدُّ فِي الزُّهَّادِ

اِلْزَمِ الثَّغْرَ وَ التَّوَاضُعَ فِيهِ — لَيْسَ بَغْدَادُ مَنْزِلُ الْعُبَّادِ

إِنَّ بَغْدَادَ لِلْمُلُوكِ مَحِلٌّ — وَمُنَاخٌ لِلْقَارِئِ الصَّيَّادِ

لوگوں میں جو زہد و عبادت ظاہر کرے اور زاہدوں میں شمار ہونے لگے اس سے کہہ دو کہ کسی دُور دراز مقام پر تواضع کے ساتھ رہے۔ بغداد عبادت گزار لوگوں کی جگہ نہیں ہے۔ بغداد بادشاہوں کی جگہ ہے اور مال جمع کرنے والے شکاریوں کا ٹھکانا ہے[۱]۔

بشر بن الحارث کہتے ہیں کہ "بغداد تقویٰ شعار لوگوں پر تنگ ہے کسی مومن کے لئے مناسب نہیں کہ وہاں قیام کرے[۲]"

عراق میں اموال کی کثرت اور اقطارِ عالم سے لائے جانے اور خراجوں اور ٹیکسوں کی فراوانی، گرانی اور نرخوں کی بلندی کا ایک سبب تھا۔ چیزیں اس قدر گراں تھیں کہ مال دار لوگ اسے برداشت کر لیتے تھے مگر تنگ دست لوگوں کے لئے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ ابو العتاہیہ نے اس کی شکایت اور دقیق مصوری کی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

مَنْ مُبْلِغٌ عَنِّي الْإِمَا — مَ نَصَائِحًا مُتَوَالِيَهْ

إِنِّي أَرَى الْأَسْعَارَ أَسْـ — عَارَ الرَّعِيَّةِ غَالِيَهْ

وَ أَرَى الْمَكَاسِبَ نَزْرَةً — وَأَرَى الضَّرُورَةَ فَاشِيَهْ

وَأَرَى غُمُومَ الدَّهْرِ رَا — ئِحَةً تَمُرُّ وَ غَادِيَهْ

وَ أَرَى الْيَتَامَى وَالْأَرَا — مِلَ فِي الْبُيُوتِ الْخَالِيَهْ

مِنْ بَيْنِ رَاجٍ لَمْ يَزَلْ — يَسْمُو إِلَيْكَ وَ رَاجِيَهْ

---

[۱] معجم یاقوت عنوان بغداد۔ [۲] تاریخ بغداد صفحہ ۵ جلد ا خطیب بغدادی نے کچھ اور اسباب بھی علماء کی ناپسندیدگی کے بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بغداد کی زمین مغصوبہ ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو وہاں رہائش اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ اس کی مذمت میں بعض حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

يَشكُونَ مَجهَدَةً بِأصُـ   واتٍ ضِعَافٍ عَالِيَہُ
يَرجُونَ رِفدَكَ كَي يَرَوا   مِمَّا لَقُوهُ العَافِيَہُ
مَن يُرتَجىٰ لِلنَّاسِ غَيـ   رُكَ لِلعُيُونِ البَاكِيَہُ
مِن مُصبِيَاتٍ جُوَّعٍ   تُمسِي وَتُصبِحُ طَاوِيَہُ
مَن يُرتَجىٰ لِدِفَاعِ كَر   بِ مُلِمَّةٍ هِيَ مَا هِيَہُ
مَن لِلبُطُونِ الجَائِعَا   تِ وَلِلجُسُومِ العَارِيَہُ
يَا ابنَ الخَلَائِفِ لَا فَقَد   تَ وَلَا عَدِمتَ العَافِيَہُ
إِنَّ الأُصُولَ الطَّيِّبَا   تِ لَهَا فُرُوعٌ زَاكِيَہُ
أَلقَيتُ أَخبَارًا إِلَيـ   كَ مِنَ الرَّعِيَّةِ شَافِيَہُ

کون ہے جو امام کو میری طرف سے نصیحتیں پہنچا دے؟ میں چیزوں کے نرخ رعیت کے لحاظ سے بہت گراں دیکھتا ہوں۔ ذرائع آمدنی بہت کم ہیں اور ضرورتیں عام ہیں۔ میں صبح و شام زمانہ کے غموں کو آتا جاتا دیکھ رہا ہوں۔ میں یتیموں اور بیوہ عورتوں کو خالی گھروں میں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ تو آس لگائے بیٹھے ہیں اور جن کی نگاہیں متوقع ہو کر اٹھتی رہتی ہیں۔ اور کچھ کمزور اور بلند آوازوں سے مصیبت کی شکایت کر رہے ہیں۔ انہیں آپ کی مدد کی توقع ہے تاکہ وہ جس مصیبت کو دیکھ رہے ہیں اس سے انہیں عافیت نصیب ہو سکے۔ رونے والی آنکھوں کے لئے آپ کے سوا اور کسی سے آس لگائی جا سکتی ہے۔ مصیبت زدہ بھوک کی ماری ہوئی جن کی صبح شام بھوک میں خالی پیٹ گزرتی ہے۔ آئی ہوئی مدافعت کی کس سے امید کی جائے۔ مصیبت کتنی بڑی ہے؟ ان بھوکے پیٹوں اور ننگے جسموں کا کون ہے؟ اے خلیفوں کے بیٹے تو ہمیشہ ہمیشہ عافیت کے ساتھ رہے۔ یقیناً پاکیزہ جڑوں کی شاخیں بھی پاکیزہ ہی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے رعیت کے حالات تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں[1]

اس زمانہ میں مال و دولت کی یہ حالت تھی کہ پلک جھپکنے میں حاصل ہوتا اور پلک جھپکنے میں نکل جاتا تھا۔ خلفاء

---

[1] دیوان ابو العتاہیہ صفحہ ۳۰۴

امراء گورنروں اور حکام کے عطایا کی ان دنوں کوئی حد نہیں تھی ۔ ساتھ ہی اموال کی ضبطی کی بھی کوئی حد مقرر نہیں تھی ۔ کسی کو ایک مغنی ... کا کوئی گانا یا شاعر کا کوئی شعر یا ادیب کا کوئی شہ پارہ یا کسی کا کوئی جواب پسند آ گیا اور اس نے خوش ہو کر ہزاروں کی بخشش کر دی ۔ کبھی کوئی ایسی بات ناپسند ہو گئی اور اس کا خون بہا دیا ۔ اور تمام اموال ضبط کر لئے

عتابی نے اپنے زمانہ کی اسی حالت کو بیان کیا ہے ۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم اپنے لٹریری ذوق اور قابلیت کے ذریعہ سے سلطان کا تقرب کیوں حاصل نہیں کرتے ؟ عتابی نے کہا کہ اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بے بات دس ہزار بخش دیتا ہے اور بے بات شہر پناہ کی دیوار سے نیچے پھنکوا دیتا ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے نتیجتہً میں کون سا آدمی بنوں گا[1] ۔ مفضل ضبی کو مہدی کا آدمی بلانے آتا ہے تو وہ ڈر جاتا ہے اور اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی نے اس کی چغلی کھا دی ہے ۔ غسل کر کے نئے کپڑے پہن کر یعنی مرنے کے لئے تیار ہو کر جاتا ہے ۔ جب سامنے پہنچتا ہے تو سلام کرتا ہے ۔ مہدی سلام کا جواب دیتا ہے تو کہیں اس کے اوسان بجا ہوتے ہیں ۔ مہدی اس سے پوچھتا ہے کہ فخر کے سلسلہ میں عربوں کا سب سے بہتر شعر کون سا ہے ؟ اس کے بعد وہ اس سے کچھ اور سوالات کرتا ہے اور چونکہ مفضل ضبی کے جوابات بہت ٹھکانے کے تھے اس لئے مہدی نے خوش ہو کر اس سے اس کا حال دریافت کیا مفضل نے اپنے قرض وغیرہ کی شکایت کی تو مہدی نے اسے تیس ہزار درہم عطا فرما دیئے[2] ۔ جاحظ نے اپنی کتاب " الحیوان " میں نقل کیا ہے کہ ابو ایوب موریانی منصور وزیر اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا احکام اور فیصلے صادر کر رہا تھا کہ یکایک ابو جعفر منصور کا ایلچی آ گیا ۔ ابو ایوب کا رنگ فق ہو گیا اور ہاتھ کے طوطے اڑ گئے ۔ اس پر اس کا اتنا خوف طاری ہوا کہ جس ہیئت سے بیٹھا تھا وہ ہیئت ہی نہ رہی ۔ دل دھک دھک کرنے لگا ۔ مگر منصور کے پاس سے واپس آیا تو چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا ۔ ہمیں اس کی حالت کو دیکھ کر بڑا ہی تعجب ہوا اور ہم نے اس سے کہا کہ آپ تو خلیفہ کے مخصوص ترین لوگوں میں سے ہیں ۔ مقربین بارگاہ میں سے ہیں ۔ آپ پر اس قدر خوف اور لرزہ کیوں طاری ہوا ؟ ابو ایوب نے کہا کہ میں آپ کو عام لوگوں کی ایک ضرب المثل سناتا ہوں ۔ کہتے ہیں کہ باز نے ایک روز مرغ سے کہا کہ روئے زمین پر تجھ سے زیادہ بے وفا بھی کوئی نہ ہوگا ۔ مرغ نے پوچھا کہ وہ کیسے ؟ باز نے جواب دیا کہ تیرا مالک ایک انڈا لیتا ہے

---

[1] المستطرف صفحہ ۱۱۴ جلد ۱ [2] یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ اغانی صفحہ ۱۰۶ جلد ۱۸ اور ما بعد پر موجود ہے ۔

اس کے سیکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ پھر انڈے سے نکل کر تو اس کے ہاتھوں میں دانے چگتا ہے حتیٰ کہ جب تو بڑا ہو جاتا ہے تو جہاں کوئی تیرے قریب آیا اور تو اِدھر اُدھر اُڑا۔ اور پھر ہر وقت چیختا چلاتا رہتا ہے۔ مجھے یہ لوگ پہاڑ کی چوٹیوں سے پکڑ کر لاتے ہیں۔ مجھے سدھاتے اور اپنے سے مانوس کرتے ہیں۔ پھر وہ مجھے چھوڑ دیتے ہیں اور میں ہوا میں اُڑ کر اپنا شکار پکڑتا ہوں تو اسے لے کر سیدھا مالک کے پاس آتا ہوں۔ مرغ نے اسے جواب دیا۔ کہ اگر تو نے بازوں کا بھی وہ منظر دیکھا ہوتا جو میں نے مرغوں کو سیخ پہ لگا کر آگ پر سنکتے ہوئے دیکھا ہے تو بچا! تم مجھ سے زیادہ مالک سے بھاگتے۔ تو برادران! اگر آپ کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو مجھے معلوم ہیں تو اس ظاہری شان و شوکت کے ساتھ میرے اس خوف پہ آپ کو بھی تعجب نہ ہوتا[1]۔

مامون رشید نے جب فضل بن سہل کو قتل کر دیا تو احمد بن ابی خالد کو وزارت کی پیش کش کی گئی۔ مگر انہوں نے معذرت کر دی اور فرمایا۔ میں نے کسی کو وزیر بنتے نہیں دیکھا جس کا حال سلامت رہا ہو[2]۔

لوگ مامون رشید کو اطلاعات پہنچاتے تھے جو بعض اوقات قابل اعتماد بھی نہیں ہوتی تھیں مگر یہ خبریں پہنچانے والے کہتے تھے کہ اگر ہم قابل اعتماد خبریں ہی آپ تک پہنچائیں تو سال بھر میں دو چار خبریں ہی آپ تک پہنچا سکیں گے[3]۔

محمد بن حارث بن بُسْنُخَّرْ کو واثق خلیفہ نے کسی ایسے دن بلوایا جس میں وہ عام طور سے اُسے بلایا نہیں کرتا تھا۔ محمد بن حارث کو بڑی گھبراہٹ ہوئی اور اندیشہ ہوا کہ کسی نے ہو نہ ہو کوئی شکایت کر دی ہے۔ یا خلیفہ کی رائے میرے متعلق اچھی نہیں رہی کوئی نئی مصیبت آگئی ہے۔ وہ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ واثق نے انہیں دولت مند بنا دیا۔ اور ان کے لئے دس ہزار درہم اور کئی تخت لباس وغیرہ مرحمت فرما دیئے[4]۔

فضیل بن عمران کی ابوجعفر منصور سے کوئی شکایت کی گئی۔ منصور نے فضیل بن عمران کو اپنے بیٹے جعفر کا میر منشی اور اس کے معاملات کا منتظم مقرر کر رکھا تھا۔ منصور سے شکایت کی گئی کہ فضیل جعفر کے ساتھ بیہودگی کرتا ہے۔ منصور نے فوراً دو آدمی بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ انہیں فضیل جہاں کہیں ملے اس کی گردن اُڑا دیں۔ ساتھ ہی جعفر کو بھی ایک خط لکھا جس میں اسے اپنے اس فیصلہ کی اطلاع دی

---

[1] الحیوان صفحہ ۱۴۲ جلد ۲ [2] طیفور صفحہ ۲۱۵ [3] طیفور صفحہ ۶۸ [4] اغانی صفحہ ۱۰۴ جلد ۳

گئی تھی مگر ان دونوں آدمیوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب تک فضیل کا کام تمام نہ کر دو اس وقت تک جعفر کو یہ خط نہ دینا۔ چنانچہ ان دونوں آدمیوں نے جاکر فضیل کی گردن اڑا دی۔ فضیل نہایت پاکدامن اور دین دار آدمی تھا۔ چنانچہ لوگوں نے منصور سے کہا کہ فضیل اس تہمت سے قطعاً بری ہے جو اس پر لگائی گئی ہے اور آپ نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ منصور نے فوراً دوسرا آدمی دوڑایا اور کہا کہ اگر تو فضیل کے قتل ہونے سے پہلے پہنچ گیا تو میں تجھے دس ہزار درہم انعام دوں گا۔ اسے فوراً جاکر قتل ہونے سے بچا لے۔ یہ آدمی پہنچا تو فضیل کا خون ابھی خشک نہیں ہوا تھا۔ جعفر کو اس بات کی بڑی ناگواری ہوئی اور اس نے اپنے غلام سوید سے کہا کہ "امیر المومنین ایک ایسے آدمی کے قتل کا کیا جواب دیں گے جو پاک دامن، دیندار مسلمان، بے خطا اور پاک صاف تھا!" سوید نے جواب میں کہا "وہ امیر المومنین ہیں جو چاہیں کریں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اسے وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں"۔

دولت مندی اور تنگ دستی کے افراط سے اصلاح کی تحریک ابھری اور زہد کی طرف میلان بڑھا

اس زندگی نے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ کچھ لوگ نہایت مرفہ الحال تھے اور کچھ نہایت تنگ دست۔ کچھ لوگ لہو ولعب میں گرفتار تھے اور کچھ لوگ حقیقت پسندانہ مسلک حیات کے پابند، اس زمانہ کی تاریخ میں دو نمایاں تحریکات پیدا کیں۔

(اوّل) ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جو بغداد کے فساق و فجار پر نکیر کرنے کو ثواب کا کام سمجھتا تھا۔ طبری نے ان کے ظہور کا سبب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ حربیہ اور شطار[1] کے غنڈوں نے جو بغداد اور کرخ دونوں جگہ موجود تھے لوگوں کو بری طرح ستا رکھا تھا۔ علانیہ فسق و فجور کرتے۔ ڈاکے ڈالتے۔ لڑکوں اور عورتوں کو سڑکوں پر سے اٹھا کر لے جاتے۔ نہ کوئی انہیں منع کر سکتا تھا اور نہ ہی سزا دے سکتا تھا۔ کیونکہ خود بادشاہ کو ان کی حمایت کی ضرورت تھی اور وہی اس کے مقربین بارگاہ تھے۔ لہٰذا کسی کی مجال نہیں تھی کہ جس فسق و فجور کے وہ مرتکب ہوتے تھے اس پر کوئی ان سے بازپرس کر سکے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے زمین میں فساد پھیلا رکھا ہے۔ ظلم اور تعدی حد سے بڑھتی جا رہی ہے اور رہزنی

[1] بغداد کے دو محلے ہیں حربیہ بغداد کی مغربی جانب کے ایک محلہ کا نام تھا جو حرب بن عبداللہ منصور کی پولیس کے افسر اعلیٰ کے نام کی طرف منسوب تھا۔

عام ہوگئی ہے اور بادشاہ بھی ان کو کوئی تنبیہہ نہیں کرتا تو ہر محلہ اور ہر علاقہ کے نیک لوگ اُٹھے اور آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے لئے چلے الخ

اس تحریک کے دو لیڈر تھے۔ اور ہر لیڈر کا ایک منشور تھا۔ ایک تو خالد درویش تھے ان کا منشور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا تھا لیکن سلطان کے خلاف شورش پھیلانا نہیں تھا حکومت وقت کی اطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے اصلاح کی کوشش کرنا ان کا مطمع نظر تھا۔ دوسرے لیڈر سہل بن سلامہ انصاری تھے۔ ان کا منشور بھی اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرانا اور جو اس کی مخالفت کرے اس سے جنگ کرنا تھا مخالفت کرنے والا کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ سلطان ہو یا کوئی اور ہو۔ طبری کا بیان ہے کہ ایک بڑی مخلوق ان کے پیچھے لگ گئی۔ جو شخص سہل کی اس تحریک کو قبول کر لیتا وہ اپنے مکان پر ایک پختہ برج بناتا اور اس پر قرآن کریم کے نسخے اور ہتھیار آویزاں کر دیتا ۔۔۔ یہ سنہ ۲۰۱ھ اور سنہ ۲۰۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہ تحریک اپنے دونوں لیڈروں کی گرفتاری اور قید کے بعد ختم ہو گئی۔[1]

ظاہر یہی ہے کہ اس تحریک کا سبب ابن خلدون کے بیان کے مطابق اہل دین اور صالح لوگوں کا فساق و فجار کو روکنے اور ان کے ظلم و تعدی کو ختم کرنے پر جمع ہو جانا تھا۔ یہ تحریک برابر جاری رہی کبھی بڑھ جاتی کبھی سرد پڑ جاتی۔ ان کے بعد فرقۂ حنابلہ کا ظہور ہوا جن کی دعوت بھی اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہی تھا۔ ان کی تفصیلات بیان کی جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

زہد اور اس کے اسباب

(دوم) دوسری تحریک، زہد کی تحریک تھی ۔۔۔ بات یہ ہوئی کہ کچھ لوگ جب مال داری اور تونگری حاصل کرنے سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے دیکھا کہ طبعی طور پر وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ صاحب اقتدار طبقہ کا قرب حاصل کر سکیں، یا انہوں نے اس کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہے تو قناعت کے دامن میں ان لوگوں نے پناہ ڈھونڈی اور اپنی طبیعتوں کو اس کا عادی بنانا چاہا اور کہنا شروع کیا کہ جو کچھ تم چاہتے ہو جب وہ نہ ہو سکا تو جو کچھ ہوتا ہے تم اسی کو چاہنے لگو۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں بے انتہا، خواہشات، و شہوات کو دیکھنے سے گھن سی آنے لگی۔ انہوں نے

---

[1] اس تحریک کی تفصیلات طبری صفحہ ۲۴۱ ۔ ۲۴۰۲ جلد ۱۰، اور مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۴۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

دیکھا کہ نفس انسانی کی جب کوئی خواہش اور تمنا پوری ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے دوسری بے شمار خواہشات وشہوات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہر خواہش کو پورا کرنے میں نہ جانے کتنی کتنی مشقتیں اور مصیبتیں پیش آتی تھیں لہذا انہوں نے اس کو بہتر سمجھا کہ ان خواہشات کا قلع قمع کر دیں اور انہوں نے بھی وہی کچھ کہنا شروع کر دیا جو کسی نے کہا تھا ؂

وَمَا النَّفْسُ اِلَّا حَیْثُ یَجْعَلُھَا الْفَتٰی — فَاِنْ اُھْمِلَتْ تَاقَتْ وَ اِلَّا اسْتَقَرَّتِ

نفسِ انسانی اس کے سوا کیا ہے کہ آدمی جہاں جی چاہے اسے رکھ دے۔ اگر اسے کھلا چھوڑ دے تو خواہشات میں گرفتار ہو جاتا ہے ورنہ ایک مقام پہ جاگزیں ہو جاتا ہے۔

یا جو کسی دوسرے شاعر نے کہا تھا۔

وَالنَّفْسُ رَاغِبَۃٌ اِذَا رَغَّبْتَھَا — وَ اِذَا تُرَدُّ اِلٰی قَلِیْلٍ تَقْنَعُ

نفس کو اگر رغبت دلاؤ تو وہ رغبت کرنے لگتا ہے لیکن جب اسے تھوڑے کی طرف لوٹا دو تو وہ قناعت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

کچھ لوگ محبت میں نامراد و مایوس ہو کر یا جاہ و منصب اور مال و دولت کے سلسلہ میں کسی جانکاہ حادثہ کا شکار ہو کر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتے تھے کہ زہد کے دامن میں پناہ لیں اور اس سے اپنے آپ کو مانوس کر کے جس چیز سے وہ محروم ہو گئے تھے اس سے زہد کے ذریعہ سے تسلی حاصل کریں۔

بہت سے لوگ دین داری کی وجہ سے بھی زاہد بن گئے تھے کیونکہ زہد میں کرنا کچھ نہیں پڑتا اور حساب آسان ہے۔ وہ محمد بن واسع کی طرح کہنے لگتے ہیں کہ "مجھے تو یہ پسند ہے کہ آدمی صبح کرے تو صبح کا کھانا اس کے پاس نہ ہو اور شام کرے تو شام کا کھانا اس کے پاس نہ ہو اور اس کے باوجود وہ اپنے خدا سے راضی ہو"۔ انہوں نے اپنے نفسوں کو خواہشات وشہوات سے موڑ لیا۔ موت اور قبروں کو زیادہ تر یاد رکھتے اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرتے۔ انہوں نے فانی پہ باقی کو ترجیح دی اور کسی خلیفہ یا والی سے عطیات لینے کے لئے ہاتھ پھیلانے چھوڑ دیئے۔ اور تھوڑے پر راضی ہو گئے۔ ان کا عمل ویسا ہی رہا جیسا کہ ابراہیم بن اسحٰق حربی کا تھا کہ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس طرح گنا را کہ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں اور نمک پر بس کی اور بعض مرتبہ نمک بھی نہیں ہوتا تھا مگر انہوں نے معتضد سے وہ ایک ہزار دینار قبول نہیں کئے جو اس نے ان کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ایک مرتبہ سارے رمضان کے مہینہ میں ان کا خرچہ ایک درہم اور ساڑھے چار

واثق رہا تھا۔[1]

یہ ساری انواع و اصناف اس عہد میں موجود تھیں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں جس طرح بشار بن برد، ابو نواس اور ان جیسے لوگ لہو و لعب کے رجحان کی نمایندگی کرتے اور اس کی آگ کو بھڑکاتے تھے اسی طرح ابوالعتاہیہ وغیرہ زہد کے رجحان کی نمایندگی کرتے اور زاہدوں کی آرزوئیں بیان کرتے تھے۔ ابو نواس نے لہو و لعب کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا ؎

جَرَیْتُ مَعَ الْهَوَىٰ طَلْقَ الْجَمُوحِ　　وَهَانَ عَلَيَّ مَأْثُورُ الْقَبِيحِ

وَجَدْتُ أَلَذَّ عَارِيَةِ اللَّيَالِي　　قِرَانَ النَّغْمِ بِالْوَتَرِ الْفَصِيحِ

وَمُسْمِعَةٍ مَتَىٰ مَا شِئْتَ غَنَّتْ　　مَتَىٰ كَانَ الْخِيَامُ بِذِي طُلُوحِ

تَمَتَّعْ مِنْ شَبَابٍ لَيْسَ يَبْقَىٰ　　وَصِلْ بِعُرَى الْغَبُوقِ عُرَى الصَّبُوحِ

میں نے عشق کے ساتھ منہ زور کھلے گھوڑے کی طرح بھاگ لیا اور مسلمہ بُری باتیں میرے لئے آسان ہوگئیں، راتوں کی عاریت پر دی ہوئی لذیذ ترین چیز مجھے تو عمدہ ستار پہ نغمات کی ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے۔ بعض گانا سنانے والیاں ایسی ہیں کہ جب خیمے ذی طلوح کے مقام پہ ایستادہ ہوں تو وہ وہی کچھ گاتی ہیں جو تو چاہے۔ جوانی سے فائدہ حاصل کر کیونکہ یہ رہنے والی چیز نہیں ہے اور شام کے پیمانوں کو صبح کے پیمانوں کے ساتھ ملا دے۔

تو اس کے مقابلہ میں ابوالعتاہیہ نے کہا :۔

رَغِيفُ خُبْزٍ يَابِسٍ　　تَأْكُلُهُ فِي زَاوِيَةْ

وَكُوزُ مَاءٍ بَارِدٍ　　تَشْرَبُهُ مِنْ صَافِيَةْ

وَغُرْفَةٌ ضَيِّقَةٌ　　نَفْسُكَ فِيهَا خَالِيَةْ

أَوْ مَسْجِدٌ بِمَعْزِلٍ　　عَنِ الْوَرَىٰ فِي نَاحِيَةْ

تَدْرُسُ فِيهِ دَفْتَرًا　　مُسْتَنِدًا بِسَارِيَةْ

---

[1] یاقوت کی معجم الادباء جلد اوّل میں ان کے حالات دیکھئے۔

مُعْتَبِرًا بِمَنْ مَضٰی	مِنَ الْقُرُوْنِ الْخَالِیَہْ
خَیْرٌ مِنَ السَّاعَاتِ فِیْ	فَیْءِ الْقُصُوْرِ الْعَالِیَہْ
تُعْقِبُھَا عُقُوْبَۃً	تَصْلٰی بِنَارٍ حَامِیَہْ
فَھٰذِہٖ وَصِیَّتِیْ	مُخْبِرَۃٌ بِحَالِیَہْ
طُوْبٰی لِمَنْ یَسْمَعُھَا	تِلْکَ لَعَمْرِیْ کَافِیَہْ
فَاسْمَعْ لِنُصْحِ مُشْفِقٍ	یُدْعٰی اَبَا الْعَتَاھِیَہْ

روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا جسے تو ایک کونے میں بیٹھ کر کھالے۔ صاف اور ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ جسے تو پی لے۔ ایک تنگ کمرہ جس میں تو تنہا رہے۔ یا دنیا والوں سے الگ ایک کونہ میں کوئی مسجد جس کے ستون سے ٹیک لگا کر تو کوئی کتاب پڑھ رہا ہو۔ تاکہ قرون ماضیہ کے گذرے ہوئے لوگوں سے عبرت حاصل کرے۔ چند گھنٹے اونچے اونچے محلات کے سایہ میں گذارنے سے بہتر ہے۔ وہ ایسا نتیجہ چھوڑ جاتے ہیں کہ تجھے دہکتی ہوئی آگ میں بھننا پڑے گا۔ یہ ہے میری وصیت جس میں میں نے اپنا حال تجھے بتا دیا ہے۔ خوش خبری ہے اس کے لئے جو اس وصیت کو سن لے۔ میری جان کی قسم یہ وصیت اس کے لئے کافی ہے۔ ایک مشفق آدمی کی نصیحت کو سن۔ وہ مشفق جسے لوگ ابو العتاہیہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

لوگ جھگڑتے تھے کہ ان دونوں میں سے بڑا شاعر کون ہے۔ ابونواس یا ابوالعتاہیہ؟ لیکن وہ درحقیقت فنی نقطۂ نگاہ سے غور کرکے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ دونوں شاعر ایک خاص رجحان کی نمایندگی کرتے تھے اور ہر فریق اسے ترجیح دیتا تھا جو اس کے دل کی بات کہتا اور اس کے رجحان کی نمایندگی کرتا تھا۔

علم، ادب اور فن پر ان حالات کے اثرات

اس اجتماعی حالت کے جس کا ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اپنے علمی، فنی اور ادبی نتائج تھے ایک نتیجہ یہ تھا کہ چونکہ اموال کا بڑا حصہ خلفاء امراء اور ان کے متعلقین کے ہاتھ میں تھا اور وہ بیش قرار عطایا دیتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں دولت کی بہت تھوڑی مقدار تھی۔ ان باتوں نے مل کر تمام فنون جمیلہ کو ـــــ شعر بھی ان ہی میں سے ایک ہے ـــــ

اس حالت تک پہنچا دیا تھا کہ وہ خلفاء و امراء کے زیر سایہ ہی پروان چڑھتے تھے۔ ان کی فضا سے الگ وہ مرجھا جاتے تھے ان حالات میں یہ امر قطعاً معقول ہوتا کہ اس سے آدمی کے شعور کو انگیخت ملتی۔ اس کے رجحانات میں ہیجان برپا ہوتا۔ اس کے دل میں جوش پیدا ہوتا۔ وہ شعر کہتا اور اپنے شعور کو تسکین دیتا اپنے جوش کو ہلکا کرتا۔ شعر گوئی سے اس کا مقصد اپنے فنی رجحان کی سیرابی سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتا اور یہ اسی کو وہ اپنا سب سے بڑا اجر اور معاوضہ سمجھتا۔ یہ بات بھی قطعاً[1] معقول ہوتی کہ ایک فن کار فقر و فاقہ میں بھی اور تونگری اور دولت مندی میں بھی۔ فراخی میں بھی اور تنگی میں بھی محض اپنی فنی بھوک کی سیری کے لئے عمدہ سے عمدہ فنی مظاہرہ کرتا۔ لیکن بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ یہ فنی بلندی ان میں بہت کم تھی۔ ان میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو یہ دیکھتے تھے کہ فن کی ذرا سی چیز اور شعر کے چند ابیات جب ان میں ممدوح کے ذوق کا لحاظ رکھا جاتا تھا — فن کے ذوق کا نہیں — بے شمار دولت کی بارش کا سبب بن جاتے تھے جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اگر وہ خود اپنے رجحان یا فن کی پیروی کرتے تھے تو فقر و فاقہ میں مبتلا رہتے تھے۔ لہٰذا سب کے سب خلفاء و امراء کی خواہشات کی پیروی میں دوڑ پڑے اور سوائے چند قلیل اور نادر فن کاروں کے سب کے سب محلات شاہی کی طرف جانے والے سیلاب میں بہہ گئے۔ ان کے دروازوں پر دنوں اور مہینوں کھڑے رہتے تب کہیں اذن باریابی ملتا۔ شعراء اور فن کار بھی سامانِ زینت میں سے شمار ہونے لگے تھے۔ خوش نما فقروں اور جملوں سے مکانات اور محلات کی آرائش کی جاتی تھی وہ اس میں ایک حد تک معذور بھی تھے۔ ان میں سے کتنے تھے جو آئے دن دیکھتے تھے کہ جو لوگ شعر اور فن میں ان سے بہت ہی فروتر تھے۔ وہ ایک امیر کی مدح میں دو تین شعر کہہ کر ہزارہا درہم لے جاتے تھے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اپنے مسلک کی پابندی چھوڑ کر وہی راستہ اختیار کرنے لگے تھے جس پر چل کر انہیں بھی مال و دولت مل سکے بعینہ یہی حال گانے کا بھی تھا۔ اصفہانی کا بیان ہے کہ جتنا کچھ ابراہیم موصلی نے ہارون رشید سے لیا ہے اس کا مجموعہ دو لاکھ دینار سے بہت زیادہ تھا[2]۔ اغانی کا آپ کوئی صفحہ نہیں اُلٹیں گے جس میں آپ کو کسی شاعر کا حال نہ مل جائے کہ اس نے کسی کی مدح میں شعر کہے اور ہزاروں روپے اسے مل گئے۔ ان قصوں میں کتنا ہی مبالغہ سے کام کیوں نہ لیا گیا ہو مگر بہرحال بنیاد

---

[2] اغانی صفحہ ۲۰ جلد ۹

تو صحیح ہی ہے۔

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شعر و شاعری کا سب سے بڑا میدان محض، مدح و ستائش قرار پاگیا — اور ہماری نظر میں — یہ باب صحیح قسم کے اشعار سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ شعراء نے یکے بعد دیگرے مدح و ستائش کے مناسب اور نامناسب ہر قسم کے مضامین ڈھالنے شروع کر دیئے حتیٰ کہ اس کا آخری قطرہ تک چوس لیا ہگر وہ دوسرے ابواب یعنی مثلاً بلند رجحانات کا بیان۔ طبعی، خوب صورتی اور فطرت کی جمال آفرینیوں سے متعلق نفس انسانی کے شعور کی تحلیل وغیرہ تو اول تو کسی نے انہیں چھیڑا ہی نہیں اور اگر چھیڑا بھی تو بہت ہی سرسری انداز سے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ادب اور فن کا مؤرخ جب اس عہد کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ صرف عراق ہی کی تاریخ لکھتا ہے، مصر، شام، حجاز کا ادب چونکہ ہلکا تھا اور وہاں کا فن ناقابل ذکر تھا لہذا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ایک عمدہ شاعر اور فن کار کو اپنے سامان کا خریدار عراق کے سوا کہیں ملتا ہی نہیں تھا اس لئے سب ادھر ہی کھنچ کر چلے آتے تھے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس زمانہ کا ادب بہترین طور پر ان دونوں نمایاں رجحانات کی مصوری کر دیتا ہے۔ لہو ولعب کے رجحان کی اور زہد و ورع کے رجحان کی — جہاں تک لہو و لعب کے رجحان کا تعلق ہے تو اس میں وہ چیزیں داخل ہیں جو شراب نسیب اور غزل وغیرہ کے سلسلہ میں کہی گئیں۔ یہ چیزیں آپ کو ابو نواس، مسلم بن الولید جیسے شعراء کے دواوین میں اور کتاب الاغانی میں مل سکتی ہیں۔ رہ گیا زہد و ورع کا رجحان تو اس میں وہ چیزیں داخل ہیں جو موت، نعت۔ حساب و کتاب کے سلسلہ میں یا زاہدوں کی زندگی اور ان کے منقول اقوال و افعال کے بیان میں کہی گئی ہیں۔ لمبی لمبی فصلیں، ان کی نفسیات کی تشریح اور ان کی حکمت آموز باتوں کے بیان میں لکھی گئی ہیں۔ آپ جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" کی تیسری جلد دیکھیے۔ اس میں وہ ایک باب "کتاب الزہد" کے نام سے لکھتے ہیں جس کی ابتدا وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"ہم اللہ کے نام اور اس کی مدد سے زاہد و متائق لوگوں کی باتیں بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کے اخلاق و مواعظ کو بھی بیان کرتے ہیں"۔ یہ اقوال اور قصے لوگوں کے اس فریق کے لئے غذا کا سامان مہیا کرتے ہیں جو زندگی میں زاہدانہ طرز پر عمل رہے تھے۔ اس کے بعد ادب اور لٹریچر سے منتخب مصنفین بالکل جاحظ ہی کے انداز پر چل نکلتے ہیں اور زہد کے باب کو ارکان ادب میں سے ایک رکن کی حیثیت سے پیش کرتے آئے

چنانچہ ابن قتیبہ بھی اپنی کتاب "عیون الاخبار" میں زہد کے لیئے ایک خاص باب لکھتے ہیں۔ اور ابن عبدربہ بھی اپنی کتاب "العقد الفرید" میں اسی انداز کے ساتھ ایک خاص باب زہد سے متعلق لکھتے ہیں۔ یہی حال دوسری تصانیف کا بھی ہے۔ آپ ان فصلوں کو پڑھئے آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک ایسی زندگی کی مصوری کرتی ہیں جو لہو و لعب کی زندگی کے قطعاً برعکس ہے۔

رہ گیا علم۔ تو وہاں علم کے دو شعبے ہوتے تھے۔ ایک علم دینی اور دوسرے علم دنیوی ۔۔ بشرطیکہ یہ تعبیر صحیح ہو ۔۔ جہاں تک دنیوی علوم کا تعلق تھا ان میں فلسفہ، طب، ریاضت اور فلکیات کے متعلق علوم شامل تھے۔ یہ علوم بھی خلفاء، امراء اور رجال حوالے طبقہ کی گود ہی میں پروان چڑھے۔ اس عہد میں بہت کم آپ کو کوئی ملے گا جو ان علوم میں سے کسی علم سے تعلق رکھتا ہو اور کوئی نہ کوئی امیر یا دولت مند آدمی اسے مالی مدد نہ بہم پہنچاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ۔۔ نسبتاً ۔۔ ذرا فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

رہ گیا دینی علم، تو اس کا باعث زیادہ تر اُخروی اجر اور عقیدت مندی ہوتا تھا۔ یہ علم محلات شاہی سے باہر پروان چڑھا اور پھلا پھولا۔ مثلاً علم تفسیر۔ علم حدیث وغیرہ۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کے علوم کی نشو و نما صرف عراق تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ علوم ہر علاقہ اور ہر ملک میں نظر آتے تھے جہاں کہیں بھی یہ دینی باعث موجود تھا وہاں یہ علوم بھی موجود تھے۔ چنانچہ جب آپ علوم قرآن، علوم حدیث یا علوم لغت کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو آپ کو مصر، شام اور حجاز کی تاریخ لکھنی پڑے گی جیسا کہ آپ عراق کی تاریخ لکھیں گے۔ ان علماء کے حالات اور تراجم آپ پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے زیادہ تر حضرات اکثر حالات میں فقر و فاقہ اور تنگ دستی کا شکار رہے۔ ان میں تھوڑے پہ قناعت اور بے لوثی کی صفات آپ کو زیادہ تر ملیں گی اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

جب ہم علمی تحریکات پہ بحث کریں گے تو ان علماء کا کچھ حال ہم آپ کو بتائیں گے کہ انہوں نے طلب علم میں کتنی مشقتیں اور کتنی مصیبتیں اٹھائیں۔ سخت تنگ دستی اور فقر و فاقہ کے باوجود کتنے طویل طویل سفر کیے جنہیں پڑھ کر حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہیں رہتی۔ علمی زندگی کے لئے ان حضرات کی زندگی بلند ترین نمونہ شمار کی جاتی ہے۔

فصل ششم

(زندقہ کی زندگی اور ایمان کی زندگی)

زندقہ اور ایمان میں جنگ

جیساکہ ہم نے گزشتہ فصل میں، لہو و لعب عشق و ہوس اور تنعم و تعیش کی زندگی کے پہلو بہ پہلو زہد و قناعت، حقیقت شناسی، تنگ دستی اور شقاوت کی زندگی کے نمونے دیکھے ہیں۔ اب اس فصل میں ہم زندگی کے کچھ دوسرے رنگ دیکھیں گے، یہ زندگی دل اور عقل، رجحانات اور دین کی زندگی کا رنگ ہے۔ یہاں ہم شک و ارتیاب، زندقہ اور الحاد کی کش مکش، ایمان ناس اور اعتقاد صادق کے ساتھ دیکھیں گے ان دونوں تحریکوں کی جب ہم تاریخ پڑھتے ہیں تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ ہم ایک میدان جنگ میں کھڑے ہیں جہاں جنگ کا بازار گرم ہے جس میں ہر طرح کے وسائل حرب سے کام لیا جا رہا ہے۔ کبھی دھوکے اور مکاریوں اور دوسرے پیچیدہ اور مخفی وسائل سے کام لیا جاتا ہے۔ کبھی تلواریں سونت لی جاتی ہیں اور خون بہائے جانے لگتے ہیں۔ کبھی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں اور ان میں دلائل سے ہر فریق اپنے مقابل کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ پھر جنگ کا پانسہ کبھی اس فریق کے حق میں پلٹتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں۔ آج ملحدین فتح مند ہو رہے ہیں۔ وہ شکوک و شبہات پیدا کر کے، بچوں اور نوجوانوں کو گمراہ کر کے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ اگر ظاہرا طور پر وہ کامیاب نہیں ہوتے تو دوسرے گمراہی کے پیچیدہ اور مخفی طریقوں سے کام لیتے ہیں .... دوسرے ذریعے کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ ان ملحدین کو سخت سزائیں دیتے، ان کے خلاف کارروائیاں کرتے، انہیں قتل کرتے اور انہیں پراگندہ کر دیتے ہیں، پھر وہ کتابیں تصنیف کر کر کے ان کے شبہات کو دور کرتے اور ان کے دلائل کا ابطال کرتے ہیں۔

لیکن مؤرخین نے جیساکہ سیاسی جنگوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان جنگوں کے حالات اور

واقعات بیان کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ تلاش و تحقیق کرنے والا کتابوں میں کہیں کہیں ان کے کچھ تھوڑے سے بکھرے ہوئے حالات پا لیتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو بڑی مشکل سے ــــ ان بکھرے ہوئے حالات سے ایک مکمل بات یا ایک مسلسل زنجیر بنا سکتا ہے۔

زندقہ

اس زمانہ میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی زبانوں پر زندقہ کا لفظ بار بار آتا ہے۔ اور لوگوں کو (جھوٹ یا سچ) بکثرت زندقہ کے ساتھ متہم کیا جاتا ہے۔ رائے عامہ اس کے معنی کو بڑی باریکی کے ساتھ سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ شاعر کا کوئی شعر سنتے اور جونہی ان کی توجہ کسی بات کی طرف جاتی وہ فوراً شاعر کو زندقہ کے ساتھ متہم کر دیتے۔ کسی کو کچھ کرتے دیکھا یا کوئی بات کہتے سنا۔ خواہ وہ مذاق میں کہی گئی ہو یا حقیقت میں کہی گئی ہو یا کسی کو کوئی اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور فوراً اس پر زندقہ کی تہمت لگا دی[1]۔

بنو امیہ کے عہد مملکت اور بنو عباس کے دور حکومت میں جب ہم اس لفظ کی شہرت کا موازنہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اموی عہد حکومت میں یہ لفظ بہت کم اور نادر ہی بولا جاتا تھا جبکہ عباسی دور حکومت میں اس کا استعمال بہت عام ہو کر پھیل چکا تھا۔ مثلاً بنو امیہ کے دور مملکت میں ولید بن یزید بن عبدالملک کے استاد عبدالصمد بن عبدالاعلیٰ پر زندقہ کی تہمت لگائی گئی تھی۔ اسی طرح ولید بن یزید پر بھی یہی تہمت تھی۔ مگر پھر بھی یہ چیز بہت کم اور نادر تھی۔ لیکن عباسی عہد حکومت میں زندقہ کے متعلق واقعات بے شمار ملتے ہیں اور بے شمار لوگوں پر اس کی تہمت لگائی جاتی تھی۔

اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ زندقہ اپنے بعض مفاہیم کے لحاظ سے ــ یعنی شک یا الحاد ــ عادۃً علمی بحث و تحقیق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور بحث و تحقیق عباسی دور حکومت میں زیادہ نمایاں اور واضح صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو علم اموی عہد مملکت میں عام طور سے پھیلا ہوا تھا وہ خالص دینی علم تھا۔ مثلاً حدیثیں جمع کرنا۔ قرآن کریم کی تفسیر کرنا۔ ان دونوں سے مسائل شرعیہ کا استنباط کرنا وغیر ذالک۔ یہ چیزیں انسانی نفوس میں شک و شبہ کا بیج نہیں بوتیں کہ آدمی زندقہ میں گرفتار ہو جائے۔ جو چیز ان شکوک و شبہات کو ابھارتی ہے وہ زیادہ تر اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ یعنی کلامی مذاہب، مختلف مذاہب و ادیان کے بنیادی مسائل کے گرد دینی ابحاث، اس طریق کی فلسفیانہ بحث جو مثلاً مادہ اور صورت جزء لا یتجزیٰ، جوہر اور

---

[1] فجر الاسلام میں ہم نے لفظ زندقہ کے اشتقاق کے متعلق مختلف اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ وہاں اس کو دیکھ لیں۔

غرض وغیرہ کے سلسلہ میں ارسطو اور افلاطون وغیرہ نے کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتیں اموی دورِ حکومت میں بہت کم تھیں۔ اور عباسی عہدِ حکومت میں ان کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ بعض ایرانی یہ سمجھتے تھے کہ بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل کر خلافت بنو عباس کے ہاتھ میں آجانے سے ان کا مطلب پورا نہیں ہوا۔ وہ ایک عربی ہاتھ — یعنی بنو امیہ کے ہاتھ — سے نکل کر مسلمانوں کے ایک دوسرے ہاتھ یعنی عباسیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئے ہیں۔ حالانکہ دراصل ان کا مطمح نظر تو یہ تھا کہ حکومت ایرانی ہو۔ اور اپنے ظاہر کے اعتبار سے بھی اور حقیقت کے اعتبار سے بھی۔ اپنے غلبہ و تسلط، زبان، دین غرضکہ ہر اعتبار سے ایرانی ہو۔ انہوں نے دیکھا کہ جب تک اسلام کا تسلط اور غلبہ باقی ہے ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ لہذا جہاں جہاں ممکن ہوا انہوں نے کھلم کھلا مانویت، مزدکیت اور زرتشتیت کو پھیلانے کی کوششیں شروع کیں اور جہاں ممکن نہ ہوا انہوں نے خفیہ طریقے اختیار کئے اس سے زندقہ پھیلا۔

اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ دولتِ امویہ — جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں — دولتِ عربیہ تھی۔ حکومت انہی کے ہاتھ میں تھی اور ملک بھی انہی کا تھا۔ حکام اور امراء عرب ہوتے تھے آزاد شدہ غلام ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عرب کے لوگ زیادہ تر زندقہ سے ناواقف تھے اور نہ اس کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ وہ اپنی حکومت اور اپنے دین پر مطمئن تھے۔ دولتِ عباسیہ کے قیام کے بعد آزاد شدہ غلاموں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خصوصیت کے ساتھ ایرانی غلاموں نے۔ زیادہ تر اقتدار انہی کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ انہوں نے عربوں پر غلبہ پا لیا تھا۔ جب یہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو اس سے پہلے وہ اپنے مذاہب کی پیروی کیا کرتے تھے جنہیں وہ بھول نہیں سکے تھے۔ اُموی دورِ حکومت میں انہیں اس کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی اپنی مذہبی بات پھیلا سکیں۔ ان کا پہلا مقصد سیاسی آزادی حاصل کرنا تھا نہ کہ دینی آزادی۔ چنانچہ ان کی خفیہ دینی تحریکات، اجتماعات اور تدبیرات عموماً سیاسی ہوتی تھیں نہ کہ دینی۔ زندقہ کا تعلق دین سے ہے، سیاست سے نہیں لیکن جب وہ سیاسی طور پر کامیاب ہو گئے اور انہیں اطمینان اور غلبہ حاصل ہو گیا تو ان کے سروں میں نئے اور پرانے ادیان نے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ یہیں سے زندقہ پیدا ہوا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں زندقہ کی تاریخ

ہم دیکھتے ہیں کہ زنادقہ کا نام ابوجعفر منصور کے زمانہ میں رند مشرب اور عیاش طبع لوگوں کے ساتھ وابستہ تھا

ہے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ منصور نے محمد بن ابی العباس کے ساتھ کچھ زندیقوں اور رند مشرب لوگوں کو بھیجا تھا۔ ان لوگوں میں حماد عجرد بھی شامل تھا۔ چنانچہ یہ لوگ محمد بن ابی العباس کے ساتھ بصرہ میں کچھ دن تک رہے جہاں ان سے رندی و عیاشی کا مظاہرہ ہوتا تھا منصور کا مقصد ایسا کرنے سے یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں محمد بن ابی العباس سے نفرت پیدا ہو جائے[1] اور محمد بن ابی العباس کو ناپسند کرنے لگیں اور اس طرح اس کے لئے اپنے بعد مہدی کو خلافت کے لئے نامزد کرنا آسان ہو جائے گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مہدی نے اپنی تمام تر توجہات زنادقہ کی طرف مبذول رکھیں تاکہ جہاں محمد بن ابی العباس کا ان زنادقہ سے قرب اسے خلافت سے دور کر دے وہاں مہدی ان کے خلاف دار و گیر کے ذریعہ سے خدا اور لوگوں کا قرب حاصل کر سکے۔

بہرحال منصور کے متعلق یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس نے اپنے عہد میں ان زندیقوں کی دار و گیر میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہو۔ اس کی سیاست ـــــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے ـــــ صرف ظاہری فتنوں کے قلع و قمع تک محدود تھی۔ لیکن جب مہدی برسر اقتدار آیا تو اس کی تاریخ کے نمایاں ترین مسائل میں سے زنادقہ کی دار و گیر اور ان کی تلاش و جستجو تھی۔ اس مقصد کے لئے ایک خاص افسر مقرر کیا تھا۔ جس کے عہدہ کا نام ہی "صاحب الزنادقہ" رکھا گیا تھا۔ اغانی میں ہے کہ "جب مہدی بصرہ آیا تو اس کے ساتھ حمدویہ صاحب الزنادقہ بھی تھا۔ اور مہدی نے بشار کو اس کے حوالہ کیا تھا کہ اُسے جان سے مار ڈالے[2]" دوسرے مقام پر ہے کہ "مہدی نے عبدالجبار صاحب الزنادقہ کو حکم دیا جس نے بشار کو قتل کر دیا[3]" یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہم ایک خاص افسر کی تقرری کے متعلق سنتے ہیں جس سے زندیقوں کے معاملات کا تعلق ہوتا تھا کہ وہ ان کی تلاش و جستجو کرے اور ان کو سزائیں دے۔ طبری ۱۶۷ھ کے حادثات میں بیان کرتے ہیں کہ اس سال مہدی نے زندیقوں کی تلاش میں کوشش کی اور عالم اسلام کے کونہ کونہ میں ان کی جستجو کر کے ان کو قتل کر دیا اور ان لوگوں کے معاملات پر عمر کلواذی کو مقرر کیا[4]

مہدی کے بارہ میں مسعودی کا بیان ہے کہ مہدی نے ملحدوں اور دین کے متعلق مداہنت کرنے والوں کو قتل کرنے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا کیونکہ اس کے عہد میں ان کا زور بہت نمایاں ہو گیا تھا اور یہ لوگ اس کی خلافت کے زمانہ میں اپنے اعتقادات کھلم کھلا بیان کرنے لگے تھے۔ کیونکہ مانی، ابن ویصان اور مرقیون

---

[1] اغانی صفحہ ۲۳، جلد ۳ [2] اغانی صفحہ ۱۰، جلد ۳ [3] ... [4] طبری صفحہ ۹، جلد ۱۰

کی کتابیں تو پہلے ہی پھیل چکی تھیں۔ عبداللہ ابن المقفع وغیرہ نے ان کتابوں کو نقل کیا اور زرداری اور پہلوی زبان سے عربی زبان میں ان کا ترجمہ کیا۔ نیز ابن ابی العوجاء، حماد عجرد، یحییٰ ابن زیاد اور مطیع ابن ایاس وغیرہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں جن سے مانیہ، دیصانیہ اور مرقونیہ وغیرہ فرقوں کی تائید مقصود تھی۔ اس کے نتیجہ میں زندیقوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور ان کی آراء لوگوں میں پھیلنے لگیں۔ اوّل اوّل تو مہدی نے ان علمائے متکلمین کو حکم دیا جو مناظرہ کا سلیقہ رکھتے تھے کہ ان ملحدین کی تردید میں کتابیں لکھیں اور ان معاندین کے خلاف دلائل و براہین قائم کر کے ان لوگوں پر حق کو واضح کریں جو شک و ارتیاب میں گرفتار ہو چکے تھے[1]

اس سے معلوم ہوا کہ زنادقہ کے خلاف مہدی نے دو کام کئے۔ ایک تو ایسا ادارہ اور محکمہ قائم کیا جو ان کی تلاش و جستجو کر کے ان کے خلاف کارروائی کرے اور دوسرے ان سے مناظرہ کرنے اور ان کی تردید میں کتابیں تصنیف کرنے کے لئے ایک علمی مجلس قائم کی۔

مختصر یہ ہے کہ مہدی کو ان لوگوں کی بڑی فکر رہتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرنا نہیں بھولا کہ جب خلافت اس تک پہنچے تو وہ بھی ان کو سخت سزائیں دے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ "ایک روز کا واقعہ ہے کہ مہدی کے سامنے ایک زندیق کو پیش کیا گیا۔ اس نے اس زندیق کو توبہ کر لینے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا تو مہدی نے اس کی گردن اڑوا دی اور اسے سولی پہ لٹکوا دیا۔ اور اپنے بیٹے موسیٰ ـــ (یہ مہدی کے بیٹے ہادی ہیں) سے کہا بیٹا! اگر خلافت تمہیں ملے تو اس جماعت یعنی مانی کے معتقدین کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہنا ـــ یہ ایسا فرقہ ہے کہ لوگوں کو بظاہر اچھی باتوں کی دعوت ہے۔ مثلاً فواحش سے اجتناب برتنا۔ دنیا سے بے تعلق رہنا۔ آخرت کے لئے کام کرنا۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں یہ سبق پڑھاتا ہے کہ گوشت کھانا حرام ہے۔ پاک پانی سے نہانا نہیں چاہئے۔ جانوروں کو قتل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ بڑی ہی سنگ دلی اور قساوت کی بات ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو دو خداؤں کی پرستش سکھاتا ہے۔ ایک نور اور دوسرے ظلمت اس کے بعد پھر یہ تعلیم دیتا ہے کہ بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ پیشاب سے نہا لینا جائز ہے۔ راستوں سے بچوں کو چرا کر اغوا کر لینا جائز ہے تاکہ تم ان کو تاریکی کی گمراہی سے نکال کر نور کی ہدایت میں پہنچا سکو۔ لہٰذا ان کے سروں پہ ہمیشہ لکڑی برساتے رہنا اور تلوار ننگی رکھنا۔ اور ان کو قتل کر کے خدا کے وحدۂ

[1] مسعودی صفحہ ۳۰۶ جلد ۲

لاشریک کا قرب حاصل کرنا ہیں نے تیرے دادا عباس کو خواب میں دیکھا ہے کہ انھوں نے مجھے دو تلواریں پہنائیں اور مجھے دو خدا ماننے والوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ موسیٰ نے وعدہ کیا — اس کے عہد خلافت کو ابھی صرف دس مہینے گزرے تھے — کہ خدا کی قسم اگر میں زندہ رہ گیا تو اس پورے فرقہ کو قتل کر دوں گا اور ان میں سے کسی دیکھنے والی آنکھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کہتے ہیں کہ موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ کھجور کے ایک ہزار تنے مہیا کئے جائیں۔ طبری کہتے ہیں کہ موسیٰ نے یہ حکم فلاں مہینے میں دیا تھا۔ اور اس کے دو ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا[1]

ہادی نے اپنے باپ کی وصیت کو پورا کیا۔ چنانچہ وہ بھی زنادقہ کو قتل کرتا تھا۔ طبری ۱۶۹ھ کے حادثات میں بیان کرتے ہیں کہ ہادی نے اس سال زنادقہ کی تلاش و جستجو میں بڑی شدت برتی۔ چنانچہ ان کے بہت سے لوگوں کو اس جرم میں قتل کیا۔ جن لوگوں کو اس نے قتل کیا ان میں یقطین کا منشی یزدان بن باذان اور اس کا بیٹا علی بن یقطین — یہ دونوں نہروان سے تعلق رکھتے تھے — بھی شامل تھے۔ علی بن یقطین کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حج کرنے کے لئے گیا۔ جب اس نے لوگوں کو طواف میں چلتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا کہ میں ان لوگوں کو ان بیلوں کے سوا اور کس چیز سے تشبیہ دوں جو گندم گاہنے کے لئے کھلیان میں گھوم رہے ہوں۔ علاء بن الحداد الاعمی اس کے متعلق کہتا ہے۔

أَيَا أَمِينَ اللهِ فِي خَلْقِهِ   وَوَارِثَ الْكَعْبَةِ وَالْمِنْبَرِ
مَاذَا تَرَى فِي رَجُلٍ كَافِرٍ   يُشَبِّهُ الْكَعْبَةَ بِالْبَيْدَرِ
وَيَجْعَلُ النَّاسَ إِذَا مَا سَعَوْا   حُمُرًا تَدُوسُ الْبُرَّ وَالدَّوْسَرِ

اے خدا کی مخلوق میں اللہ کے امین اور کعبہ اور منبر کے وارث! اس کافر آدمی کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے جو کعبہ کو کھلیان سے اور جب لوگ طواف کے لئے دوڑتے ہیں تو ان کو گیہوں اور سرسوں کو گاہنے والے گدھوں سے تشبیہ دیتا ہے۔

چنانچہ موسیٰ نے اسے قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا[2]

جب ہارون رشید خلیفہ ہوا تو وہ بھی زنادقہ کی دارو گیر کرنے میں اپنے پیشرو خلفاء کے نقوش قدم پر چلا۔ چنانچہ ۱۷۱ھ کے حادثات میں طبری بیان کرتے ہیں کہ ہارون رشید نے اس سال ان تمام لوگوں کو پناہ دے دی

[1] طبری صفحہ ۴۲ جلد ۱۰ [2] طبری صفحہ ۲۳ جلد ۱۰

تھی جو بھاگ گئے تھے یا چھپ گئے تھے۔ البتہ زنادقہ میں سے کچھ لوگوں کو پناہ نہیں دی گئی تھی جن میں یونس بن فردہ اور یزید ابن الفیض بھی شامل تھے[1]۔

حتیٰ کہ مامون کو بصرہ کے دس زندیقیوں کے متعلق اطلاع ملی جو "مانی" کے قول کی طرف رجحان رکھتے اور نور و ظلمت کے قائل تھے۔ جب لوگوں نے مامون رشید کو ان میں سے ہر ایک کا نام لے لے کر آیا تو مامون نے حکم دیا کہ ان سب کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ وہ حاضر کئے گئے تو ان کو ایک ایک کر کے بلاتا جاتا اور ان کے دین کے متعلق ان سے پوچھتا۔ سب یہی بتاتے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا دین اسلام ہے تو مامون ان کا امتحان اس طرح لیتا کہ مانی کا پتلا ان کے سامنے رکھ دیتا اور انہیں حکم دیتا کہ وہ اس پر تھوکیں اور اس سے اپنی برأت کا اعلان کریں۔ نیز ایک دریائی پرندہ "درج" کو ذبح کرنے کا حکم دیتا۔ ان باتوں سے وہ لوگ انکار کر دیتے اور مامون ان کو قتل کر دیتا[2]۔

معتصم کے عہد میں تو زندقہ کی تاریخ میں بڑا حادثہ پیش آیا۔ یہ حادثہ "افشین" کا مقدمہ تھا ـــــ افشین معتصم کا کمانڈر انچیف تھا ـــــ جب اس نے بغاوت کی تو اس کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ممبران محمد بن عبد الملک زیات اور احمد بن ابی دواد تھے۔ افشین پر کئی قسم کی تہمتیں لگائی گئی تھیں۔ بڑی تہمتیں یہ تھیں :۔

۱ ـــ دو آدمیوں نے ـ اشروسنہ میں ـ ایک مکان پایا جس میں چند بت رکھے ہوئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے اس مکان سے بتوں کو نکال کر مکان کو مسجد میں تبدیل کر دیا ان میں سے ایک امام بن گیا اور دوسرا مؤذن بن گیا۔ افشین نے ان دونوں آدمیوں کو گرفتار کر کے ایک ایک ہزار کوڑے لگوائے حتیٰ کہ ان کی کمر کا گوشت بالکل اڑ گیا۔

افشین نے اس الزام کے جواب میں کہا کہ اس نے شہنشاہان سغد سے یہ معاہدہ کیا ہوا تھا کہ ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ امام اور مؤذن نے جو کچھ کیا وہ دینی آزادی کی اس ضمانت کے خلاف تھا جو وہ دے چکا تھا اس لئے ان دونوں کو سزا دی گئی۔

۲ ـــ ایک تہمت یہ تھی کہ اس کے مکان سے ایک کتاب برآمد ہوئی جو سونے اور جواہرات اور دیبا

---

[1] طبری صفحہ ۵۰ جلد ۱۰ [2] مسعودی صفحہ ۲۴۹ جلد ۲

سے مزین کی گئی تھی اور اس کتاب میں کفریہ باتیں درج تھیں۔
اس تہمت کے جواب میں اس نے اس کتاب کا اقرار کیا اور بتایا کہ وہ کتاب اسے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے۔ اس کتاب میں ایرانی آداب و رسوم کا بیان ہے۔ اور اس میں کفریہ باتیں بھی شامل ہیں۔ اسے چونکہ مال و دولت کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نے اس کتاب کے اوپر سے سونے اور جواہرات وغیرہ اتارنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کتاب کی شان اس سے زیادہ نہیں ہے جیسا کہ کتاب کلیلہ و دمنہ اور کتاب مزدک کی شان ہوتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ملک کے بہت سے قاضیوں تک کے مکانات میں موجود ہیں جن پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا۔
۳۔۔۔ اس کے خلاف تیسری تہمت یہ تھی کہ وہ جھٹکے کا گوشت کھاتا ہے اور کہتا ہے کہ جھٹکے کا گوشت ذبیحہ کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ہر چہار شنبہ کے دن ایک کالی بکری کو کھڑا کر کے وہ اس کی کمر پر تلوار مار کر اس کے دو حصے کر دیتا اور ان دونوں حصوں کے درمیان چلتا اور پھر ان کا گوشت کھایا کرتا تھا۔

اس الزام کے جواب میں افشین نے کہا کہ جس شخص نے یہ شہادت دی ہے اس کے دشمنوں تک کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ قابل اعتبار اور بھروسہ کے آدمی نہیں ہیں۔ گواہ کے مکان اور خود افشین کے مکان کے درمیان ایسا کوئی دروازہ یا روشن دان موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سے وہ یہ باتیں دیکھ سکتا اور اس کے حالات کا پتہ لگا سکتا۔

۴۔۔۔ چوتھا الزام یہ تھا کہ رعایا کی طرف سے جو خطوط اشروسنی زبان میں اس کے پاس آتے ہیں ان کی ابتداء کچھ اس طرح کے الفاظ سے ہوتی ہے: "خدائے خدائیگان کے نام اس کے بندے فلاں ابن فلاں کی طرف سے" اس میں اور فرعون کے اس دعوے میں کہ "میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں" کیا فرق رہ جاتا ہے۔
اس الزام کا اس نے جواب دیا کہ یہ لوگ میرے باپ دادا کے نام اسی طرح سے خطوط لکھا کرتے تھے اور اسلام لانے سے پہلے خود میرے نام بھی اسی طرح کے خطوط لکھتے تھے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں ان کی نگاہوں میں اپنا رتبہ کم کر دوں کہ اس طرح ان کی اطاعت و فرماں برداری میں فرق پڑ جاتا۔
۵۔۔۔ پانچویں تہمت اس کے خلاف یہ تھی کہ اس کے بھائی نے "توہیار" کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ اس روشن دین (دین مجوسیت) کی مدد کرنے والا میرے، تمہارے اور بابک کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ بابک نے اپنی

حماقت سے اپنے آپ کو قتل کرا لیا۔ اگر تم نے مخالفت کی تو مسلمانوں کے پاس میرے سوا کوئی آدمی نہیں ہے جسے تیرے مقابلہ کے لیئے بھیج سکیں۔ میرے پاس شہسوار بہادر اور جری لوگ موجود ہیں۔ اگر میں تمہارے پاس چلا آؤں تو ہم سے جنگ کرنے کے لیئے صرف تین قسم کے آدمی باقی رہ جائیں گے۔ عرب۔ مغاربہ اور ترک۔ عرب کے لوگ تو کتوں کی طرح ہیں۔ ان کے آگے ایک ٹکڑا پھینک دو اور پھر گرز سے ان کا سر کچل دو۔ اور یہ مکھیاں — یعنی مغربی لوگ — تو یہ تو سر کھانے والے لوگ ہیں۔ ان سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ رہ گئے شیاطین کے بچے — یعنی ترکی لوگ — تو وہ کچھ وقت تک مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک ان کے ترکشوں میں تیر باقی رہیں، ان کے تیر ختم کرا دو۔ اس کے بعد ان پہ اپنے گھوڑے دوڑا دو اور ان کا آخری آدمی تک قتل کر دو۔ اس طرح وہ دین دوبارہ واپس آ سکتا ہے جو ہمیشہ سے ایرانیوں کا مذہب رہا ہے۔

اس بڑی تہمت کا خلاصہ یہ تھا کہ افشین نے "توہیار" سے ساز باز کر کے مملکت اسلامیہ کا تختہ الٹنے، خلافت کو مٹانے اور دینِ اسلامی کو ختم کرنے اور دوبارہ ایرانی مملکت قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا جس میں ایرانیوں کی زبان، ایرانیوں کا دین اور ایرانیوں کی حکومت ہوتی۔

افشین نے اوّل تو اس خط کا انکار کیا اور کہا کہ اس کے بھائی نے اگر ایسا کوئی خط لکھا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اور اگر مجھے ذمہ دار ٹھیرایا جائے تو در اصل میری طرف سے یہ ایک حیلہ اور تدبیر تھی جس کے ذریعہ سے میں "توہیار" پر اپنا اعتماد جما کر اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں "توہیار" کو گرفتار کر کے خلیفہ کے حضور میں پیش کر دیتا تاکہ خلیفہ کی بارگاہ میں میرا رتبہ اور بلند ہو جاتا۔

۶ — چھٹی تہمت اس پہ یہ تھی کہ اس نے ختنہ نہیں کرایا تھا۔

اس کے جواب میں افشین نے کہا کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے گا تو وہ مر جائے گا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ختنہ نہ کرانے سے آدمی اسلام سے نکل جاتا ہے۔

چنانچہ اسے قید میں ڈال دیا گیا اور اس کا کھانا پینا بند کر دیا گیا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ پھر اسے سولی پہ لٹکا کر جلا دیا گیا۔[1]

ابو تمام نے افشین کی شان میں بے شمار مدحیہ قصیدے کہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔

لَقَدْ لَبِسَ الْاَفْشِیْنُ قَسْطَلَةَ الْوَغٰی   مِحَشًّا بِنَصْلِ السَّیْفِ غَیْرَ مُوَاکِلِ

---

[1] اس کے مقدمہ کی تفصیلات، طبری جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۴، ابن الاثیر صفحہ ۱۹۰، اور تاریخ ابن خلدون میں دیکھیئے۔

وَجَرَّدَ مِنْ آرائِہٖ حِیْنَ اَضْرَمَتْ ۔۔۔ بِہِ الحَرْبُ حَدًّا مِثْلَ حَدِّ الْمَنَاصِلِ

وَسَارَتْ بِہٖ بَیْنَ الْقَنَابِلِ وَالْقَنَا ۔۔۔ عَزَائِمُ کَانَتْ کَالْقَنَا وَالْقَنَابِلِ

وَقَدْ ظُلِّلَتْ عِقْبَانُ اَعْلَامِہٖ ضُحًی ۔۔۔ بِعِقْبَانِ طَیْرٍ فِی الدِّمَاءِ نَوَاھِلِ

تَرَاہُ اِلَی الْھَیْجَاءِ اَوَّلَ رَاکِبٍ ۔۔۔ وَتَحْتَ صَفِیْحِ الْمَوْتِ اَوَّلَ نَازِلِ

افشین نے جنگی ہتھیار پہن لیے ہیں ۔ تلوار کا پھل اور آنکڑا جو کبھی دشمن کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے اپنی آراء سے جب جنگ کی آگ روشن ہو جاتی ہے تو وہ ایسی دھاریں ننگی کر دیتا ہے جو تیر کے پھل کی دھار کی طرح تیز ہوتی ہیں ۔ نیزوں اور سواروں کے درمیان اس کے ارادے اس طرح چلتے ہیں جیسے نیزے اور سوار چلا کرتے ہیں ۔ صبح سویرے اس کے جھنڈے کے عقابوں پر عقاب پرندے کے سائے پڑتے ہیں ایسے عقاب جو خونوں میں نہائے ہوئے ہوں ۔ تم دیکھو گے کہ جنگ کی طرف وہ پہلا بڑھنے والا سوار ہوگا اور موت کی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں وہ پہلا اترنے والا مسافر ہوگا ۔

لیکن جب اسے سولی دے کر جلا دیا گیا تو ابوتمام ہی نے اس کی مذمت میں ایک لمبا قصیدہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں

قَدْ کَانَ بَوَّاَہُ الْخَلِیْفَۃُ جَانِبًا ۔۔۔ مِنْ قَلْبِہٖ حَرَمًا عَلَی الْاَقْدَارِ

فَاِذَا ابْنُ کَافِرَۃٍ یُسِرُّ بِکُفْرِہٖ ۔۔۔ وَجْدًا کَوَجْدِ فَرَزْدَقٍ بِنَوَارِ

خلیفہ نے تو اسے اپنے دل کے ایک کونہ میں جگہ دی تھی اور تقدیروں کا محافظ بنا دیا تھا ۔ مگر دیکھو تو ۔ کافر عورت کا بیٹا دل میں عشقیہ انداز سے کفر کو چھپائے ہوئے نکلا جیسے فرزدق نے نوار کے عشق کو دل میں چھپا رکھا تھا ۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

مَازَالَ سِرُّ الْکُفْرِ بَیْنَ ضُلُوْعِہٖ ۔۔۔ حَتّٰی اصْطَلٰی سِرَّ الزِّنَادِ الْوَارِیْ

نَارًا یُسَاوِرُ جِسْمَہٗ مِنْ حَرِّھَا ۔۔۔ لَھَبٌ کَمَا عَصْفَرْتَ شِقَّ اِزَارِ

طَارَتْ لَہٗ شُعَلٌ یُھَدِّمُ لَفْحُھَا ۔۔۔ اَرْکَانَہٗ ھَدْمًا بِغَیْرِ غُبَارِ

فَفَصَلْنَ مِنْہُ کُلَّ مَجْمَعِ مَفْصِلٍ ۔۔۔ وَفَعَلْنَ فَاقِرَۃً بِکُلِّ فَقَارِ

مَشْبُوْبَۃٌ رُفِعَتْ لِاَعْظَمِ مُشْرِکٍ ۔۔۔ مَا کَانَ یَرْفَعُ ضَوْءَھَا لِلسَّارِیْ

صَلّٰی لَھَا حَیًّا وَکَانَ وَقُوْدَھَا ۔۔۔ مَیْتًا وَیَدْخُلُھَا مَعَ الْفُجَّارِ

يا مشهدا صدرت بفرحته إلى　　أمصارها القصوى بنو الأمصار
رمقوا أعالي جذعه فكأنما　　وجدوا الهلال عشية الإفطار

کفر متواتر اس کی پسلیوں کے درمیان چھپا رہا تا آنکہ اسی چقماق کی چھپی ہوئی پوشیدہ آگ سے اپنے آپ کو سینک لیا۔ ایسی آگ جو اس کے جسم پر چھائی جا رہی تھی۔ اس کی گرمی میں ایسی لپٹ اور شعلہ تھا جیسے اس نے ازار کے ایک حصہ کو عصفر کے زرد رنگ میں رنگ لیا ہو۔ اس آگ سے ایسے شعلے بلند ہو رہے اور اس کی لپٹیں اس کے اعضاء کو ایسے گرا رہی تھیں جیسے کسی عمارت کو منہدم کیا جا رہا ہو مگر اسے غبار نہ اٹھ رہا ہو۔ اس نے اس کے ایک ایک جوڑ بند کو جدا کر دیا اور ریڑھ کی ہڈی کے منکوں پہ ایک مصیبت ڈھا دی۔ تیز آگ جو ایک عظیم ترین مشرک کے لئے بلند کی گئی تھی وہ مشرک جو رات کے چلنے والے مسافروں کے لئے کبھی اپنی روشنی بلند نہیں کیا کرتا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس آگ کے لئے نمازیں پڑھتا رہا اور مرا تو اسی کا ایندھن بنا اور مرنے کے بعد گنہگاروں کے ساتھ اسی میں داخل ہوگا۔ ایسا منظر جس کی خوشی کو لے کر مختلف شہروں کے لوگ اپنے دور و دراز شہروں کی طرف لوٹے۔ انہوں نے اس کے جسم کے اوپر کے حصہ کو اس انداز سے دیکھا جیسے افطار کی شام کو لوگ عید کا چاند دیکھ لیں۔

تبریزی کہتے ہیں کہ "افشین نہ کافر تھا نہ منافق۔ وہ ایک ایرانی تھا۔ اس کے حسن اطاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے معتصم نے اسے اپنا مقرب بنا لیا۔ اور اپنے اہم معاملات میں اس پہ اعتماد کرنے لگا حتیٰ کہ بابک خرمی سے جنگ کرنے کا معاملہ بھی اس کے سپرد کر دیا۔ وہ کئی ہزار کی افواج لے کر اس کی طرف روانہ ہوا اور اس نے اسے گرفتار کر لیا... مگر حاسدوں نے اس کے اور معتصم کے درمیان فساد کا بیج بو دیا۔ معتصم سے انہوں نے کہا کہ وہ تمہاری مخالفت کے لئے تیاریاں کر رہا ہے اور افشین سے کہا کہ معتصم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں قتل کرا دے اس اندیشہ سے کہ معتصم کا داؤ نہ چل جائے وہ معتصم سے محتاط رہنے لگا۔ معتصم نے اس کی اس احتیاط سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ جو کچھ اسے بتایا گیا تھا وہ بالکل صحیح تھا چنانچہ معتصم نے اسے گرفتار کر کے سولی دے کر اسے جلا دیا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تمام حادثہ کا سبب ابن ابی داؤد تھے کیونکہ ابن ابی داؤد اور افشین میں ٹھن گئی تھی"۔ یہاں اس تحقیق کا موقعہ نہیں ہے کہ افشین پر جو تہمتیں لگائی گئی تھیں ان میں کچھ اصلیت تھی یا نہیں۔ اس کا مکمل تاریخی تحقیقات ہی ہو سکتی ہیں۔ ہمیں یہاں صرف اس پہلو سے بحث کرنی تھی کہ وہ زندقہ کے

ساتھ متہم کیا گیا تھا اور کیا کیا تہمتیں اس پہ لگائی گئی تھیں اور کس طریقہ سے اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور بس۔

مختلف معانی جن پر زندقہ کا لفظ بولا جاتا تھا

اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جس عہد کی ہم تاریخ بیان کر رہے ہیں اس عہد میں "زندقہ" کا مفہوم کیا سمجھا جاتا تھا اور جب وہ کسی آدمی کو زندقہ کے ساتھ متہم کرتے تھے تو ان کی کیا مراد ہوتی تھی اور اس کا باعث کیا ہوتا تھا؟

سچ یہ ہے کہ "زندقہ" کے لفظ کے معنی اور مفہوم سب لوگوں کے نزدیک یکساں نہیں تھے۔ خواص اور علماً کے ذہن میں اس کا جو مفہوم تھا وہ اس مفہوم سے قطعاً مختلف تھا جو عوام کے ذہن میں ہوتا تھا۔

عام لوگ عموماً اس لفظ کا اطلاق ہر رند مشرب اور آزاد منش پر کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس قسم کے لوگوں کو زندیق کہہ دیا کرتے تھے۔ ابراہیم بن سیار شاعر پہ زندقہ کی تہمت تھی حالانکہ اس کے متعلق کوئی ایسی بات مشہور نہیں ہے جس کا تعلق دین سے ہو۔ اس کے متعلق اتنا ہی مشہور ہے کہ وہ آزاد منش اور رند مشرب آدمی تھا۔ بڑا نادرہ گو تھا۔ لڑکوں سے محبت کرتا تھا اور رند مشرب لوگ ہی اسے پسند کرتے تھے[1]۔ آدم، جو عمر بن عبدالعزیز کے پوتے تھے ان پر بھی زندقہ کی تہمت تھی۔ کیونکہ وہ بھی رند مشرب اور آزاد منش شاعر تھے۔ شراب پیتے تھے اور شراب خوری میں بڑی افراط سے کام لیتے تھے۔ بعض مرتبہ ان کی زبان پہ —— نشہ کی حالت میں —— کچھ ایسے اشعار بھی آجاتے تھے جن کا دین سے بھی لگاؤ ہوتا تھا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :-

اِسْقِنِیْ وَاسْقِ خَلِیْلِیْ　　فِیْ مَدَی اللَّیْلِ الطَّوِیْلِ
لَوْنُهَا اَصْفَرُ صَافٍ　　وَهِیَ کَالْمِسْكِ الْفَتِیْلِ
فِیْ لِسَانِ الْمَرْءِ مِنْهَا　　مِثْلُ طَعْمِ الزَّنْجَبِیْلِ
رِیْحُهَا یَنْفَحُ مِنْهَا　　سَاطِعًا مِنْ رَأْسِ مِیْلِ
مَنْ یَنَلْ مِنْهَا ثَلَاثًا　　یَنْسَ مِنْهَاجَ السَّبِیْلِ
فَمَتٰی مَا نَالَ خَمْسًا　　تَرَكَتْهُ کَالْقَتِیْلِ
لَیْسَ یَدْرِیْ حِیْنَ ذَاكُمْ　　مَا دَبِیْرٌ مِنْ قَبِیْلِ

[1] ملاحظہ ہو اغانی صفحہ ۷، جلد ۱۱

إِنَّ سَمْعِي عَنْ كَلَامِ اللَّائِمِي فِيهَا الثَّقِيلِ
لَشَدِيدُ الوَقْرِ إِنِّي غَيْرُ مِطْوَاعٍ ذَلِيلِ
قُلْ لِمَنْ يَلْحَاكَ فِيهَا مِنْ فَقِيهٍ أَوْ نَبِيلِ
أَنْتَ دَعْهَا وَارْجُ أُخْرَى مِنْ رَحِيقِ السَّلْسَبِيلِ
تَعْطَشِ الْيَوْمَ وَتُسْقَى فِي غَدٍ نَعْتَ الطُّلُولِ

مجھے اور میرے دوست کو تمام لمبی رات تک شراب پلاتا رہ۔ اس کا رنگ صاف زرد ہے وہ بنی ہوئی مشک کی طرح ہے۔ اسے پی کر آدمی کے منہ میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے سونٹھ پی کر آتا ہے اس کی بو اس سے اس طرح پھیلتی اور بلند ہوتی ہے کہ ایک میل پرے سے سونگھ لو۔ جسے اس کے تین پیگ مل جائیں وہ سیدھے راستہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور اگر کہیں قسمت سے پانچ پیگ مل جائیں تو وہ اسے مقتول کی طرح کر کے چھوڑتے ہیں۔ اس کے بعد اسے اس کی بھی خبر نہیں رہتی کہ جنوبی ہوا کونسی ہوتی ہے اور شمالی ہوا کونسی۔ میرے کان اس آدمی کی باتوں کو سننے سے جو مجھے شراب کے بارہ میں ملامت کرے بہرے ہیں۔ ان میں سخت ڈاٹ لگی ہوئی ہے۔ میں ایسے آدمیوں کا فرمانبردار اور باتیں سننے والا نہیں ہوں جو مجھے شراب کے بارہ میں بُرا بھلا کہے وہ خواہ کوئی فقیہہ ہو یا کوئی بہت با عزت آدمی ہو اس سے کہہ دے۔ تو یہ سب کچھ کہہ رہا ہے؟ میاں جانے بھی دو۔ تم اسے چھوڑو۔ تم رحیق اور سلسبیل کی دوسری شراب کی آس لگائے بیٹھے رہو۔ آج پیاسے رہو۔ کل تمہیں ٹیلوں کے نیچے شراب پلائی جائے گی۔

یا مثلاً وہ کہتا ہے:۔

اِسْقِنِي وَاسْقِ غُصَيْنًا لَا تَبِعْ بِالنَّقْدِ دَيْنًا
اِسْقِنِيهَا مُرَّةَ الطَّعْـــمِ تُرِيكَ الشَّيْنَ زَيْنًا

مجھے اور شاخچہ کو شراب پلا دے۔ نقد کے عوض قرض فروخت نہ کر۔ مجھے وہ تلخ مزہ والی شراب پلا دے جو تجھے عیب کو بھی خوبصورت بنا کر دکھلائے۔

ان اشعار کی وجہ سے آدم پر زندقہ کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ مہدی اس کو گرفتار کر کے تین سو کوڑے اس لئے لگواتا ہے تاکہ وہ زندقہ کا اقرار کرے۔ مگر آدم کہتا ہے کہ "خدا کی قسم میں نے پل بھر کے لئے بھی کبھی خدا کے

ساتھ شرک نہیں کیا۔ آپ نے کسی قریشی کو زندیق بنتے دیکھا ہے؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ نشہ کا مجھ پہ غلبہ ہوا اور یہ شعر میرے دل پہ وارد ہوگئے۔ میں ایک قریشی نوجوان ہوں۔ نبیذ پیتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں رندی کے طور پہ کہتا ہوں"۔ اس واقعہ کے بعد سے آدم نے شراب نوشی اور رند مشربی کو بالکلیہ خیرباد کہہ دیا تھا۔ حتیٰ کہ حالت یہ ہوگئی تھی کہ وہ شراب پینے والوں اور شراب کے نام تک سے بیزار ہوگیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

شَرِبْتُ فَلَمَّا قِيلَ لَسْتَ بِنَازِعٍ   نَزَعْتُ وَثَوْبِي مِنْ اَذَى اللُّوْمِ طَاهِرُ

میں نے شراب پی۔ لیکن جب کہا جانے لگا کہ میں اس سے باز آنے والا نہیں ہوں تو میں اس سے باز بھی آگیا۔ میرا لباس کمینگی کی گندگی سے بہرحال پاک ہے۔

آپ دیکھئے کہ آدم نے کبھی بھی علمی زندقہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ شراب کے نشہ کا اس پہ غلبہ ہوتا تو وہ اس قسم کی باتیں کہہ گزرتا جو بے ہودہ ہوتی تھیں۔ لوگوں نے اس بنا پہ اس پہ بھی زندقہ کی تہمت لگا دی۔ یہ تہمت اسی زندقہ کے عام اور مشہور مفہوم کے اعتبار سے لگائی گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے شعراء لوگوں کو فسق و فجور کی دعوت دینے میں افراط سے کام لینے لگے تھے اور انہیں لاابالی پن پہ ابھارتے رہتے تھے۔ وہ اپنی دعوت میں اس پہ اکتفا نہیں کرتے تھے کہ بغیر دین کو بیچ میں لائے ہوئے وہ اپنی دعوت دے دیں بلکہ بسا اوقات وہ دین کو بھی نشانہ بنا لیتے تھے۔ وہ علانیہ ایسی باتیں کہتے تھے جس سے دین کے ساتھ تمسخر اور تلعب کا پہلو نکلتا تھا وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے جو شراب کو حرام کہتے تھے۔ وہ ان لوگوں کا تمسخر اڑاتے تھے جو انہیں جہنم کے عذاب سے ڈراتے یا یوم حشر اور حساب و کتاب کا ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ بشار کہتا ہے :-

لَا خَيْرَ فِي الْعَيْشِ اِنْ كُنَّا كَذَا اَبَدًا   لَا نَلْتَقِي وَسَبِيلُ الْمُلْتَقَى نَهَجُ

قَالُوا، حَرَامٌ تَلَاقِينَا! فَقُلْتُ لَهُمْ   مَا فِي التَّلَاقِي وَلَا فِي قُبْلَةٍ حَرَجُ

ایسی زندگی میں کوئی بھلائی نہیں اگر ہم ہمیشہ اسی طرح رہیں کہ ایک دوسرے سے نہ مل سکیں حالانکہ ملاقات کا راستہ صاف اور کشادہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ایک دوسرے سے ملنا حرام ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ایک دوسرے سے ملنے اور بوس و کنار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس قسم کی چیزیں ابتداءً خفیف انداز میں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد شدت اختیار کرتی چلی گئیں۔ تاآنکہ

ایک گونہ الحاد تک پہنچ گئیں۔ ان میں سے ہمیں سب سے زیادہ شدت ابونواس میں ملتی ہے مثلاً وہ کہتا ہے:

وَمُلِحَّةٍ بِاللَّوْمِ تَحْسَبُ اَنَّنِیْ ۔۔۔ بِالْجَهْلِ اُوْثِرُ صُحْبَةَ الشُّطَّارِ

بَكَرَتْ عَلَیَّ تَلُوْمُنِیْ فَاَجَبْتُهَا ۔۔۔ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ مَذْهَبَ الْاَبْرَارِ

فَدَعِیْ الْمَلَامَ فَقَدْ اَطَعْتُ غَوَایَتِیْ ۔۔۔ وَصَرَفْتُ مَعْرِفَتِیْ اِلَی الْاِنْكَارِ

وَرَاَیْتُ اِتْیَانَ اللَّذَاذَةِ وَالْهَوٰی ۔۔۔ وَتَعَجُّلًا مِنْ طِیْبِ هٰذِیْ الدَّارِ

اَحْرٰی وَاَحْزَمَ مِنْ تَنَظُّرِ اٰجِلٍ ۔۔۔ عِلْمِیْ بِهٖ رَجْمٌ مِنَ الْاَخْبَارِ

مَا جَاءَنَا اَحَدٌ یُخَبِّرُ اَنَّهٗ ۔۔۔ فِیْ جَنَّةٍ مَنْ مَاتَ اَوْ فِیْ النَّارِ

بعض اصرار کے ساتھ ملامت کرنے والیاں ایسی ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے شاطروں کی صحبت اختیار کئے ہوئے ہوں۔ وہ صبح صبح ملامت کرنے کے لئے آجاتی ہیں۔ میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ میں نیک لوگوں کا مذہب و مسلک اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اپنی ملامت کو چھوڑ دو۔ میں تو خود گمراہی کا مطیع بنا ہوا ہوں اور میں نے اپنی معرفت کو انکار میں تبدیل کر رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لذت اور خواہشات کو پورا کر لینا ہی بہتر ہے۔ اس جہان کی تمام اچھی چیزوں کو جلد اور نقد صورت میں اختیار کر لینا، مدت کے بعد ملنے والی چیز کا انتظار کرنے کے مقابلہ میں زیادہ مناسب اور زیادہ محتاط طریقہ ہے جبکہ وہ مدت کے بعد والی چیزیں ایسی ہوں کہ ان کے متعلق میرا علم محض اٹکل پچو ہی ہو۔ جو لوگ مر گئے ان میں سے ہمارے پاس لوٹ کر یہ خبر دینے کے لئے کوئی نہیں آیا کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں۔

اور وہ کہتا ہے:

یَا نَاظِرًا فِیْ الدِّیْنِ مَا الْاَمْرُ ۔۔۔ لَا قَدَرٌ صَحَّ وَلَا جَبْرٌ

مَا صَحَّ عِنْدِیْ مِنْ جَمِیْعِ الَّذِیْ ۔۔۔ تَذْكُرُهٗ اِلَّا الْمَوْتُ وَالْقَبْرُ

اے دین میں غور و فکر کرنے والے! آخر یہ معاملہ کیا ہے کہ نہ قدر کی بات صحیح ٹھہری نہ جبر کی؟ جو کچھ تو بیان کرتا ہے ان سب میں سے میرے نزدیک کوئی بات بھی تو سوائے موت اور قبر کے صحیح نہ ٹھہر سکی۔

اور وہ کہتا ہے:

قُلْتُ وَالْكَاْسُ عَلٰی كَفِّیْ تَهْوِیْ لِالْتِثَامِیْ ۔۔۔ اَنَا لَا اَعْرِفُ ذَاكَ الْیَوْمَ فِیْ ذَاكَ الزِّحَامِ

جب کہ شراب کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھا اور وہ میرے منہ سے لگنے کے لئے نیچے آ رہا تھا میں نے کہا کہ میں اس اژدحام میں اُس دن کو نہیں پہچانتا۔[1]

یہ بعض شعراء جن کی زبان پہ اس قسم کی باتیں آجاتی تھیں۔ اس قسم کی باتیں کہنے کے باوجود اپنے دین کے متعلق قطعاً مطمئن ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ نشہ کے غلبہ میں ان کی زبان پہ اس قسم کے اشعار آ جاتے تھے اور وہ انہیں اپنی زبان سے ادا کر دیتے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ آدم بن عبد العزیز بن عمر ابن عبد العزیز کے اشعار کے متعلق آپ اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں۔

جو لوگ ان اشعار کو سنتے تھے وہ آپس میں اختلاف کرنے لگتے تھے۔ کچھ لوگ ان جیسے اشعار کی وجہ سے ناراض ہو جاتے تھے اور ان کے قائل پر الحاد، بے دینی اور دین سے نکل جانے کا فتویٰ لگا دیتے تھے۔ دوسرے لوگ ان اشعار کو حقیقت پہ محمول نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اسے ایک قسم کا مذاحیہ کلام سمجھتے تھے جو محض فکاہیہ انداز میں رندانہ طریقہ پہ کہہ دیا جاتا تھا۔ اس آخری بنیاد کے مطابق عموماً اس عہد میں ظریف آدمی کو بھی زندیق کہہ دیا جاتا تھا۔ ابو نواس۔ عباس ابن فضل بن ربیع کی تعریف میں کہتا ہے۔

نَدِيمُ كَأْسٍ مُحَدِّثُ مَلِكٍ　　فِيهِ مُغَنٍّ وَ ظَرْفُ زِنْدِيقِ

شراب کے پیالہ کا ندیم، بادشاہ کا مصاحب۔ اس میں ایک مغنی کا غرور اور ایک زندیق کی ظرافت پائی جاتی ہے۔

بلکہ بعض لوگ اس تہمت میں مشہور تھے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق زندقہ کی باتیں نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ ظرافت میں مشہور ہو جائیں۔ چنانچہ اغانی میں ہے کہ محمد بن زیاد ظرافت کے طور پہ زندقہ کا اظہار کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے بارہ میں ابن مناذر کا قول ہے کہ

يَا ابْنَ زِيَادٍ، يَا أَبَا جَعْفَرٍ　　أَظْهَرْتَ دِيناً غَيْرَ مَا تُخْفِي
مُزَنْدِقُ الظَّاهِرِ بِاللَّفْظِ فِي　　بَاطِنِ إِسْلَامِ فَتًى عَفِّ
لَسْتَ بِزِنْدِيقٍ وَلٰكِنَّمَا　　أَرَدْتَ أَنْ تُوسَمَ بِالظَّرْفِ

---

[1] یہ اشعار موشح صفحہ ۲۷۷ و ما بعد سے نقل کئے گئے ہیں۔ نیز قاضی عبد العزیز جرجانی کی کتاب "الوساطہ بین المتنبی وخصومہ" کے صفحہ ۵۷ و ما بعد سے اس کتاب میں آپ کو اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

اے ابن زیاد۔ اے ابوجعفر! جو کچھ تمہارے دل میں ہے تم اس کے برخلاف اپنا دین ظاہر کرتے ہو۔ ظاہر میں لفظی طور پر زندیق بنتے ہو مگر باطن میں ایک پاک دامن نوجوان آدمی کا سا اسلام رکھتے ہو۔ تم زندیق نہیں ہو۔ لیکن تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں ظرافت کے لقب کے ساتھ یاد کیا جائے [۱]

کسی اور نے بھی کہا ہے :۔

تَزَنْدَقَ مُعْلِنًا لِيَقُوْلَ قَوْمٌ ۔۔۔ اِذَا ذَكَرُوْهُ زِنْدِيْقٌ ظَرِيْفٌ

فَقَدْ بَقِیَ التَّزَنْدُقُ فِیْهِ وَسْمًا ۔۔۔ وَمَا قِيْلَ الظَّرِيْفُ وَلَا اللَّطِيْفُ

اس نے علانیہ زندقہ کی باتیں کیں تاکہ لوگ جب اس کا نام لیں تو اُسے ظرافت آشنا زندیق کہیں لیکن اس کی شہرت زندقہ کے ساتھ تو باقی رہ گئی مگر کسی نے نہ اسے ظریف کہا اور نہ لطیف المزاج۔

مختصر یہ ہے کہ اس معنی میں زندقہ ـــ یعنی لاابالیانہ پن کے معنی میں ـــ پھر بتدریج ترقی کرتے کرتے ذومعنی الفاظ کے ساتھ کبھی کبھی دین کے خلاف استہزاء کے معنی میں، پھر اس غلو اور مبالغہ کرنے اور بے سوچے سمجھے ملحدانہ الفاظ کہہ دینے کے معنی میں ـــ غرضکہ یہ تمام استعمالات اسی عہد میں عام اور مشہور تھے۔ عام لوگوں کے اذہان میں زندقہ کے یہ سارے معانی ہوتے تھے۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے لوگ کہہ دیا کرتے تھے کہ "زندقہ کی تین نشانیاں ہیں۔ شراب پینا۔ فیصلہ دینے میں رشوت لینا۔ اور زناکاری کی کمائی کھانا" [۲]

زندقہ کا ایک اور مفہوم بھی تھا جسے خواص سمجھتے تھے۔ اس کی حقیقت ان کے نزدیک یہ تھی کہ آدمی بظاہر تو مسلمان ہو جائے لیکن دل میں اپنے قدیم ایرانی مذہب سے تعلق باقی رکھے۔ خصوصیت کے ساتھ مانی کے مذہب سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عہد میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو دل سے تو ایمان نہیں لائے تھے البتہ اسلام کے غلبہ کی وجہ سے بظاہر مسلمان ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ جاہ، عزت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ذریعہ اسلام لانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن وہ دل میں اپنے پرانے دین کے لئے خلوص رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی اغراض اس سے بھی گہری ہوا کرتی تھیں۔ وہ دیکھتے تھے کہ اسلامی عقائد کو خراب کرنے کا ذریعہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خود کو اولاً اسلام کے ساتھ منسوب

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۵ جلد ۱۷ ۔ [۲] العقد الفرید صفحہ ۱۵۷ جلد ۱ ۔

کر دیا جائے تاکہ ان کی جانب سے کسی کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے اور لوگ آسانی کے ساتھ ان کی باتیں قبول کر سکیں۔ چنانچہ وہ مسلمان بن کر مختلف صورتوں میں اپنی تعلیمات کا جادو پھونکتے رہتے تھے۔ کبھی علم اور دین کے مسائل میں اور کبھی ادب اور لٹریچر میں اور کبھی عربوں کی بُرائیاں گھڑنے میں۔ وقتاً فوقتاً ان کی حرکتوں کا علم ہوتا رہتا اور ان کو سزائیں دی جاتی رہتی تھیں۔ لیکن یہ لوگ اس طرح ختم نہیں ہوتے تھے۔ یہ لوگ کبھی تو انفرادی طور پر اس قسم کے کام کرتے تھے اور کبھی اجتماعی طور پر۔ یہ عہد جس کی ہم تاریخ بیان کر رہے ہیں اس قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا تھا۔ عبدالکریم ابن ابی العوجاء پر جب زندقہ کی تہمت لگائی گئی کہ وہ اپنی طرف سے گھڑگھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو خراب کرتا رہا تھا، تو جب اسے منصور قتل کراتا ہے اور وہ اقرار کرتا ہے کہ اس نے چار ہزار جھوٹی، بناوٹی حدیثیں گھڑگھڑ کر لوگوں میں پھیلادی ہیں[1]۔ اسی طرح حماد الراویہ لغت اور ادب کو خراب کرتا رہا۔ وہ اپنی طرف سے شعر بنا بنا کر متقدمین شعراء کی طرف منسوب کرتا اور انھیں ان کے اشعار میں گھسیڑ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اکثر راویوں کو کہنا پڑا کہ حماد نے شعر کو خراب کر دیا ہے۔ وہ ایسا آدمی تھا جسے صنعتِ شعر پر اتنی بڑی قدرت حاصل تھی کہ وہ ہر شخص کے اشعار میں اس کے انداز کے اشعار بنا بنا کر ملا دیا کرتا تھا[2]۔ صالح بن عبدالقدوس اشعار میں زندقہ کے مضامین ملا دیا کرتا تھا۔ یونس بن ابی فروہ نے عربوں کی بُرائیوں پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں اس نے اپنے خیال کے مطابق عربوں اور اسلام کے عیوب جمع کر دیئے تھے۔ اس کتاب کو لے کر وہ شہنشاہ روم کے دربار میں حاضر ہوا اور اس سے انعام میں بہت سا مال حاصل کیا[3]۔

یہ اور ان جیسے دوسرے لوگ علمی انداز میں زندقہ کو پھیلاتے تھے۔ وہ درحقیقت مانی اور مزدک کے دین کے پیرو ہوتے تھے۔ نور اور ظلمت پر ایمان رکھتے تھے۔ بالفاظِ دیگر علمی طور پر وہ مجوسیت کے متبع اور مبلغ ہوتے تھے۔ لیکن تقیہ کے طور پر بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے تاکہ اس طرح لوگوں کو گمراہ کر سکیں اس خاص مفہوم کی طرف رہنمائی ہمیں اس روایت سے ملتی ہے جو اغانی نے بیان کی ہے کہ بشار نے حماد عجرد کی ہجو میں جب یہ شعر کہے تھے کہ

یَا ابْنَ نُعْمٰی رَأْسُکَ عَلَیَّ ثَقِیْلٌ ۔۔۔ وَاحْتِمَالُ الرَّأْسَیْنِ اَمْرٌ جَلِیْلٌ

---

[1] امالی المرتضیٰ صفحہ ۸۹ جلد ۱ [2] امالی المرتضیٰ صفحہ ۹۰ جلد ۱ [3] ایضاً صفحہ ۹۰ جلد ۱

فَادْعُ غَيْرِیْ اِلٰی عِبَادَةِ رَبَّيْنِ فَاِنِّیْ بِوَاحِدٍ مَشْغُوْل

اے نہیبی کے بیٹے! مجھ پر تو ایک سر ہی بہت گراں ہے۔ دوسروں کو اٹھانا تو بہت بڑی بات ہے دو پروردگاروں کی عبادت کے لئے میرے سوا کسی دوسرے کو بلا لے کیونکہ مجھے تو ایک ہی سے فرصت نہیں ہے۔

تو حماد نے کہا تھا کہ مجھے بشار سے اور کوئی شکایت نہیں۔ مجھے بشار کے اس تجاہل عارفانہ پر غصہ آتا ہے جو اس نے زندقہ کے بارہ میں استعمال کیا ہے۔ وہ لوگوں کو اس شبہ میں ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے خیال میں زندیق لوگ سر کی پرستش کرتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ بشار بیچارہ کو زندقہ کی کچھ خبر ہی نہیں۔ کیونکہ سروں کی پرستش ایک ایسی بات ہے جسے عام لوگ ہی کہتے ہیں حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حالانکہ بشار کو بخدا زندقہ کا علم مانی سے بھی زیادہ ہے[1]

ابونواس کہتا ہے کہ میں یہی سمجھتا تھا کہ حماد عجرد پر اس کے رندانہ اشعار کی وجہ سے زندقہ کی تہمت لگا دی گئی تھی۔ لیکن جب مجھے زنادقہ کے قید خانہ میں حماد کے ساتھ قید کیا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ حماد تو زنادقہ کے اماموں میں سے ایک امام ہے۔ اس کے دو دو شعروں کے ایسے قطعات ہیں جنھیں زندیق لوگ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں[2]

اس عہد میں بہت سے لوگ زندقہ میں مشہور تھے۔ ان میں سے تینوں حماد یعنی حماد بن عجرد، حماد الراویہ، اور حماد بن الزبرقان، بشار بن برد، ابن المقفع، یونس بن ابی فروہ، مطیع بن ایاس، عبدالکریم ابن ابی العوجاء، صالح بن عبدالقدوس۔ علی ابن الخلیل، اور ابن المناذر زیادہ مشہور ہیں۔ اغانی وغیرہ میں ان کے حالات کے ضمن میں ایسے بہت سے قصے ملیں گے جن سے ان کے زندقہ کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں کے درمیان بعض اوقات بڑی دوستی اور محبت ہوتی تھی اور بعض اوقات دشمنی، عداوت اور طعن و تشنیع بھی

موالی اور عربوں میں زندقہ

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذکورہ اشخاص میں زیادہ تر ایران کے آزاد شدہ غلام ہی ہیں۔ یہ بات بالکل طبعی تھی کیونکہ اس معنی میں زندقہ کی طرف —— کہ اسلام کے پیچھے ایرانی ادیان میں سے مجوسیت کا کوئی دین چھپا ہوا ہوتا تھا —— طبعاً وہی لوگ زیادہ رجحان

---

[1] اغانی صفحہ ۶، جلد ۱۳ [2] اغانی صفحہ ۷۴، جلد ۱۳۔

رکھتے تھے جن کی اصل مجوسی ہوتی تھی۔ تاہم عربوں بلکہ ہاشمیوں میں سے بھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن پر زندقہ کی تہمت تھی۔ مثلاً حسین عبداللہ بن عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب اور عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر ابن ابی طالب[1]، اور مثلاً طبری کے بیان کے مطابق خلیفہ مہدی کے سامنے داؤد بن علی اور یعقوب بن فضل بن عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کو پیش کیا گیا۔ ان دونوں پر زندقہ کی تہمت تھی اور مہدی کے سامنے ان دونوں نے اس کا اقرار کیا[2]۔ لیکن عربوں میں زندقہ شاذونادر ہی پایا جاتا تھا۔ جن لوگوں پر زندقہ کی تہمت لگائی گئی ہے وہ زیادہ تر اس کے پہلے مفہوم کے اعتبار سے ہے یعنی رندانہ مشرب اور فسق و فجور اور تمسخر وغیرہ کے لحاظ سے یا ان کو زندقہ کے ساتھ متہم کرنا وہ جال ہوتا تھا جو سیاسی خصومتوں کی وجہ سے ان کے خلاف لگا دیا جاتا تھا۔

اس قسم کے زندقہ میں میر منشیوں کا ایک بڑا گروہ بھی بڑی شہرت رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اس طرح زیادہ تر ایرانی الاصل ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے تھوڑی تھوڑی مقدار ہر علم سے حاصل کی ہوتی تھی مگر کسی علم میں بھی ان کو گہرائی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے تھے اور ان میں زیادہ تر زندیق ہوتے تھے۔ جاحظ کہتے ہیں کہ "ان میں سے کسی مبتدی کو جہاں ذرا عربی کے کچھ چلتے ہوئے فقرے یاد ہوئے اور علم کی موٹی موٹی باتیں معلوم ہوئیں اور ذرا اس نے بزرجمہر کی "امثال"، اردشیر کا "عہد"، عبد الحمید کے "رسائل" اور ابن المقفع کا "الادب" پڑھا اور مزدک کی کتاب کو اپنے علم کا سرچشمہ اور کلیلہ دمنہ کے دفتر کو اپنی حکمت کا خزانہ قرار دیا اور اسے فوراً یہ وہم سوار ہوا کہ وہ تدبیر و انتظام میں فاروق اکبر اور تفسیری علم میں ابن عباسؓ اور حلال و حرام کے علم میں معاذ بن جبلؓ اور فیصلہ اور احکام پر جرأت کرنے میں علیؓ ابن ابی طالب اور جزء اور طفرہ جیسے مسائل میں ابو الہذیل علاف اور مکامنات اور مجانسات جیسے مسائل میں ابراہیم ابن سیار نظام اور عبادات اور اثبات وغیرہ مسائل میں حسین نجار اور لغت اور علم انساب میں اصمعی اور ابوعبیدہ بن گیا ہے۔ اس کا پہلا نشانہ قرآن کریم بنتا ہے اور اس کے نظم و ترتیب پر اعتراضات شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تناقض پایا جاتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر احادیث کی تکذیب کر کے اپنی ظرافت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ احادیث کی رُوات پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ کے صحابہؓ کی خوبیاں بیان

---

[1] ان دونوں کے زندقہ کا حال اغانی صفحہ ۵، جلد ۱۱ و مابعد میں دیکھیے۔ [2] طبری صفحہ ۲۳ جلد ۱۰

کرتا ہے تو ان کا ذکر آتے ہی وہ اپنی باچھیں چبانے لگتا ہے اور ان کے محاسن سے پہلوتہی کرکے اِدھر اُدھر نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ان کے سامنے شریح کا نام لیا جائے تو وہ اس پر جرح کردیں گے۔ اگر حسن بصریؒ کا ذکر کیا جائے تو انہیں بڑا ہی گراں گزرے گا۔ اگر ان کے سامنے شعبی کا تذکرہ کیا جائے تو وہ انہیں احمق بتائیں گے۔ اور اس کے بعد اپنی اس مجلس کا خاتمہ اردشیر بابکان کی سیاست، نوشیرواں کی تدبیر مملکت، آلِ ساسان کے حسنِ انتظام کے تذکرہ پر کردیں گے۔ اگر انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کی نگاہیں خشمگیں ہیں اور مسلمان جزبز ہو رہے ہیں تو احادیث کا مقابلہ و موازنہ معقولات سے کرنا شروع کردیں گے۔ قرآن کے محکمات و منسوخات کا تذکرہ چھیڑ دیں گے۔ اور بتائیں گے کہ جو چیزیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں ان کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اور غائب چیزوں کو حاضر چیزوں سے تشبیہ دینا شروع کردیں گے۔ انہیں منطق کے سوا دوسری کتابیں پسند ہی نہیں آتیں ..... ان کے کردار اور اخلاق کے متعلق عام طور سے یہی کچھ مشہور ہے[1]۔

بعض مرتبہ "زنادقہ" کا لفظ ایرانی دین کے پیروؤں پر بھی بول دیا جاتا ہے۔ یعنی بغیر اس کے کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ چنانچہ جاحظ کی کتاب الحیوان میں بھی اکثر یہ استعمال ہی ملتا ہے چنانچہ جاحظ کہتے ہیں "ان زنادقہ کی کتابیں اوراق کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہوتی ہیں۔ ان پر سیاہ چمکدار روشنائی سے لکھا جاتا ہے۔ اور خط بھی نہایت پاکیزہ ہوتا ہے[2]۔ ان کی کتابیں علم اور حکمت کے اعتبار سے کچھ مفید نہیں ہوتیں۔ نہ ان میں کوئی چلتی ہوئی ضرب المثل ہوتی ہے نہ عمدہ خبر، نہ ادبی صنعت نہ کوئی عجیب و غریب حکمت کی بات نہ فلسفہ نہ کلام کا کوئی مسئلہ ..... اس میں سب سے بڑا حصہ نور اور ظلمت کے ذکر کا ہوتا ہے یا شیاطین کی شادیوں کے افسانے اور دیوؤں کی جنگوں کا تذکرہ۔ ان میں آپ کو صندید کا تذکرہ ملے گا اور صبح کے ستون سے ڈرانے کا حال۔ اس کے بعد جاحظ ان کی کتابوں کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے مضامین کا مذاق اڑاتے ہیں[3]۔

جاحظ کہتے ہیں کہ "یہ زنادقہ بہت سے لوگوں پر اثر انداز ہوئے خصوصیت کے ساتھ صوفیوں اور نصرانیوں پر۔ چنانچہ یہ لوگ ذبیحہ کا گوشت کھانے سے احتراز کرتے تھے اور خون بہانے کو بہت بڑا جانتے تھے۔ گوشت خوری میں زہد سے کام لیتے تھے"۔ جاحظ آگے چل کر کہتے ہیں کہ "کچھ لوگ جو خود کو حلقہ بگوش اسلام کہتے تھے شکار کرنے سے بڑے گھناؤنے پن کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ سنگدلی تھی اور اس سے انسانوں کی خونریزی

---

[1] ثلاث رسائل للجاحظ صفحہ ۴۲ ۔ [2] حیوان صفحہ ۲۸ جلد ۱ ۔ [3] حیوان صفحہ ۲۹ جلد ۱

کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں گھٹ جاتی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک رحمدلی تو بہرحال ایک ہی شکل کی چیز ہے جو کتے پر رحم نہیں کرتا وہ ہرن پر کب رحم کر سکتا ہے اور جو ہرن پر رحم نہیں کھاتا وہ بکری کے بچے پر کب رحم کھا سکتا ہے چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بڑی بڑی باتوں تک پہنچا دیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے یہ لوگ زندیقوں کے طریقہ سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں[1]"

زندقہ کا ایک دوسرا مفہوم بھی تھا جسے جاحظ وغیرہ اکثر استعمال کر جاتے ہیں وہ اس لفظ کا اطلاق ایسے لوگوں پر کر دیتے ہیں جو غور و فکر کے بعد دنیا کے تمام ادیان سے انکار کر دیتے تھے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ دہریت اور الحاد کے ہم معنی ہوتا تھا۔ ابوالعلاء نے اپنے رسالہ "الغفران" میں کہا ہے کہ "زنادقہ وہی لوگ ہیں جنھیں دہریہ بھی کہہ دیتے ہیں یہ لوگ نہ نبوت کے قائل ہوتے ہیں نہ کسی کتاب کے"۔

اسی مفہوم میں جاحظ بھی ایک جگہ کہتے ہیں کہ "زندقہ نصاریٰ میں بڑا عام تھا[2]"۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زندقہ کے لفظ سے، جاحظ کا مقصد شک و ارتیاب وغیرہ ہے۔

ان تمام باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ زندقہ کا لفظ صرف ایک مفہوم ہی میں مستعمل نہیں ہوتا تھا بلکہ کم از کم چار معنوں میں بولا جاتا تھا۔

(۱) آزادہ روی، تمسخر، فجور، رندانہ گوئی وغیرہ۔ اس کے ڈانڈے کبھی کبھی دین سے جا ملتے تھے لیکن اس کا قائل سوچ سمجھ کر وہ باتیں نہیں کہتا تھا بلکہ محض لاابالیانہ پن اور رندانہ روش کے ماتحت کہہ گزرتا تھا۔

(۲) دین مجوسیت کی پیروی، خصوصاً مانی کے دین کا اتباع جس کے ساتھ اسلام کا مظاہرہ بھی پایا جائے جیسا کہ افشین، بشار، حماد اور ابن المقفع پر تہمت لگائی گئی تھی۔

(۳) دین مجوسیت کا اتباع خصوصاً دین مانی کی پیروی بغیر اسلام کے مظاہرہ کے جیسا کہ جاحظ نے زنادقہ کی بعض کتابوں کے متعلق ذکر کیا ہے۔

(۴) ملحدین جن کا کوئی دین نہ ہو۔ مثلاً وہ لوگ جن کی نمائندگی معرّی کرتا ہے۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ لفظ ـــ زیادہ تر ان لوگوں پر بولا جاتا تھا جو بباطن مانویت کے پیرو تھے اور بظاہر مسلمان بنے ہوئے

---

[1] حیوان صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷ جلد ۴ ۔ [2] ثلاث رسائل للجاحظ صفحہ ۱۷ ۔

تھے ۔ اس کے بعد اس کے مفہوم میں وسعت آتی گئی ۔ چنانچہ رند مشرب لوگوں اور ایسے ملحدوں کو بھی زندیق کہنے لگے جن کا کوئی دین ہی نہیں ہوتا تھا ۔

بہر حال زندقہ اپنے مختلف معانی میں اس عہد میں پھیلا ہوا تھا ۔ ابوالعلاء نے اپنے رسالۃ الغفران" میں خلیفۂ اموی، دعبل شاعر، بشار، ابونواس، صالح بن عبدالقدوس، ابومسلم خراسانی، یعنی مملکت عباسیہ کا کوسس اول، بابک، افشین، اور حلاج صوفی وغیرہم کو زنادقہ میں سے شمار کیا ہے ۔ چنانچہ دعبل کے بارہ میں وہ کہتے ہیں کہ "مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دعبل ابن علی کا کوئی دین نہیں تھا ۔ وہ بظاہر شیعہ بنا ہوا تھا لیکن اس سے اس کی غرض محض روپیہ کمانا تھا ۔ مجھے اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ دعبل دراصل حکمی (ابونواس) اور اس کے طبقہ کے لوگوں کی رائے پر عمل پیرا تھا ۔ ان لوگوں میں زندقہ خوب پھیلا ہوا تھا اور ان کے شہروں میں ہی اس نے نشو و نما پائی تھی ۔" پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ ۔

"ابونواس کے بارہ میں بڑا اختلاف ہے ۔ اس کے متعلق دعویٰ تو یہ کیا جاتا ہے کہ وہ بڑا خدا پرست تھا اور اپنے دن کی نمازوں کو رات کے وقت قضا پڑھ لیا کرتا تھا لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کا مذہب وہی کچھ تھا جو اس کے عہد کے دوسرے لوگوں کا تھا ۔"

زندقہ کے اسباب و وجوہ

اس عہد میں زنادقہ کا ہونا ایک طبعی امر تھا جس کے اسباب مختلف تھے کچھ لوگ تو ایسے تھے کہ انھیں زندقہ کی طرف ان کا وہ دین مائل کرتا تھا جس سے وہ پرانے زمانہ سے مانوس چلے آتے تھے ۔ اور یہ دین مجوسیت تھا ۔ اس دین میں ان کی کئی نسلیں گزر چکی تھیں ۔ ان کی اپنی عادات و رسوم تھیں جو سلف سے ان میں چلی آرہی تھیں لیکن انھوں نے دیکھا کہ جاہ و مرتبہ اور عزت و شرف کے مناصب تک وہ اس کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے کہ مسلمان ہو جائیں چنانچہ وہ اسلام لے آئے ۔

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِهِمْ (لیکن ابھی تک ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا تھا)

مگر اسلام کو انھوں نے محض اپنا ظاہری لبادہ بنایا تھا ۔ جب وہ اپنے خاص لوگوں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھتے تھے تو اس لبادہ کو اتار دیا کرتے تھے ۔ اور جب کبھی انھیں موقعہ ملتا ۔ تو وہ اسلام اور عربوں کے خلاف سازشیں کرتے اور شعوبیت اور دیگر مذاہب وغیرہ کی طرف لوگوں کو دعوتیں دیتے تھے ۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ادیان کے بارہ میں شک و شبہ نے زندقہ کی طرف دعوت دی تھی یہ لوگ آخری حدود تک عقل کے تسلط اور غلبہ کے قائل تھے۔ وہ صرف ان چیزوں پہ ایمان لانا چاہتے تھے جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہوں۔ جن امور میں عقل کی مجال بھی نہیں ہے وہ وہاں بھی عقل کے فیصلوں پر چلنا چاہتے تھے۔ بالآخر انہوں نے سارے کے سارے ادیان کو چھوڑ دیا تھا اور الحاد کے داعی بن گئے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا سب سے بڑا مقصد ان کی اپنی خواہشات اور شہوات ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک زندگی شراب اور کباب تک ہی محدود تھی۔ وہ اپنی عقلوں کو سوچنے سمجھنے کی تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ دین بھی ایک سوچنے سمجھنے ہی کی چیز تھی، دین کے خلاف اس وقت بڑا غصہ آتا تھا جب وہ ان کی شہوات سے معارض ہوتا اور ان کی لذتوں کو محدود کرنا چاہتا۔ اس حالت میں جبکہ وہ نشہ میں چور ہوتے تھے وہ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ زبان سے نکالتے اور دین کا مذاق اور تمسخر اڑاتے ـــــ زندیقوں کی یہ ساری اقسام ہی عباسی عہد میں موجود تھیں۔ جمہور مؤمنین ان کو ناپسند کرتے اور ان کے خلاف جنگ کرتے تھے۔

لیکن یہ کہنا بھی بالکل ہی سچ ہوگا کہ زندقہ کی تہمت اس زمانہ میں کسی خاص حد تک محدود نہیں تھی۔ چنانچہ

جھوٹ اور سچ زندقہ کی بکثرت تہمتیں

ایک شاعر دوسرے شاعر کا نہائت ہی قلبی دوست ہوتا۔ اس کے بعد ان کے تعلقات خراب ہو جاتے تو سب سے پہلے جو وہ اس کے خلاف تہمت لگاتا تھا۔ وہ یہی ہوتی تھی کہ وہ تو زندیق ہے۔ مثال کے طور پہ بشار اور حماد نے جو ایک دوسرے کی ہجو کی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ یا مثلاً اس قول کو دیکھئے جو خلاد ارقط کہتا ہے کہ یونس کے حلقہ میں ابن مناذر کا ذکر کیا گیا اس پر حلقہ والوں میں سے زیادہ تر لوگوں نے ابن مناذر پر طعن و تشنیع کی حتیٰ کہ لوگوں نے اسے زندقہ کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ جب میں اس حلقہ سے اٹھ کر اس سائبان کے نیچے پہنچا جو مسجد کے اگلے حصہ میں بنا ہوا تھا یکایک میں نے قرأت کی آواز سنی جو قریب ہی قبلہ کی دیوار کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ ابن مناذر کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں دوبارہ اس حلقہ کی طرف لوٹا تو میں نے حلقہ والوں سے کہا کہ تم اس شخص کے متعلق یہ کچھ کہہ رہے تھے مگر وہ تو ایسی جگہ کھڑا ہو کر نماز پڑھ رہا ہے جہاں سے خدا کے سوا اسے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔[1]

---

[1] اغانی صفحہ ۲۹ جلد ۱۷

http://ebooksland.blogspot.com/

پھر یہ لوگ بڑی جلد بازی سے انہیں لگا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ابو العتاہیہ کے خلاف زندقہ کی تہمت محض اس کے ان اشعار کی وجہ سے لگا دیتے ہیں ؎

كَأَنَّ عَتَّابَةَ مِنْ حُسْنِهَا دُمْيَةُ قَسٍّ فَتَنَتْ قَسَّهَا
يَا رَبِّ لَوْ أَنْسَيْتَنِيهَا بِمَا فِي جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ لَمْ أَنْسَهَا

عتابہ اپنے حسن کی وجہ سے گویا راہب کی گڑیا معلوم ہوتی ہے جس نے اپنے راہب کو اپنے عشق میں مبتلا کر دیا ہو۔ اے پروردگار اگر تو مجھے جنت الفردوس کی حوروں کے ذریعہ سے عتابہ کو بھلانا چاہے تو میں اسے ہرگز نہ بھول سکوں گا۔

اور اس کے ان اشعار کی وجہ سے کہ ؎

ان المليك رآك احسن خلقه ورأى جمالك
فحذا بقدرة نفسه حور الجنان على مثالك

خدا نے تجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ حسین دیکھا اور تیری خوبصورتی کو نظر استعجاب و پسندیدگی سے دیکھ کر وہ اپنی قدرت کے ساتھ جنت کی حوروں میں تیرے ہی نمونہ پر چلا (یعنی اس نے حوریں تیرے نمونہ پر تیار کر دیں[1]

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب وہ دیکھتے تھے کہ ابو العتاہیہ ہمیشہ موت ہی کا ذکر کرتا ہے تو کہنے لگتے تھے کہ ابو العتاہیہ زندیق ہے کیونکہ وہ موت ہی کا ذکر کرتا ہے، جنت اور جہنم کا ذکر نہیں کرتا[2]

ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں لوگ زندقہ کی تہمت لگانے میں بہت افراط سے کام لینے لگے تھے۔ باوجودیکہ تہمت کے جھوٹی ہونے کا اندیشہ بھی ہوتا تھا۔ ابو العلاء اپنے رسالۃ الغفران میں کہتے ہیں کہ کتاب "الورقہ" کے مصنف نے ابو نواس کے طبقہ کے بہت سے شعراء اور اس سے پہلے کے شعراء کا ذکر کیا ہے اور انہیں زندیق قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی پوشیدہ باتیں ہماری نگاہوں میں تو نہیں ہوتیں۔ ان کو تو سوائے علام الغیوب کے اور کون جا سکتا ہے۔ لہٰذا یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

[1] اغانی صفحہ ۱۵۱ جلد ۳ ۔ [2] اغانی صفحہ ۱۴۲ جلد ۳

جیسا کہ ادبی مناصمتیں زندقہ کی تہمت لگانے کا سبب بن جاتی تھیں اسی طرح دینی اور سیاسی مخاصمتیں بھی اس کا سبب بن جایا کرتی تھیں۔ صاحب اغانی کا بیان ہے کہ "حمید بن سعید معتزلہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھا۔ اس نے بعض مسائل میں احمد ابن ابی داؤد سے اختلاف کیا۔ احمد نے معتصم کو اس کے خلاف بھڑکا دیا کہ وہ تو شعوبی اور زندیق ہے[1]۔ اصمعی ہمیشہ برمکیوں کا مقرب بنا رہتا تھا اور ان کی مدح کیا کرتا تھا لیکن جب اس کو سزا دی گئی تو وہی اصمعی ان کے بارہ میں کہنے لگا تھا۔ ؎

اِذَا ذُکِرَ الشِّرْکُ فِیْ مَجْلِسٍ   اَضَاءَتْ وُجُوْہُ بَنِیْ بَرْمَکِ

وَاِنْ تُلِیَتْ عِنْدَھُمْ اٰیَۃٌ   اَتَوْا بِالْاَحَادِیْثِ عَنْ مَزْدَکِ

جب ان کی مجلس میں شرک کا بیان کیا جاتا ہے تو بنو برمک کے چہرے دمکنے لگتے ہیں اور ان کے سامنے قرآن کی کوئی آیت تلاوت کر دی جائے تو وہ پھر مزدک کی باتیں نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔

پھر کیا تعجب کی بات نہیں کہ بشار ساری عمر رندانہ اور لاابالیانہ اشعار کہتا رہا اور دُور سے یا قریب سے دین و مذہب پر بھی چھینٹے اُڑاتا رہا۔ یہ سب کچھ وہ تقریباً اسّی سال یا اس کے لگ بھگ کرتا رہا مگر اس پر کسی نے نکتہ چینی نہیں کی۔ بجز اس کے کہ ایک زمانہ میں خلیفہ نے اسے عورتوں سے متعلق عشقیہ اشعار کہنے سے منع کر دیا تھا۔ بلکہ ہم تو خود مہدی کو دیکھتے ہیں — جس نے زنادقہ کے خلاف سب سے زیادہ داروگیر کا بازار گرم کیا تھا — کہ وہ اس کی حمایت کرتا تھا اور فقہاء بھی اس کے اشعار کی تاویلیں کر لیا کرتے تھے[2] لیکن جب وہ اسّی سال کا یا اس سے بھی متجاوز ہو گیا اور اس نے مہدی کے وزیر یعقوب بن داؤد کی ہجو میں یہ اشعار کہے ؎

بَنِیْ اُمَیَّۃَ ھُبُّوْا طَالَ نَوْمُکُمْ   اِنَّ الْخَلِیْفَۃَ یَعْقُوْبُ بْنُ دَاؤُدِ

ضَاعَتْ خِلَافَتُکُمْ یَا قَوْمِ فَانْتَظِرُوْا   خَلِیْفَۃَ اللّٰہِ بَیْنَ الزِّقِّ وَالْعُوْدِ

اے بنو امیہ اُٹھو! تمہیں سوتے ہوئے عرصہ دراز گزر گیا۔ اب تو خلیفہ یعقوب بن داؤد بن بیٹھا ہے۔ اے قوم تمہاری خلافت ختم ہو گئی۔ اس دن کا انتظار کرو کہ اللہ کے خلیفہ کی نعش چرسے

[1] اغانی صفحہ ۷، جلد ۱ [2] اغانی صفحہ ۵۷ جلد ۳

اور لکڑی کے درمیان رکھ دی جائے ۔

اس نے مہدی کی بھی ہجو لکھی اور بڑی فحش ہجو لکھی ۔ تو اس کے بعد بشار کو ــــ محض اس بات پہ سزا دی گئی کہ وہ زندیق ہو گیا ہے چنانچہ اس کے کوڑے لگوائے گئے اور وہ مر گیا ۔ بعینہٖ یہی صورت ابن المقفع کے بارہ میں پیش آئی ۔ منصور کا اس سے سیاسی جھگڑا ہؤا اور سفیان بن معاویہ بن یزید بن مہلب کا بھی جھگڑا ہؤا ۔ ان دونوں نے اسے قتل کیا اور زندقہ کی اس پر تہمت لگا دی ۔

حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے زندقہ کو اپنے مخالفین سے انتقام لینے کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا ۔ اس میں شعراء ، علماء ، امراء اور خلفاء سب ہی شامل تھے ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو جن کا عقیدہ بالکل صحیح ہوگا مگر ان میں آزادیٔ رائے پائی جاتی ہوگی ۔ جس کی بناء پر بعض مسائل میں انہوں نے جمہور علماء سے اختلاف کیا ہوگا تو ان کو بھی زندقہ کے نام سے بدنام کر دیا گیا ہوگا ۔

زندیق کے بارہ میں فقہی فیصلہ

ہمیں زنادقہ کے بارہ میں فقہی حکم حنفیہ کے ہاں ــ جو عراقی ہیں ــــ اس حکم سے بڑا شدید ملتا ہے جو شافعیہ کے ہاں ہے ۔ اکثر حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ مرتد اگر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا ۔ لیکن اگر زندیق توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اسے قتل کر دیا جائے گا ۔ اس مسئلہ میں شافعیہ اس کے خلاف گئے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ زنادقہ کی طرف سے اگر توبہ کا ظہور ہو جائے تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔[1]

ایمان

بہرحال اس عہد میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں زندقہ کی تحریک بڑی سخت تھی جس پر بہت سے لوگ بھینٹ چڑھائے گئے کبھی سچ مچ اور کبھی جھوٹ موٹ ۔ زندقہ اور شک کی اس تحریک کے مقابلہ دوسری طرف صادق ایمان کی تحریک تھی ۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس عہد کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو سمجھ سکیں تو ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس طرح ہم نے زندقہ کے پہلو کی مصوری

---

[1] اس سلسلہ میں الام صفحہ ۱۵۶ جلد ۶ ملاحظہ فرمائیے ۔ زندیق کے بارہ میں صاحب فتح القدیر نے حنفیہ کی دو روایتیں نقل کی ہیں ۔ ایک یہ کہ توبہ قبول نہیں کی جائے گی یعنی امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے قول کے مطابق اور دوسری روایت یہ کہ توبہ قبول کرلی جائے گی یعنی امام شافعیؒ کے قول کے مطابق صفحہ ۳۸۷ جلد ۴

کی ہے اسی طرح ایمان کے پہلو کی بھی پوری پوری مصوری کر دیں۔ جہاں تک میں نے سمجھا ہے اس عہد میں ایمان کا پہلو زیادہ عام اور زیادہ مشہور تھا۔ اور زندقہ ــــ شک یا الحاد کے معنی میں ــــ مؤمنین کی بڑی تعداد کے مقابلہ میں بہت تھوڑے سے متشککین ہی کا حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اور دینی مقالات مرتب کرنے والوں کے لئے زنادقہ کا نام لے دینا ممکن ہوا جب کہ انہیں بعض لوگوں کے زندیق ہونے میں شک بھی تھا۔ لیکن ان کے لئے مؤمنین کے نام گنانا آسان نہیں تھا کیونکہ ایمان تو ایک بنیادی چیز تھی جو عموماً پائی ہی جاتی تھی۔ برخلاف زندقہ کے کہ عام رجحانات کے برعکس وہ شاذو نادر ہی پایا جاتا تھا۔ زنادقہ کے ناموں میں تھوڑا سا اضافہ اس لئے ہو گیا کہ ان حضرات نے رندمشرب اور لاابالی لوگوں کو بھی زندیق کہنا شروع کر دیا خواہ دین کے بارہ میں ان کے دلوں تک شک و ارتیاب پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ بالفاظ دیگر آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان بے چاروں نے دین کے بارہ میں تو ایجابی یا سلبی کسی حیثیت سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا جبتر زناوقہ کے ساتھ ہوا بھی تو سیاسی حیثیت سے ہوگا دینی حیثیت سے نہیں۔ نیز زیادہ تر زنادقہ ایسے بھی تھے کہ ان کا زندقہ درحقیقت اس بنا پر نہیں تھا کہ وہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے ناپسند کرتے تھے جس کی خاص تعلیمات تھیں جو ان لوگوں کی عقل میں نہیں آتی تھیں بلکہ دراصل ان کا زندقہ وطنی اور قومی جہت سے تھا۔ اور زیادہ تر یہ چیز ایرانی قوم کے لوگوں میں تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کی حکومت کا زوال عربوں کے ہاتھوں پیش آیا تھا۔ عربوں کے لئے ایسا کرنا ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر وہ اس نئے دین کے متبع نہ بنے ہوتے۔ یہ نیا دین اسلام تھا۔ اس بناء پر وہ عربوں سے بھی نفرت کرتے تھے اور اسلام سے بھی۔ رہ گیا وہ زندقہ جو مختلف ادیان کے متعلق کسی گہری عمیق بحث و تحقیق کا نتیجہ ہو، جس سے بعض اوقات شک یا انکار کی کیفیت پیدا ہو جاتی تو یہ چیز ان لوگوں میں شاذو نادر ہی تھی۔

مومنین کا بلند ترین نمونہ

ایمانِ صادق میں بہت سے لوگوں نے شہرت پائی۔ ایمانِ صادق کا بلند ترین نمونہ اور معیار عبد اللہ بن مبارک، سفیان بن عینیہ، سفیان ثوری، داؤد طائی، اور فضیل بن عیاض جیسے حضرات تھے[1]۔ آپ ان کے حالاتِ زندگی

---

[1] ان کے حالات "دنیات الاعیان"، "طبقات ابن سعد"، اور "تراجم المحدثین" میں دیکھیے۔

پڑھیئے۔ ان میں آپ کو نمایاں طور پر تقویٰ، طہارت، ورع، قناعت، ایمانِ صادق، امراء اور خلفاء کی وابستگی سے دُور بھاگنا، کسی منصب کو قبول کرنے سے الگ رہنا جو عباسیوں نے ان کو پیش کیا ہو، ملے گا۔

شاید اس نوع کی زندگی کی بہترین تصویر ابنِ قتیبہ کا وہ بیان ہے جو انہوں نے ابن السماک کے مرثیہ میں داؤد طائی کے لیے نقل کیا ہے۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں "یقیناً داؤد نے اپنے دِل کی آنکھوں سے اس آخرت کو دیکھ لیا تھا جو ان کے سامنے موجود تھی۔ دل کی اس بصیرت نے آنکھوں کی بصارت کو چندھیا دیا تھا چنانچہ صورت یہ ہو گئی تھی کہ جن چیزوں کی طرف تم دیکھتے ہو وہ ان کی طرف شاید دیکھتے ہی نہیں تھے۔ اور شاید تم ان چیزوں کو نہیں دیکھتے جنہیں وہ دیکھتے تھے۔ لہٰذا انہیں ان پر حیرت ہوتی تھی اور انہیں تم پر۔ جب انہوں نے تمہیں دیکھا کہ تم دُنیا کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو اور سب کچھ بھلا بیٹھے ہو اور فریب میں گرفتار ہو گئے ہو کہ دُنیا نے تمہاری عقلوں کو کند کر دیا ہے اور اس کی محبت میں تمہارے دِل مُردہ ہو چکے ہیں تو انہیں تم سے وحشت ہونے لگی جب میں انہیں دیکھتا تھا تو یوں نظر آتا تھا کہ مُردوں کے درمیان میں ایک زندہ آدمی کھڑا ہے۔ اے داؤد! اپنے زمانہ کے لوگوں میں تمہاری کتنی عجیب شان تھی! تم اپنے نفس کا اعزاز چاہتے تھے، اس لیے تم نے اس کے ساتھ اہانت کا سلوک کیا۔ تم اسے راحت دینا چاہتے تھے، اس لیے تم نے اسے تعب و مشقت میں مُبتلا رکھا۔ تم عمدہ کھانے کھانا چاہتے تھے اس لیے تم نے اپنے آپ کو روکھا سوکھا کھلایا۔ تم نرم لباس پہننا چاہتے تھے اس لیے تم نے اپنے آپ کو موٹا جھوٹا پہنایا۔ پھر تم نے اپنے نفس کو مار دیا۔ اس سے پہلے کہ اس پر موت طاری ہو۔ تم نے اسے دفن کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ واقعی دفن ہو جائے۔ تم نے اپنے نفس کو مشقتوں کا خوگر بنایا تاکہ اسے عذاب نہ دیا جائے۔ تم نے اپنے نفس کو دُنیا سے بے نیاز کر دیا کہ کوئی اس کا ذکر تک نہ کرے۔ تمہارا نفس دُنیا سے بے رغبت ہو گیا، چنانچہ تمہاری نظر میں آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کی کوئی قدر ہی نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ تم نے حاصل کرنا چاہا تھا اس میں تم کامیاب ہو گئے۔ تمہاری پہچان تمہارے باطن میں تھی تمہارے ظاہر میں نہیں تھی۔ تم نے اپنے دین کی سمجھ بوجھ (فقہ) حاصل کی اور لوگ گانے گاتے رہے۔ تم نے رسول اللہؐ کی حدیثیں سُنیں اور لوگ باتیں ہی بناتے رہے۔ تم گونگے بن گئے اور لوگ بولتے رہے۔ نہ تم نیک لوگوں پر حسد کرتے تھے اور نہ شریر لوگوں کی عیب جوئی۔ نہ تم بادشاہوں سے عطیے قبول کرتے

تھے اور نہ دوستوں کے ہدیئے۔ سب سے زیادہ اُنس تمہیں اس وقت حاصل ہوتا تھا جب تم تنہائی میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھتے تھے اور سب سے زیادہ وحشت تمہیں اس وقت ہوتی تھی جب لوگوں کو تم سے اُنس ہوتا تھا اور وہ تمہیں گھیر لیتے تھے۔ تم جیسی باتیں کس نے سُنیں اور تم جیسا صبر اور تم جیسا پختہ ارادہ کس نے کیا؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے بعد آنے والے عابدوں کو بڑی مشقت میں ڈال دیا ہے۔ تم نے اپنے آپ کو اپنے گھر میں رکھا کہ تم سے باتیں کرنے والا اور تمہارے پاس بیٹھنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ تمہارے نیچے بستر تھا اور نہ تمہارے دروازہ پہ کوئی پردہ۔ تمہارے پاس کوئی مٹی کا ایسا برتن نہیں تھا جس میں تمہارے پینے کے لئے پانی ٹھنڈا ہو سکے۔ کوئی لگن ایسا نہیں تھا جس میں تمہارے صبح یا شام کے لئے کھانا رکھا جا سکے۔ تمہارا برتن تمہارا دِل تھا اور تمہارا پیالہ تمہارا وضو کرنے کا بدھنا۔

اے داؤد! تمہیں نہ ٹھنڈے پانی کی خواہش ہوتی تھی نہ اچھے اور لذیذ کھانے کی نہ نرم اور ملائم لباس کی۔ کیوں نہیں! تمہیں ان چیزوں کی رغبت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ مستقبل تمہارے سامنے واضح ہو چکا تھا۔ کتنی چھوٹی چیزیں تھیں وہ جو تم نے خرچ کردیں اور ان نعمتوں کے مقابلہ میں جن کی تمہیں بجا طور پر توقع ہے وہ کتنی حقیر چیزیں تھیں جنہیں تم نے چھوڑ دیا۔ جب تمہارا انتقال ہو گیا تو تمہارے پروردگار نے تمہاری موت سے تمہاری شہرت کر دی اور تمہیں تمہارے عمل کی چادر کا لباس پہنایا۔ تمہارے متبعین بے شمار ہو گئے۔ اگر تم دیکھو کہ تمہارے جنازہ میں کون کون لوگ حاضر ہیں تو تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں کتنا اعزاز اور شرف عطا فرمایا ہے۔ آج تمہارا خاندان اپنی تمام زبانوں کے ساتھ بول سکتا ہے کیونکہ تمہارے ذریعے سے خدا نے تمہارے خاندان کا شرف واضح کر دیا ہے۔"

سفیان ثوری اپنے صلاح، تقویٰ، ورع اور علم کے باوجود تجارت پر زندگی بسر کرتے تھے۔ حکام سے عطایا قبول نہیں کرتے تھے۔ عباسیوں نے انہیں کوفہ کا قاضی بنانا چاہا اور ان کو بُلایا گیا۔ وہ اپنی زندگی کے طویل عرصہ تک اِدھر اُدھر بھاگتے اور چھپتے رہے کبھی عراق سے یمن اور یمن سے مکّہ وغیر ذٰلک کہ کہیں عباسیوں کے ہاتھ نہ آ جائیں۔ سلطان سے چھپے ہونے ہی تھے کہ ۱۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔

کتاب الاغانی اور شعراء کے دواوین میں جس طرح لہو و لعب اور رندی و لاابالیانہ زندگی کی مصوری کی

گئی ہے اسی طرح علماء کے حالات زندگی کی کتابوں مثلاً طبقات ابنِ سعد، اور طبقات المحدثین وغیرہ میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی کی بھی مصوری کی گئی ہے، جب آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ زندگی ساری کی ساری رندی و لاابالی اور عیش و عشرت ہی کی زندگی تھی لیکن جب آپ محدثین اور صوفیہ کے طبقات کا مطالعہ فرمائیں گے تو ایسا نظر آئے گا کہ زندگی ساری کی ساری دین، ورع، تقویٰ، اور طہارت ہی کی زندگی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ اس عہد میں زندگی مختلف اقسام و انواع اور متفرق اندازوں اور رنگوں کی زندگی تھی تو آپ واقعی طور پر انصاف سے کام لیں گے۔ عباسی مدنیت اور تہذیب بھی باقی تمام مدنیتوں اور تہذیبوں ہی کی طرح تھی۔ یہاں مسجد بھی تھی اور شراب خانہ بھی۔ پڑھنے والے بھی تھے اور نے نواز بھی۔ صبح کے انتظار میں تہجد پڑھنے والے بھی تھے اور صبح صبح باغوں میں نکل جانے والے بھی، تہجد میں شب بیداری کرنے والے بھی تھے اور گانے بجانے میں شب بیداریاں کرنے والے بھی۔ وہ بھی تھے جنہیں دولت کی فراوانی سے ہیضہ ہو رہا تھا اور وہ بھی تھے جن کے پیٹ کام مفلسی سے رُک رک گئے تھے۔ دین میں شک بھی تھا اور یقین کے ساتھ ایمان بھی۔ عباسی دورِ حکومت میں یہ سب کچھ تھا۔ اور بڑی کثرت کے ساتھ تھا۔

لیکن مؤمنین کی یہ قسم جن کے نام ہم نے اوپر گنائے ہیں مثلاً سفیان اور داؤد، وغیرہ۔ یہ حضرات شک اور زندقہ میں گرفتار لوگوں کے ساتھ معرکۂ جہاد میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ انہیں غرض تھی تو بس اپنے ایمان سے تھی، انہیں دوسروں کے الحاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ مؤمنین جو ملحدین کے رد و ابطال کے لئے ہر دم کمربستہ رہتے تھے وہ اس عہد کے معتزلہ تھے جیسے واصل بن عطاء، ابوہذیل علاف۔ بشر بن المعتمر، ابراہیم نظام وغیرہ جو کچھ زنادقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا وہ اسے لے کر اس کا تحلیل و تجزیہ کرتے، ان کا مقابلہ کرتے اور ان کی تردیدیں کرتے اور ان کے خلاف دلائل و براہین قائم کرتے تھے، کتابوں میں اس قسم کے بہت سے مناظرے اور مباحثے موجود ہیں۔ معتزلہ پر جب ہم گفتگو کریں گے تو ان باتوں سے اس وقت تعرض کریں گے۔